مجالسِ حکیم الاسلام

مع

سوانحِ حیات

۱

حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کی مجالس جو علم و حکمت اور اہل اللہ کے واقعات سے بھرپور ہیں

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

بیرون بوہڑ گیٹ ملتان ۔ فون : ۴۰۵۰۱

مجالسِ حکیم الاسلام

جلد اوّل

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

—— مہتمم دارالعلوم دیوبند ——

کی مجالس جو علم وحکمت اور اہل اللہ کے واقعات سے بھرپور ہیں

مع

سوانح حیات

تالیف : —— مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب

مرتّب : —— فتاوی دارالعلوم دیوبند

ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ

پرانی غلہ منڈی ○ بیرون بوہڑ گیٹ ○ ملتان

نام کتاب ـــــــ مجالس حکیم الاسلام جلد اول
طبع ـــــــ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
باہتمام ـــــــ محمد اسحاق عفی عنہ
طباعت ـــــــ اعلان حق پریس ملتان
سرورق ـــــــ حافظ محمد ایوب ملتانی
تعداد ـــــــ ایک ہزار
قیمت ـــــــ

ملنے کے پتے

- ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
- مولانا محمد اقبال نعمانی مکی مسجد کراچی
- مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
- یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
- مکتبہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
- طیب اکیڈمی بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
- ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور
- مکتبۃ العارفی ستیانہ روڈ فیصل آباد
- مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الاسلام اور اُنکی مجالس

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دار العلوم دیوبند اس وقت اپنی جماعت کی آخری شخصیت ہیں۔ فکر و نظر اور اعتدال مزاج میں منفرد، اللہ تعالیٰ نے جو ذوقِ علمی اور ذہن عطا کر رکھا ہے وہ سبھوں کے حصّہ میں نہیں آتا ـــــــ بالخصوص آپ کی مجلسیں بڑی عالمانہ، پُر وقار اور مفید ہوتی ہیں۔ علماء، اور طلباء متعدد سوالات کرتے ہیں اور آپ بے ساختہ سبھوں کا جواب دیتے چلے جاتے ہیں جس میں قرآن و حدیث، فقہ و کلام، تصوف و تاریخ کے تمام برجستہ حوالے بھی ہوتے ہیں۔

اسلاف و اکابر کے واقعات بھی بکثرت بیان ہوتے ہیں۔ مولانا حبیب اللہ صاحب مالک "ادارۂ تالیفاتِ اولیاء دیوبند" نے آپ کی ۲۳ مجلسوں کو ریکارڈ کیا۔ اور پھر انہیں مرتب کر کے کاتب سے کتابت کرائی اس طرح اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا۔

مجالس کے ساتھ انہوں نے ضروری سمجھا کہ حضرتِ اقدس کے حالاتِ زندگی

کا ضروری حصہ بھی آجائے تو بہت بہتر ہو۔ اس سلسلہ میں موصوف نے خاکسار سے تعاون کے لئے کہا۔ اور خاکسار نے اُسے بخوشی منظور کرلیا۔ چنانچہ حالاتِ زندگی کا ایک ضروری حصہ میں نے مرتب کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ ان حالات کے فراہم کرنے میں بڑی مدد ان سے سوالات کے جوابات سے ملی جو موصوف نے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ، سے حاصل کئے تھے۔

بحمد للہ اس حصہ میں ابتدائی حالات آ گئے ہیں۔ زندگی باقی رہی تو انشاء اللہ دوسرے حصہ میں بقیہ سوانح حیات بھی آئے گی اور اس وقت کوشش کی جائے گی کہ یہ حصہ اور آنے والا حصہ دونوں ایک جلد میں معیاری کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوں۔ اللہ تعالیٰ یہ میری حقیر خدمت قبول فرمائے اور اس سے دوسرے اہلِ ذوق کو استفادہ کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

طالبِ دُعاء

محمد ظفیر الدین غفرلہ،

مرتب؛ فتاوی دارالعلوم دیو بند

۲۴ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

فہرست سوانح حکیم الاسلام

خاندان قاسمی

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم

فہرست مجالس حکیم الاسلام

جلد اوّل

مجلس ۱

مجلس ۲

مجلس ۳

مجلس ۴

مجلس ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

خاندانِ قاسمی

علم و عمل کی دُنیا میں خانوادۂ قاسمی کسی تعارف کا محتاج نہیں، شرق سے لے کر غرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک اسی علمی خانوادہ کی خدمات آفتاب و مہتاب کی طرح روشن ہیں، جس خاندان کی جد و جہد کے نتیجہ میں دیوبند سے علمی چشمے پھوٹے اور دنیا میں پھیلے اور برابر پھیلتے ہی جا رہے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس سے ناواقف ہے۔ ہند و پاک، برما، بنگلہ دیش سمرقند و بخارا، ملیشیا و افغانستان، افریقہ و نیپال اور دوسرے ممالک میں جہاں جائیے کوئی نہ کوئی دارالعلوم دیوبند کا فاضل اور اس کے فیوض و برکات سے متمتع انسان ضرور ملے گا۔

مسلمانی حکومت کا زوال اور اسکے اثرات

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو چکا تھا، ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک تاریکی ہی تاریکی تھی۔ دین و دیانت، امن و سکون اور اخلاق و مروت کا نام مٹنا شروع ہو چکا تھا۔ بالخصوص مسلمان بڑی بے بسی اور کشمکش میں مبتلا تھے۔ اور اس کے اثرات پوری اسلامی دُنیا پر پڑ رہے تھے۔

مصائب و آلام کا ایک امنڈتا ہوا طوفان تھا جو مسلمانانِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لینے کیلئے بیتاب تھا۔ بلکہ اب وہ مسلمانوں کی دُنیا تباہ کرنے کے بعد اس کے دین پر شب خون

مارنے کی تیاریوں میں مصروف تھا انگریزی دورِ حکومت ایک عذاب تھا جو کمزوروں اور نہتے انسانوں کو جینے کا حق دینے کے لئے تیار نہیں تھا اور یورپ کا جادو مذہب و ایمان کے لئے ایک خطرہ بن چکا تھا۔

حضرت نانوتوی رح کی بے چینی

یہ حالات تھے جن میں اللہ تعالیٰ کا ایک برگزیدہ بندہ جس کو دنیا قاسم العلوم والخیرات اور حضرت نانوتوی رح کے نام سے یاد کرتی ہے۔ کمر کس کر اٹھا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جب تک اس نے متحدہ ہندوستان سے عیسائی پادریوں کو بے آبرو ہو کر نکلنے پر مجبور نہیں کر دیا، اور جبتک دیوبند جیسے گمنام قصبہ میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت و تحفظ کیلئے ایک ایسے عربی مدرسہ کی داغ بیل نہیں ڈال دی گئی جس نے تھوڑے دنوں کے بعد ہی اس ملک میں مرکز کی حیثیت اختیار کر لی اور قدرت نے اسے عالمگیر شہرت و مقبولیت عطا کر دی۔

اس مرکز کے قیام کے بعد مدارس دینیہ کا نہ ختم ہونے والا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا اور ان تمام کا مالی بار خود مسلمانوں نے برداشت کیا، تاریخ گواہ ہے کہ اِس سلسلہ کی آبیاری اور حوصلہ افزائی میں حضرت نانوتوی رح قدس سرہٗ کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ آپ ہر جگہ پیش پیش تھے۔

صاحب سوانح حکیم الاسلام حضرت مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم کا نسبی اور علمی تعلق اور خونی رِشتہ اسی خانوادہ قاسمی سے ہے، آپ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے فرزند ارجمند ہیں۔

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رح کا وطن

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کا آبائی وطن نانوتہ ضلع سہارنپور تھا۔ اسی قصبہ میں آپ نے آنکھیں کھولیں اور یہیں آپ کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ یہ ایک قدیم قصبہ ہے جو تحصیل دیوبند ہی میں واقع ہے، یہ دیوبند سے جانب مغرب صرف ۱۶ میل کی دوری پر واقع ہے۔ دہلی سے البتہ جانب شمال ۸۰ میل پڑتا ہے۔

اِس کی چھدی یہ ہے شمال میں سہارنپور (۱۸) میل، جنوب میں تھانہ بھون (۹) میل پچھم میں گنگوہ (۱۲) میل اور پُورب میں دیوبند (۱۶ میل)۔

نانوتہ کے نام سے چھوٹی لائن کا اسٹیشن بھی تھا۔ اِس قصبہ میں تھانہ اور ڈاکخانہ دونوں واقع ہیں۔

یہاں مختصر سا بازار بھی ہے۔ اس کی آبادی آج کل تقریباً چھ سات ہزار ہے۔ اس قصبہ میں شیوخ کی کافی آبادی ہے، حضرت نانوتویؒ اسی خاندان شیوخ کے چشم وچراغ ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب سیدنا ابوبکرؓ صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد پر جاکر ختم ہوتا ہے۔

خاندان حضرت نانوتویؒ اور علم وفضل

آپ کے والد محترم کا نام نامی شیخ اسد اللہ تھا۔ گو یہ بزرگ خود فارسی تک کے ہی تعلیم یافتہ تھے۔ مگر انہوں نے آپ کو اعلیٰ عربی تعلیم دلائی تھی۔ اور اپنی زندگی ہی میں فرزند دلبند کو پروان چڑھتے دیکھا، یوں اس خاندان میں آپ سے پہلے بہت سے علماء اور صلحاء گذر چکے تھے، اور اس زمانہ میں بھی بعض بہت مشہور علماء موجود تھے۔ جیسے مولانا مظہر صاحب نانوتویؒ (ر ۱۳۰۲ھ) سابق صدر مدرس وشیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی (ر ۱۳۱۲ھ) مصنف احسن القواعد ودیگر کتب، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (ر ۱۳۰۲ھ) سابق صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، آخر الذکر بزرگ کو حضرت نانوتویؒ سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے خود لکھتے ہیں۔

"حقیر اور مولوی (محمد قاسم) صاحب کے بہت سے روابط اتحاد تھے ایک مکتب میں پڑھا، ایک وطن، ایک نسب، ہم زلف ہوئے، ایک استاذ سے ایک وقت میں علم حاصل کیا۔ اور بعض کتابیں میں نے مولانا (محمد قاسم) سے پڑھیں ایک پیر (حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ) کے مُرید ہوئے۔ ہم سفر دو سفر حج کے رہے اور ایک زمانہ دراز تک ساتھ رہے" (سوانح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مؤلفہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ)

حضرت نانوتویؒ کا علم وفضل

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے طالب العلمی کا زمانہ دہلی میں گذارا، حضرت مولانا محمد طیب صاحب نانوتویؒ کے والد محترم حضرت مولانا مملوک علیؒ (م ۱۲۶۷؁ھ) عربک کالج دہلی میں استاذ تھے دہلی جانے کا وسیلہ آپ ہی ثابت ہوئے۔ بلکہ آپ ہی کے حکم سے حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ دہلی پہنچے، یہ محرم ۱۲۶۰؁ھ کا زمانہ تھا، عربک کالج میں کافیہ سے تعلیم شروع ہوئی اور یہاں کا نصاب ختم کرنے کے بعد یہیں دہلی میں آپ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی (م ۱۲۸۶؁ھ) سے دورۂ حدیث ختم کیا، البتہ ابوداؤد شریف وہاں نہیں پڑھ سکے تھے وہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (م ۱۲۹۷؁ھ) سے پڑھی۔

اپنے تمام زمانہ طالب العلمی میں حضرت نانوتویؒ اپنے ساتھیوں میں ممتاز اور سب پر فائق رہے طلبہ کے جس مجمع میں پہنچ جاتے چھا جاتے، سارے نوجوان آپ کی طباعی اور ذہانت کے معترف تھے۔

حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے جو سند حدیث اپنے دست خاص سے لکھ کر حضرت نانوتویؒ کو مرحمت فرمائی۔ اس میں آخر میں صراحت ہے۔

فلما رأیت تاھلہ لدراسۃ الحدیث لکمال فطانتہ وتمام ذھانتہ مع صلاحیۃ الحال فی الاعمال والاقوال والافعال اجزت لہ ما تیسر لی من حصول الاجازۃ من والدی ومرشدی عن الشیخ عبدالعزیز المحدث رحمۃ اللہ علیہما وکذالک حصل لی الاجازۃ من محدث دارالھجرۃ الشیخ عابد السندی

(انوار قاسمی ج۱ ص۱۱۹)

حضرت نانوتویؒ کی خدمات

حضرت نانوتویؒ نے اپنے دور میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں، وہ کسی سے بھی مخفی نہیں، علمی دینی سیاسی

اور اصلاحی تمام شعبہ جات میں آپ کی کاوشیں ظاہر ہیں، ستمبر ۱۸۵۷ء میں آپ نے شاملی کے میدان میں انگریزی اقتدار سے جنگ کی اور پوری جماعت علماء کے ساتھ مل کر کی، اس جہاد میں حافظ محمد ضامن رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۷۴ھ) شہید ہوئے تھے اس جنگ آزادی میں آپ نے بڑی بہادری سے اپنے فرائض انجام دیئے، گولی آپ کو بھی لگی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے صاف بچالیا، اور بقول حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ یہ بچنا بھی آپ کی کرامت تھی، آپ نے لکھا ہے :۔

"گولی چل رہی تھی کہ یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا کہ گولی لگی، ایک بھائی دوڑے پوچھا کیا ہوا ؟ فرمایا سر میں گولی لگی، عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان نہ ملا۔ اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر تھے، انہیں دنوں ایک فوجی نے وارانہ بندوق ماری جس کے سنبھے سے ایک مونچھ اور کچھ ڈاڑھی جل گئی اور قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا۔

(سوانح مولانا محمد قاسمؒ ص ۱۸)

جہاد شاملی کے بعد جب انگریز اقتدار مضبوط ہو گیا تو انگریزی حکومت کی طرف سے آپ کے نام اور آپ کے ساتھیوں کے نام وارنٹ نکلا مگر اللہ تعالیٰ نے اس میں بھی آپ کی محافظت فرمائی اور گرفتار نہیں ہو سکے۔

آپ نے اس زمانہ کے مختلف فتنوں کا مقابلہ کیا۔ بدعات اور شیعت کے خلاف جدوجہد کی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں بڑی کامیابی عطا کی، انگریزی حکومت کے زیر سایہ پادریوں نے ہندوستان پر ہلہ بول دیا۔ اور سعی کی کہ سارا ہندوستان عیسائی مذہب قبول کرلے آپ نے ان پادریوں کا بھی جم کر مقابلہ کیا اور بالآخر انہیں میدان چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔

دارالعلوم آپکی زندگی کا بڑا کارنامہ دارالعلوم دیوبند ہے جو ایک مستقل مکتبہ فکر اور ایک اہم دینی اور سیاسی تحریک ہے جسے آپنے اپنے احباب اور ساتھیوں کی مدد سے پروان چڑھایا۔ نودرہ جو دارالعلوم کی پہلی عمارت ہے۔ اس کی بنیاد آپنے خود اپنے اساتذہ سے ڈلوائی۔ اور خود بھی اس میں شریک رہے۔ اور آگے چل کر اسی دارالعلوم کے فرزندوں نے ہر

ہندوستان کے مُسلمانوں کو ان کے صحیح عقائد و اعمال پر برقرار رکھا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی دیو بند (م ۱۳۳۹ھ) آپ کے خصوصی شاگرد تھے پہلے یہ بھی بتایا جا چکا تھا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (م ۱۳۰۲ھ) بھی آپکے شاگرد تھے۔ انہی دونوں حضرات سے ہندوستان کا سارا علمی سلسلہ ملتا ہے اسی طرح اس وقت دیوبندی سلسلہ کے تمام علماء اور مستفدین بلا واسطہ یا بالواسطہ حضرت نانوتویؒ کے شاگردوں اور تلامذہ کی صف میں آتے ہیں۔ اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ اس خانوادۂ قاسمی کا اس ملک کے علماء پر کیسا اور کتنا عظیم احسان ہے ۱۲۵۸ھ سے لے کر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ تک جب تک آپ زندہ رہے باضابطہ دارالعلوم دیو بند کے سرپرست اور اس کی ترقی کیلئے کوشاں رہے۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ

آپ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۴۶ھ) ایک جید عالم دین، دینی غیرت و حمیت کے نشان اور تعلیمی خدمت میں پیش پیش رہے۔ آپکی دلیری اور جرأت مشہور تھی۔ اخلاص اور ظاہر و باطن کی یکسانی آپ کا شعار تھا۔ دارالعلوم دیو بند جب ایک زمانہ میں مخالفین کے نرغہ میں گھر گیا تھا۔ تو اس وقت آپ کے جرأتمندانہ اقدامات لوگوں کے سامنے آئے اور آپ مردانہ وار ان کے مقابلے میں کامیاب ہوتے رہے جس کے بہت سے واقعات ہیں۔ حضرت نانوتوی کو بہت دنوں تک نرینہ اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت کے پدر بزرگوار کو پوتے کی بڑی ضرورت تھی، چنانچہ چھ بچیوں بعد حضرت نانوتویؒ کے گھر میں پہلا لڑکا رجب ۱۲۷۹ھ میں پیدا ہوا جس کا نام محمد احمد تجویز ہوا پوتے کی پیدائش سے دادا کو ایسی مسرت ہوئی کہ انہوں نے گیہوں کی کوٹھی کھول دی اور قصبہ کے غرباء پر اسے تقسیم کر دیا۔

تعلیم و تربیت

مکتب نشینی کے جب لائق ہوئے تو آپ کو قصبہ رامپور ضلع سہارنپور کے ایک جید حافظ میاں جی نور محمد صاحب کے پاس پڑھنے کیلئے بٹھایا گیا، نو سال کی عمر میں آپنے پورا قرآن پاک حفظ کر لیا، اسی عمر میں حضرت نانوتویؒ کے ماموں زاد بھائی منشی محمد یٰسین صاحب کی صاحبزادی سے نکاح بھی کیا گیا

گو رخصتی کی نوبت بہت دِنوں بعد آئی۔

حفظ قرآن کے بعد عربی تعلیم کیلئے آپ کو مختلف مدارس دینیہ میں داخل کیا گیا۔ سب سے پہلے گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے مدرسہ منبع العلوم میں داخل کیا گیا۔ جو خود حضرت اقدس نانوتویؒ کا قائم کردہ ہے۔ اور جہاں آپکے بڑے داماد حضرت مولانا عبداللہ صاحب انبہٹوی رحؒ (م ۱۳۴۴ھ) درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل کیا گیا، یہ مدرسہ بھی خود حضرت نانوتویؒ کا ہی قائم کیا ہوا تھا، اس وقت وہاں کے صدر مدرس آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد احسن صاحب امروہیؒ (م ۱۳۳۰ھ) تھے۔ فنون کی بہت سے کتابیں حضرت حافظ محمد احمد صاحبؒ نے آپ سے پڑھیں۔

شاہی مراد آباد میں زیر تعلیم تھے کہ حضرت نانوتویؒ کو بطور خاص صاحبزادہ کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ مراد آباد سے حافظ صاحب موصوف دیوبند آگئے، مراد آباد سے آپ کو آپ کے اساتذہ نے بڑے احترام واکرام کے ساتھ باچشم نم رخصت کیا۔ مگر دیوبند پہنچنے کے بعد اپنے پدر بزرگوار سے تعلیم کا زیادہ موقع ملا نہیں۔ اس لئے کہ حضرت کی وفات کا زمانہ قریب آچکا تھا اور مرض نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ چنانچہ آپ کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کر دیا گیا، بقیہ کتابیں آپ نے یہیں دارالعلوم میں پوری کیں، بہت سی کتابیں یہاں خود شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائیں، دورۂ حدیث کے لئے امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ) کی خدمت میں گنگوہ حاضر ہوئے اور آپ نے وہیں حضرت کی خدمت میں درس حدیث کی تکمیل فرمائی۔

فراغت کے بعد درس تدریس

(۱۲۹۷ھ) میں جب حضرت نانوتویؒ کی وفات ہو چکی تو حافظ صاحب موصوف نے تھانہ بھون کے ایک عربی مدرسہ میں مدرسی قبول کرلی اور عرصہ تک وہیں درس وتدریس کے فرائض محنت سے انجام دیتے رہے۔ پھر ارباب دارالعلوم دیوبند نے آپ کو یہاں طلب کر لیا، اور مدرس بنا دیا۔ یہاں دارالعلوم میں آپ نے مختلف فنون کا درس دیا، عام طور پر اس

زمانہ میں آپ کے پاس جلالین شریف، میر زاہد رسالہ، مسلم شریف اور مشکوٰۃ شریف کے اسباق ہوتے تھے۔

جس وقت آپ دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے ہیں حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندیؒ (م ۱۳۰۸ھ) مسند اہتمام پر جلوہ افروز تھے، حضرت نانوتویؒ کے وصال کے کچھ دنوں بعد آپ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، آپ کی ہجرت کے بعد کارِ اہتمام حضرت حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۳۱ھ) کے سپرد ہوا دیوبند میں آپ کے اثرات بہت وسیع اور ہمہ گیر تھے مگر پھر بھی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں کسی وجہ سے دارالعلوم میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ اور فتنے کھڑے ہو گئے۔

مسند اہتمام پر سرپرست دارالعلوم حضرت گنگوہیؒ ان حالات کی دیکھ بھال کے لئے ۱۳۱۳ھ میں دیوبند تشریف لائے۔ اور تمام حالات کا جائزہ لے کر آپ نے اہتمام کی ذمہ داری حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ سے لے کر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے سپرد فرمادی، چنانچہ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ تمام نزاعات ختم ہو گئے اور مدرسہ کا نظام مضبوط ہو گیا۔ حافظ صاحب خلقی طور پر بڑے ذی وجاہت اور بارعب تھے پھر حضرت نانوتویؒ سے انتساب کی وجہ سے دارالعلوم کے سارے اساتذہ اور کارکنان آپ کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔ ادھر قصبہ دیوبند کے عمائد پر بھی آپ کا کافی اثر تھا، مسلسل چالیس سال تک آپ نے اہتمام کے فرائض انجام دیئے اور واقعہ ہے کہ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم "دارالعلوم بنا" شروع میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ آپ کے پشت پناہ تھے، شیخ الہند اپنے استاذ زادہ کا بہت احترام فرماتے تھے، گو حافظ صاحب آپ کے شاگرد تھے۔

ایک زمانہ میں کچھ لوگ آپ کے اہتمام کی مخالفت پر تُل گئے۔ اور سرپرست مدرسہ حضرت گنگوہیؒ کے یہاں پہنچ کر شکوے بھی کرنے لگے۔ بلکہ ایسے کچھ لوگ جم کر حضرت گنگوہی کے پاس قیام پذیر ہو گئے ایک دن حضرت گنگوہیؒ نے مخالفین کی اس جماعت

سے فرمایا۔

"آپ حضرات تو یہ فرما رہے ہیں اور میں نے اس معاملہ کو تین بار (اور ایک روایت کے مطابق گیارہ بار) حق تعالےٰ کے سامنے پیش کیا مگر ہر دفعہ مجھے یہی جواب ملا کہ مدرسہ دیوبند کی ترقی حافظ احمد ہی کے ہاتھوں پر مقدر ہے۔" چنانچہ اس کے بعد مخالفت کی سرگرمی میں کمی آنے لگی۔

خدمات دار العلوم

دار الحدیث اور دار جدید کی بنیاد آپکے ہی دور اہتمام میں پڑی، مسجد بھی اسی دور میں بنی، دار العلوم کا پہلا عظیم الشان جلسہ دستار بندی بھی آپکے ہی دور اہتمام میں ۱۳۲۸ھ میں منعقد ہوا جس میں ایک لاکھ کا مجمع ہوا اور ایک ہزار فارغین دار العلوم کی دستار بندی ہوئی، مالی اعتبار سے بھی دار العلوم نے آپکے دور اہتمام میں کافی ترقی کی۔

۱۳۴۰ھ میں نظام دکن نے آپ کی شہرت وجاہت اور مقبولیت کے پیش نظر دکن کی عدالت عالیہ کا آپ کو مفتی مقرر کیا اور ایک ہزار مشاہرہ طے کیا، دار العلوم کی مصلحت کے تحت اس وقت آپ نے یہ عہدہ قبول فرمایا۔ اور حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اور تقریباً چار سال تک کار مفوضہ خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے، مگر وہاں آب وہوا راس نہیں آئی۔ مجبور ہو کر سبکدوشی کی درخواست کی پہلے حضور نظام نے اسے منظور نہیں فرمایا مگر جب خود مل کر آپ نے اپنی معذوری ظاہر فرمائی تو منظوری عطا کی۔ آپ دار العلوم واپس تشریف لائے ۱۳۴۷ھ تک آپ مسند اہتمام پر فائز رہے۔ جو آپ کی وفات کا سال ہے۔

وفات

دار العلوم دیوبند ہی کی ضرورت سے حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ واپسی میں ٹرین میں آخری وقت آپہنچا اور ذکر وشغل میں مشغول تھے کہ رب حقیقی سے جا ملے، آپ کا مزار حیدرآباد میں ہی خطہ صالحین نامی قبرستان میں واقع ہے۔ جسے سرکار نظام نے اسی قسم کی نامور شخصیتوں کے لیے بنایا تھا۔ سرکار نظام ہی کی خواہش پر آپ خطہ صالحین میں دفن کیے گئے۔ مزار پر آپ کے نام کا کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔

حضرت نانوتویؒ نے جس سال انتقال فرمایا اسی سال آپ اپنی والدہ محترمہ کیساتھ حج اور زیارات حرمین کیلئے تشریف لے گئے، اور وہیں مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ) کے دستِ حق پرست پر بیعت ہونے کا شرف حاصل کیا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ سے بہت محبت فرماتے تھے، اور ہمیشہ بیٹا کہکر پکارا کرتے تھے

اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں بہت سارے اوصاف جمع فرما دیئے تھے وجاہت، شرافت، سخاوت، مہمان نوازی، رعب و دبدبہ، ظاہر و باطن کی یکسانیت، اخلاص و للٰہیت چھوٹوں بالخصوص طلبہ سے شفقت و محبت، علم نوازی، صاف گوئی، معاملہ فہمی وغیرہ۔

بیعت وارشاد حضرت حافظ محمد احمد صاحبؒ پہلے امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے تھے اور حضرت والا نے آپ کو خلافت بھی دی تھی۔ لیکن جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ اور تبرکاً حضرت حاجی صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بیعت ہوئے۔ اور حضرت والا نے آپ کو اپنی طرف سے بھی اجازتِ بیعت مرحمت فرمائی۔

اس طرح آپ بیک وقت حضرت گنگوہیؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ دونوں بزرگوں سے مجاز تھے، لیکن بایں ہمہ بیعت وارشاد سے عموماً بچتے تھے۔ مگر جب کوئی بہت اصرار کرتا تو مجبور ہوکر اسے بیعت فرمالیا کرتے تھے۔

حیدرآباد میں نواب عبدالباسط خاں صاحب مرحوم نواب عبدالعزیز خاں مرحوم۔ اور ان کے متعلقین آپ سے بیعت تھے۔ اسی طرح یوسف پور محمد آباد ضلع غازی پور میں ڈاکٹر انصاری کے خاندان کے بہت سے افراد آپ سے بیعت تھے۔

آپ دارالعلوم کے انتظامی امور اور درس تدریس میں کچھ ایسے مشغول رہتے تھے کہ دوسرے کاموں کی فرصت نہیں تھی۔ جبتک عمر طبعی کی کمزوری نے مجبور نہیں کیا۔ کار اہتمام کے ساتھ برابر درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آپ کے یہاں عام طور پر مسلم شریف مشکوٰۃ شریف جلالین شریف اور میر زاہد رسالہ کے اسباق ہوتے تھے آپ کی درسی تقریر بڑی دلنشین ہوا کرتی تھی۔ جو مسائل بیان فرماتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ واقع ہوکر سامنے موجود ہے۔ تقریر جچی تلی اور مؤثر ہوتی تھی۔

کبھی کبھی اہم مسائل پر لمبی تقریر بھی فرماتے تھے۔

فکرِ آخرت فکرِ آخرت کا بڑا غلبہ تھا، عالمِ برزخ پر درس میں تقریر فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سُننے والا اس منزل سے خود گزر رہا تھا۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کا بیان ہے ـــــ

" والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کو تقریباً ایک ماہ رہ گیا تھا کہ مجھ کو بلوچستان کا سفر پیش آیا اور مجھے اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی کہ حضرت دکن جانے والے ہیں، کیونکہ اس وقت تک کوئی پروگرام بھی طے نہیں ہوا تھا۔ میں دن کی دس بجے کی ٹرین سے سفر کرنے والا تھا۔ کوئی آٹھ بجے آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ اس وقت آپ کوٹھی (دا اہتمام) کے برآمدہ والے حصہ میں تنہا تشریف رکھتے تھے۔ میں وہاں خدمت میں حاضر ہو کر بیٹھ گیا۔ دیکھا حضرت والد محترم آبدیدہ ہیں اور آپ پر گریہ وزاری طاری ہے۔ مجھے خطرہ ہوا کہیں مجھ سے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی۔ میں نے عرض کیا حضرت! مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟ فرمایا یہ بات نہیں۔ بلکہ مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ اب میرا بہت تھوڑا وقت رہ گیا۔ اس لئے ایک واقعہ بیان کر کے تم کو کچھ نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ والد ماجد (حضرت نانوتوی) کے زمانہ میں جب میں نے قرآن پاک حفظ کر لیا تو حضرت کو بے حد خوشی ہوئی۔ آپ گو تقریبات کے عادی نہیں تھے۔

لیکن میرے حفظ قرآن سے اس قدر خوش ہوئے کہ اس موقع پر ایک پوری گائے ذبح کی اور مدرسہ کے اکابر اساتذہ، اور شہر کے عزیزوں کی پر تکلف دعوت کی۔

جب سارے مہمان کھانا کھا کر واپس جا چکے تو حضرت (نانوتویؒ) نے مجھے تنہائی میں بلایا اور فرمایا کہ "میاں احمد! تم عالم بھی ہو گئے،

تمہاری عزت بھی ہوگی۔ اور تم کو دولت بھی ملے گی۔ مگر یہ سب کچھ تمہارے لئے ہوگا۔ قرآن شریف میں نے تم کو اپنے لئے یاد کرایا ہے۔ اس میں تم مجھے نہ بھولنا۔ فرمایا کہ میں اس وقت سے برابر دو پارے حضرت کی نیت سے پڑھتا ہوں۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ، فرماتے ہیں یہ واقعہ سنا کر مجھ سے فرمایا! الحمدللہ تم عالم بھی ہو، تمہاری عزت بھی ہوگی، شہرت بھی ہوگی۔ اور تمہیں دولت بھی ملے گی۔ مگر یہ سب کچھ تمہارے لئے ہوگا۔ قرآن شریف میں نے تم کو اپنے لئے یاد کرایا ہے۔ اور اسی لئے میں نے والد ماجد کا یہ واقعہ تمہیں سنایا ہے۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ میں یہ باتیں سن کر خاموش رہا۔ اور دقت پر بلوچستان کے لئے روانہ ہوگیا۔ سفر سے بعد واپس دیوبند پہنچا تو اچانک چند دنوں کے بعد آپ کی وفات کی خبر آئی۔ اس وقت سے میرا معمول یہ ہے کہ میں ایک پارہ یومیہ اوابین میں حضرت والد ہی کی نیت سے پڑھتا ہوں۔ والدہ کی وفات کے بعد ان کو بھی شامل کر لیتا ہوں ۔"

حادثہ وفات

وفات کا حادثہ حیدرآباد دکن میں پیش آیا۔ اس کی ظاہری صورت یہ پیش آئی کہ لو اسیر کا بہت شدید دورہ پڑا، بالکل ہی نڈھال ہو گئے لوگوں نے محسوس کیا کہ اب تبرک ہی تبرک ہیں۔ درخواست کی کہ اگر اجازت ہو تو تار دے کر طیب و طاہر کو بلا دیں آپ نے یہ سن کر ناگواری کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یہ طیب و طاہر کو بلانے کا وقت ہے یا حق تعالےٰ کی طرف رجوع ہونے کا، میں اس وقت ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا۔ اس کے بعد رائے ہوئی کہ حضرت کو دیوبند (وطن) بھیج دیا جائے ریل کا ایک ڈبہ ریزرو کیا گیا شدید گرمی کا زمانہ تھا۔ آپ کے ساتھ چار آدمی کئے گئے، میر احمد علی مرحوم، مولوی محمد علی مرحوم۔ حافظ محمود صدیقی مرحوم اور حافظ شریف احمد گنگوہی سلمہ، ٹرین جب نظام آباد کے قریب پہنچی تو حضرت نے فرمایا میری طرف سے حضرت

تھانویؒ کو خط لکھو حضرتؒ مضمون بولتے گئے اور مولوی محمد علیؒ مرحوم لکھتے گئے، خط کا حاصل یہ تھا کہ میرا قلب الحمدللہ ذاکر ہے غافل نہیں، دوسری بات یہ لکھوائی کہ الحمدللہ میں حق تعالیٰ کی ہر تقدیر سے راضی ہوں، اس کے بعد فرمایا مجھے وضو کراؤ۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت ابھی نماز کے وقت میں دیر ہے مگر حضرتؒ نے باصرار کہا کہ ابھی وضو کراؤ، چنانچہ وضو کرایا گیا، پھر فرمایا مجھے سفید چادر اوڑھا دو حکم کے مطابق چادر اوڑھا دی گئی۔ فرمایا دیکھو چادر پر ناپاکی کا کوئی داغ دھبہ وغیرہ تو نہیں لگا ہے؟ کیونکہ ملائکہ علیہم السلام کو بدبو سے تکلیف پہنچتی ہے۔ سب نے عرض کیا حضرت چادر پاک و صاف ہے۔ لیٹ کر عقد انامل پر تسبیح پڑھنا شروع فرمادی۔ اس وقت تسبیح یہ تھی سبحان اللہ الحمدللہ لا الٰہ الا اللہ اللہ اکبر، مولوی محمد علی صاحب مرحوم کا بیان تھا کہ ہم نے کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں۔ ڈبہ اندھیرا سا تھا۔ مگر اچانک دیکھا کہ ایک تیز روشنی آئی جیسے بجلیاں کوندتی ہیں۔ ہم سب حیرت زدہ تھے کہ یہ روشنی یہاں کہاں سے آئی۔ مگر روشنی غائب ہونے کے بعد ہم نے دیکھا کہ حضرت کا اخیر وقت آچکا ہے اور روح پرواز کر چکی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس وقت عقد انامل ۲۶ کے عدد پر تھا اور ہونٹ غیر معمولی سرعت کے ساتھ تسبیح میں ہل رہے تھے ۲۹ کے عدد پر دم آخر ہو گیا۔ دیوبند تار دیا گیا کہ میت کہاں لے جائیں، دوسرا تار نظام دکن کو دیا گیا جس کی اطلاع دیوبند کے تار میں دی گئی تھی۔ دیوبند سے بذریعہ تار جواب ملا کہ جو حضور نظام کی رائے ہو اس پر عمل کیا جائے اور نظام دکن کا تار پہنچا کہ مولانا کی میت حیدرآباد لائی جائے میں اپنے ذاتی مصارف سے ان کی تجہیز و تکفین کروں گا۔ چنانچہ راتوں رات ایک ٹرک کے ذریعہ میت کا تابوت جو نظام آباد کے لوگوں نے بعجلت تمام کام تیار کر لیا تھا۔ حیدرآباد میں جنازہ کی متعدد نمازیں ہوئیں جیسا کہ نظام آباد میں بھی متعدد نمازیں جنازہ کی پڑھی جا چکی تھیں۔ اس طرح وہیں حیدرآباد میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

بلندی درجات

اس کو ختم کرنے سے پہلے یہاں ایک اور واقعہ ذکر کے لائق ہے۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ

رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۵ھ) کا پیغام حضرت حافظ صاحب کے نام پہنچا کہ میں خود حاضر ہوتا۔ مگر اپنی کمزوری کی وجہ سے معذور ہوں تم خود یہاں رائے پور آنے کی زحمت برداشت کرو۔ چنانچہ حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیغام ملتے ہی رائے پور روانہ ہو گئے۔ جس وقت رائے پور پہنچے حضرت اقدس رائے پوریؒ باغ میں تشریف فرما تھے۔ بڑے تپاک سے ملے، پھر اندر مکان میں تخلیہ ہوا، حضرت رائے پوریؒ نے جھک کر حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قدم چھوئے، حافظ صاحب نے چونک کر کہا۔ حضرت میں چھوٹا ہوں میرا یہ مقام نہیں ہے۔ فرمایا میں اس کے لئے مامور ہوں اور فرمایا کہ میں نے اس لئے تکلیف دی ہے کہ آئندہ ایک بڑا ہنگامہ دارالعلوم میں پیش آنے والا ہے۔ حق تعالیٰ نے آپ کی ترقی بدگویوں کی بدگوئی میں رکھی ہے آپ صبر و رضا سے کام لیں۔ آپ کے بارہ میں نامناسب باتیں کہی جائیں گی مگر یہی تمہارے درجات بلندی کا ذریعہ بنے گا۔ لہٰذا تم صبر و ضبط سے کام لینا، صبر کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہ جانے دینا عرض کیا حضرت انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد دارالعلوم کی پہلی اسٹرائک کا واقعہ پیش آیا جس میں بڑے زبردست ہنگامے پیش آئے اور مخالفین نے کہنے سننے اور بدگوئیوں میں کسر اٹھا کر نہیں رکھی مگر اخیر میں دارالعلوم ہی کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا کی۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، حضرت حافظ احمد صاحبؒ اپنی جگہ کلیۃً صابر و ضابط رہے۔ اور پورے صبر و استقلال سے کام لیتے رہے۔

اولاد

حضرت حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شادی محلہ دیوان دیوبند میں ہوئی، ان سے تین اولاد ہوئیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی، مگر بچپن میں ہی ان تینوں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد بہت دنوں تک کوئی اولاد نہیں ہوئی، اکابر دارالعلوم دیوبند بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس سے متأثر اور متفکر رہتے تھے، ان حضرات کی دلی تمنا یہ تھی کہ حضرت نانوتویؒ کی نسل چلے۔

مولانا عبدالسمیع صاحبؒ سابق مدرس دارالعلوم کا بیان ہے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ نے مجھے ایک دن بلایا۔ اور فرمایا کہ حضرت حافظ صاحب کے کئی

سال سے اولاد نہیں ہو رہی ہے اور تمہاری تمنا ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی نسل باقی رہے اور چلتی رہے۔ فتح پور ہسوا میں ایک بزرگ ہیں جو اولاد کے سلسلہ میں مستجاب الدعوات ہیں تم وہاں اِن کی خدمت میں جاؤ اور میری طرف سے درخواست کرو کہ یہ صورت حال ہے۔ وہ دعا فرمائیں گے کہ۔ اللہ تعالیٰ حافظ محمد احمد صاحبؒ کو اولاد کی دولت سے نوازیں۔

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد کے مطابق میں ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور واقعہ بیان کر کے دُعا کی درخواست کی۔ فرمایا ہم اس کا جواب کل دیں گے حکم کے مطابق دوسرے دن حاضر ہوا۔ اور ان بزرگ سے ملاقات۔ فرمایا کہ ہم نے دعا کی وہ قبول ہو گئی۔ اور ہمیں بشارت دِی گئی ہے۔ کہ حافظ صاحب کے لڑکا ہوگا۔ جو حافظ بھی ہوگا۔ قاری بھی ہوگا۔ عالم بھی ہوگا۔ حاجی بھی ہوگا۔ یہ واقع مولانا عبدالسمیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ سے اس وقت بیان کیا۔ جب وہ ۱۳۴۶ھ میں حج کے لئے روانہ ہوئے۔ اس تانگہ میں حضرت ممدوح کے ساتھ مولانا عبدالسمیع صاحب مرحوم بھی تھے۔ فرمایا کہ جب تو پیدا ہوا تو ہم نے کہا الحمدللہ اِن بزرگوں کی کہی ہوئی ایک بات پوری ہوئی جب تو حافظ ہو گیا۔ اور اس کا ایک بڑا جشن منایا گیا۔ تو ہم نے کہا الحمدللہ دوسری بات بھی پوری ہو گئی، جب تو نے قرارت کی تکمیل کی تو ہم نے کہا الحمدللہ تیسری بات بھی پوری ہو گئی۔ جب تو نے درس نظامی پورا کرلیا تو ہم نے کہا الحمدللہ تیسری بات بھی پوری ہو گئی۔ جب تو حج کو جا رہا ہے۔ تو ہم نے کہا الحمدللہ پانچویں بات بھی پوری ہو گئی۔

چنانچہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑے صاحبزادے کا نام محمد طیب تجویز ہوا۔ اور دوسرے کا نام محمد طاہر رکھا گیا اور صاحبزادی صاحبہ کا نام طیبہ تھا۔ اور یہ تینوں صاحب اولاد بھی ہوئے۔ اللہ تعالےٰ تا قیامت اس خاندان کا سلسلہ جاری رکھے اور ان سے دین کی خدمت لیتا رہے۔ ان صاحبزادی طیبہ صاحبہ اور چھوٹے صاحبزادے حضرت مولانا محمد طاہر صاحبؒ (م ۱۳ھ) اللہ تعالےٰ کو پیارے

ہو چکے، اِن دنوں کی اولاد در اولاد پاکستان اور امریکہ میں ہیں۔ بڑے صاحبزادے بحمد للہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی سے بقیدِ حیات ہیں۔ اس وقت اور مع اولاد ہندوستان میں ہی تشریف فرما ہیں۔ بڑے صاحبزادے محمد طیب جو اس وقت حکیم الاسلام حضرت مولانا الحافظ القاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام سے پوری دنیا میں جانے پہچانے جاتے اور ہر دلعزیز ہیں۔ آپ ہی کی زندگی کے کچھ حالات مرتب کر کے پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت میں خاکسار کی مدد فرمائے۔

حکیمُ الاسلام مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم

پیدائش آپ نے جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ (مطابق جون ۱۸۹۷ء) یوم یکشنبہ کو اس دنیا میں قدم رکھا۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی۔ اور اپنے ساتھ فیروزمندی و خوش بختی لائے، اس ولادت باسعادت پر پورے خاندان قاسمی اور حلقہ دارالعلوم میں خوشی کی دھوم مچ گئی۔ اور سبھوں کے دِل اور زبان سے بےساختہ دعائیں نکلیں، اس بچہ کیلئے بھی اور اِس کی آئندہ نسل کے لئے بھی۔ اس لئے کہ اس بچہ کی آمد سے بہت سے دلوں کی تمنائیں بر آئیں، اس وقت بچہ کا تاریخی نام "مظفر الدین" تجویز ہوا۔ اور اصل نام محمد طیب اور حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودی شاگرد حضرت نانوتویؒ نے تاریخی نام "خورشید قاسم" رکھا۔ مگر بہ تخرجہ داؤ۔ محمد طاہر کے پیدا ہونے پر ان کا نام بھی یہی رہا مگر بتعمۂ واؤ۔

تربیت کا ماحول والدین نے اپنے اس بچہ کی پرورش اور تربیت بڑے پیار و محبت کے ساتھ کی۔ چونکہ پورا گھرانہ علم و فضل اور پاکیزہ اعمال و اخلاق اور زہد و قناعت میں ڈوبا ہوا تھا۔ کتاب و سنت اور علوم دینیہ کی اشاعت و تحفظ سے شغف رکھتا تھا، اس قدرتی طور پر آپ کے دل و دماغ، اور فکر و ذہن

کی نشو ونما اسی علمی اور دینی ماحول میں ہوئی۔

بسم اللہ جونہی ہوش وحواس سنبھالا مکتب میں بٹھائے گئے۔ اور آپ کی رسم بسم اللہ بڑے دھوم دھام سے منائی گئی، اس محلس بسم اللہ میں دارالعلوم کے تمام موجودہ وقت اکابر واسلاف جمع ہوئے، جیسے حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی (م ۱۳۲۲ھ) (والدمحترم حضرت شیخ الہندؒ) حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی (م ۱۳۲۸ھ) والدمحترم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی (م ۱۳۳۹ھ) عارف باللہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (م ۱۳۴۷ھ) جانشین قاسم العلوم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہم اللہ ادیب لبیب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی (م ۱۳۴۸ھ) اور دوسرے اساتذہ دارالعلوم دیوبند)

ان اکابر علماء ربانیین اور اولیاء اللہ کے بابرکت مجمع میں قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کے اس ہونہار پوتے کی بسم اللہ ہوئی، اور بسم اللہ حضرت مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ نے کرائی، جو اس وقت موجودہ حضرات میں عمر اور علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز تھے اور ملک کے مشہور اور نامور عالم اور ادیب شمار ہوتے تھے۔

اکابر کی دُعائیں بسم اللہ کے بعد جب ایسے حضرات نے ہاتھ اٹھاکر اس ہونہار بچہ کیلئے دعائیں کی ہوں گی تو خود سوچیئے کہ وہ وقت مسعود کتنا خوشگوار اور پُراثر رہا ہوگا۔ یقیناً اس بچہ کو آگے چل کر حافظ قاری عالم دین صاحب رشد وہدایت، اقبال مند اور متقی وصالح ہونا ہی چاہیے تھا۔ اگر مستقبل میں یہ ہونہار بچہ ملک وملت کا نیر تاباں بنکر چمکا اور اپنے دادا حضرت قاسم العلوم کے علم وفن اور زہد وتقویٰ کا امین بنا تو بننا ہی چاہیئے تھا۔

بسم اللہ کی یہ رسم ۱۳۲۲ھ میں عمل میں آئی جب آپ کی عمر کل سات سال کی تھی حضرت مولانا فضل الرحمان عثمانی (م ۱۳۲۸ھ) نے جو بنفس نفیس اس مبارک محلس میں شریک تھے۔ برجستہ ایک قصیدۂ تہنیت پڑھا جس کا مطلع یہ تھا۔

مکتب طیّب کی مُبارک تقریب .:. کچھ عجب طرح کا جلسہ تھا نئی طرح کی سیر
اور اس قصیدہ کا مقطع جس سے تاریخ جشن افتتاح بھی برآمد ہوتی ہے یہ تھا۔
رب کبیر جو کہا اس نے تو بے روئے ابا .:. فضل تاریخ یں بول اٹھا کہ تم بالخیر
(تنجر جبر الف یعنی بے ردئے ابا)

تعلیم و تربیت آپ کے والد محترم کا جذبہ یہ تھا کہ بچہ کو شروع سے ایسے حافظ کے پاس بٹھایا جائے۔ جو اچھا قاری بھی ہو، تاکہ ابتداء ہی سے حروف کے مخارج صحیح طور پر ادا ہوں اور قرآن کو اس کے پورے حقوق کے ساتھ پڑھا جا سکے چنانچہ اس خدمت کیلئے حضرت حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ نے غالباً حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ کے مشورہ سے مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحب آلہ آبادی (م ۱۳۲۶ھ) کو منتخب فرمایا اور ان کو بطور خاص ذاتی طور پر بلاکر اپنے گھر پر رکھا۔ تاکہ وہ بچہ کی تعلیم و تربیت کا فریضہ ادا کریں۔ قاری صاحب کا قیام و طعام اور مشاہرہ سب اپنے ذمہ لیا۔

تجوید جب قاری صاحب موصوف تشریف لے آئے تو حضرت شیخ الہند نے حافظ صاحب سے فرمایا کہ جب قاری صاحب آہی گئے ہیں۔ تو ایسا کیوں نہ کیا جائے۔ کہ جناب قاری صاحبؒ دارالعلوم ہی میں مدرس رکھ لیا جائے۔ اور یہاں درجہ تجوید کھول دیا جائے۔ تو ان کا افادہ عام ہو جائے گا۔ اس طرح دارالعلوم میں بھی ایک کمی ہے کہ یہاں شعبۂ تجوید نہیں ہے۔ وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ اور دوسرے طلبا بھی قرآن پاک تجوید کے ساتھ پڑھنے کی مشق کر لیں گے۔ چنانچہ حضرت ممدوح نے اسے بخوشی منظور فرمایا۔ اور دارالعلوم میں شعبۂ تجوید قائم کر کے قاری صاحب موصوف دارالعلوم کے مجوّد قرار پائے اور حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ نے اپنے اسی بچہ کو اسی شعبۂ دارالعلوم دیوبند میں داخل فرما دیا۔ جو آپ کے والد ماجد حضرت نانوتویؒ کی دلی تمناؤں اور آرزوں اور دعائے نیم شبی کا ثمرہ ہے۔ اور جس سے ساری دنیا متمتع ہو رہی ہے۔ اس بارہ میں حضرت مولانا ممدوح

طیب صاحب مدظلہ فرمایا کرتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ تجوید قائم ہونیکا سبب میں ہوں اور میں ہی اس شعبہ کا سب سے پہلا شاگرد ہوں۔

اس طرح ابتدار سے لیکر انتہا تک آپ کی تمام تر تعلیم دارالعلوم دیوبند کی آغوش میں ہوئی۔ دارالعلوم کی یہ کرامت ہے کہ ابتداء قیام سے لے کر اب تک تمام رسالوں کی روداد یں چھپی ہوئی اس کے محافظ خانہ میں موجود ہیں، جن میں اور چیزوں کے ساتھ تمام طلبہ کے درجہ وار نام اور ان کے سالانہ امتحانات کے نتائج بھی درج ہوتے ہیں۔ بلکہ ہر سال طلبہ کو جو کتب انعام میں ملتی ہیں۔ ان کے نام بھی محفوظ ہیں۔

حفظِ قرآن مجید

ان رودادوں کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپ کا نام درجہ حفظ میں شروع سے درج ہے اور ہر سال کی مقدار خواندگی بھی ۱۳۲۶ھ کی روداد میں درجہ حفظ قرآن کے اندر آپ کا نام اس طرح درج ہے۔

"قاری محمد طیب پسر مہتمم مدرسہ ہذا"

اور اس کے آگے صراحت ہے۔

"قرآن شریف تمام"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شعبان ۱۳۲۶ھ میں آپ نے قرآن پاک تجوید کے ساتھ حفظ کر لیا تھا اور گیارہ بارہ سال کی عمر میں آپ پورے حافظِ قرآن ہو گئے تھے۔

دارالعلوم میں درجہ تجوید کا اجراء

حضرتِ اقدس مدظلہ نے اپنی مجلسوں میں بارہا فرمایا ہے جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا کہ میری تعلیم سے پہلے دارالعلوم میں تجوید کا درجہ نہیں تھا، اس کارِ خیر کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مجھ ہی کو بنایا، پھر اس شعبہ نے ترقی کی اور آج ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم ایک سال روزانہ ایک گھنٹہ تجوید میں صرف کرے اور قرآن پاک کو تجوید کے ساتھ پڑھنے کی مشق کرے، بحمداللہ اس شعبہ سے ہزاروں طلبہ نے استفادہ کیا۔ اور آج بھی یہ شعبہ موجود ہے، اور متعدد اساتذہ اس خدمت کیلئے مقرر ہیں۔ اور سینکڑوں طلبہ ہر سال اس شعبہ سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ اور پھر وہ ملک کے مختلف گوشوں میں

پھیل کر تجوید کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

خود آپ کا ہی یہ بھی بیان ہے اور دوسرے حضرات کا بھی کہ ابتدا رعمر میں آپ کی آواز بہت بہتر اور بلند تھی اور اوّل درجہ کے خوش آواز شمار ہوتے تھے اُس وقت کے اکابر اور اساتذہ بہت شوق سے آپ سے قرآن پاک کا رکوع پڑھوا کر سُنا کرتے تھے۔ خود سرپرست مدرسہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح (م ۱۳۲۳ھ) جب کبھی تشریف لاتے یا آپ گنگوہ جاتے تو حضرت آپ کو بلاتے اور قرآن پڑھوا کر سنتے تھے۔ اُس وقت آپ کی عمر سات آٹھ برس کی ہوگی۔ سُنکر بہت خوش ہوتے اور دُعائیں دیتے تھے۔ اور صاحب سوانح ہی سے سُنا کہ وہ اکثر حضرت کے سامنے اللہ نور السموٰات والارض کا رکوع پڑھا کرتے تھے۔

درجہ فارسی میں داخلہ

۱۳۲۶ھ کی روئیداد میں آپ کا نام درجہ فارسی میں ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حفظ ختم کرنے کے معاً بعد آپ کا داخلہ درجہ فارسی میں ہوگیا۔ مگر روداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درجہ فارسی کے سالوں میں بھی تجوید کی کتابیں آپ قاری صاحب سے برابر پڑھتے رہے اور ان کتابوں کا امتحان بھی دیتے رہے۔ گویا آپ نے قرأت سبعہ اور عشرہ کی کتابیں بھی باضابطہ پڑھیں۔

۱۳۲۷ھ سے لے کر ۱۳۲۹ھ تک مسلسل تین سال آپ نے درجہ فارسی میں رہ کر فارسی کتابیں پڑھیں اور شعبان ۱۳۲۹ھ میں فارسی کا نصاب ختم کرلیا۔ روداد میں ان تمام کتابوں کے نام بھی درج ہیں۔ جو آپ نے ان تین سالوں میں پڑھی ہیں۔ فارسی کے ابتدائی درجہ سے لیکر درجہ انتہا تک فارسی کی وہ تمام کتابیں آگئی ہیں جو عام طور پر اُس زمانہ میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اور اسی کیساتھ ریاضی، حساب، اور جومیٹری وغیرہ بھی۔

۱۳۳۰ھ کی مطبوعہ روداد میں آپ کا نام درجہ عربی میں ملتا ہے۔ اور پہلے سال میزان منشعب اور صرف میر وغیرہ کتابیں آپ کے نام کے ساتھ لکھی ہوئی ہیں۔

درجہ فارسی کے اساتذہ

فارسی کی تمام کتابیں آپ نے مولانا محمد یٰسین صاحب (م ۱۳۳۵ھ) سے پڑھی ہیں جو اُس وقت دارالعلوم میں درجہ فارسی کے اُستاذ تھے۔ اور فارسی زباندانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ مولانا

موصوف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی دامت برکاتہم مفتی اعظم پاکستان کے والد بزرگوار تھے، آپ دارالعلوم میں ۱۳۰۸ھ سے لیکر ۱۳۳۵ھ تک فارسی کے استاذ رہے،

ریاضی اور حساب وغیرہ آپ نے منشی منظور احمد صاحب برادر خورد مولانا محمد یٰسین صاحب سے پڑھا یہ بزرگ دارالعلوم میں درجہ فارسی میں حساب وریاضی کے استاذ تھے، اور ۱۳۱۱ھ سے لیکر ۱۳۵۰ھ تک بحیثیت استاذ دارالعلوم سے متعلق رہے۔

زبان فارسی کی استعداد جس طرح اللہ تعالیٰ نے حفظ وقرات میں آپ کو اپنے دور میں ممتاز حیثیت عطا کی تھی۔ اسی طرح فارسی زباندانی میں بھی آپ کو مہارت تامہ حاصل تھی، کیونکہ ابتداء طالب علمی سے آپ اُردو، فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہنے لگے تھے۔

فارسی زباندانی کا فائدہ یہ فارسی آپ کو اس وقت بہت کام آئی۔ جب آپ نے ۱۳۵۸ھ میں افغانستان کا سفر کیا تھا۔ اور دارالعلوم دیوبند کے ایک نمائندے کی حیثیت سے وہاں کے اہل علم اور ارباب حکومت کے مہمان ہوئے تھے۔ اس سفر کی روداد سے ظاہر ہے کہ آپ نے وہاں فارسی ہی زبان میں عام طور پر تقریریں فرمائیں، اور لوگوں سے اسی زبان میں گفتگو بھی کی۔

افغانستان کے زمانہ قیام میں متعدد مواقع میں مختلف موضوع پر برجستہ اہل علم کے مجمع میں تقریریں کیں، اور مختلف سوالات کے جوابات دیئے، جمعیۃ العلماء افغانستان کی طرف سے آپ کی خدمت میں جو سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا۔ وہ فارسی میں تھا۔ اور آپ نے اس کا جواب بھی شستہ فارسی ہی میں دیا تھا۔ اور وہاں کے اہل علم آپ کے علم وفضل سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ اس سپاسنامہ کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ یہاں ملاحظہ فرمایا جائے۔

"یہ سرزمین افغانستان کے ساتھ محض دینی محبت کا نتیجہ ہے۔ کہ ہم آج اپنے مرکز اسلامی ہی نہیں بلکہ خود اپنی اس علمی مجلس میں حضرت فخر الافاضل

خادم العلم والعلماء، ذات ستودہ صفات مولانا الحاج القاری محمد طیب صاحب مہتمم ورئیس عمومی کو صدر نشین دیکھتے ہیں، حضرت مہتمم صاحب جنہوں نے علم وعرفان کے اس جہاد قاسمی میں زبردست خدمات علم انجام دی ہیں اور جو قطب زماں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے ہیں۔ عمومی طور پر مسلمانوں خصوصاً جماعت علماء کے لئے بیحد واجب الاحترام ہیں۔ اور پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس سے پہلے ہمارے ملک میں ایسی محترم شخصیت کو کبھی نہیں بھیجا، ہم خدام، دارالعلوم دیوبند کو موصوف جیسی بلند شخصیت کو یہاں بھیجنے پر صمیم قلب سے ہدیہ امتنان وتشکر پیش کرتے ہیں اور اس کو طرفین کی خوش بختی تصوّر کرتے ہیں کہ ایک ایسی مرکزی شخصیت کو دارالاسلام افغانستان میں مخاطب کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔"

درجہ عربی میں داخلہ

یہ ایک ضمنی بحث فارسی دانی کے سلسلہ میں آگئی تھی اس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی بعرض یہ کیا جارہا تھا کہ سنہ ۱۳۲۹ھ میں آپ نے درجہ فارسی سے فراغت حاصل کرلی اور سنہ ۱۳۳۰ھ سے درجہ عربی میں داخل ہوگئے۔ اور باضابطہ علم عربی کی تحصیل میں مشغول ہوگئے۔

عربی کے اساتذہ

اساتذہ کے سلسلہ میں خود حضرت اقدس مہتمم صاحب مدظلہ کا بیان ہے کہ صغریٰ، کبریٰ ایکل اور مرقات کا ابتدائی حصہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (م سنہ ھ) نے خود خواہش کرکے بطور خاص پڑھایا۔ اور اس کے بعد منطق کی کتابوں میں بقیہ مرقات، تہذیب، شرح تہذیب قطبی، میر قطبی، سلّم العلوم اور اس کی شرح ملاحسن حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۸۷ھ) کے پاس ہوئی۔ اور حمداللہ، قاضی مبارک حضرت مولانا رسول خاں صاحب رحمۃ اللہ کے یہاں، جو معقولات کے جید استاذ تھے۔ اور مسائل کے سمجھانے میں

مہارت تامہ رکھتے تھے۔

کافیہ حضرت شیخ الہندؒ نے خود شروع کرائی اور اس کا کچھ حصہ سبقاً سبقاً خود پڑھایا بھی اور اس کے بعد بقیہ کافیہ اور شرح جامی حضرت مولانا نبیہ حسن صاحبؒ استاذ دارالعلوم کے یہاں ہوئی، جن کو فن نحو سے بڑی گہری مناسبت تھی۔

آپ نے شرح وقایہ حضرت مولانا گل محمد خاں (م ۔۔۔ھ) کے پاس پڑھی اور اس کے بعد ہدایہ اولین شرح عقائد نسفی عروض المفتاح اور میبذی استاذ الاساتذ حضرت مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اور ہدایہ اخیرین حضرت مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ سے جو دارالعلوم کے حلقہ میں حضرت شیخ الادب یاد کئے جاتے ہیں۔

مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف آپ نے اپنے والد محترم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ جنہوں نے اپنے صاحبزادہ ہی کی خاطر باوجود ضعف کے اپنے پاس رکھیں اور پوری کرائیں۔ اور سنن ابوداؤد حضرت مولانا محمد میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے نسائی حضرت علامہ بلیاوی رحمۃ اللہ کے یہاں ہوئی اور ابن ماجہ حضرت مولانا رسول خاں صاحب کے پاس اور بخاری شریف، ترمذی شریف محدث العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ (م ۱۳۵۲ھ) نے پڑھایا، جو اس وقت دارالعلوم کی مسند صدارت پر فائز تھے۔ اور جن کے علم و فضل اور وسعتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ کا عرب و عجم میں ڈنکا بج رہا تھا جنہیں ان کے معاصر علماء متفقہ طور پر چلتا پھرتا زندہ کتب خانہ کہتے تھے۔ جلالین شریف، موطا امام مالک، موطا امام محمد اور طحاوی شریف مفتی اعظم، عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ (م ۱۳۴۷ھ) سے پڑھی جو اپنے دور کے سب سے بڑے مفتی، خدارسیدہ بزرگ اور ہزاروں اہل علم کے مرشد روحانی تھے۔ اور جن کی نگاہ سے مس خام کندن بنجاتا تھا۔

غور کیا جائے کہ صاحب سوانح کے اساتذہ کس پایہ کے ماہرین فن تھے۔ اور اپنے دور کے کیسے ممتاز عالمانِ دین۔ اور مشہور صاحب درس و تدریس پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ شاگرد اپنے اساتذہ علوم کا حامل ہوتا ہے۔ خصوصی طور پر جبکہ شاگرد ذہین، ذکی قوی الحافظہ

اور قوی النسبت ہو۔

فراغت اس طرح صاحب سوانح نے شعبان ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرلی اور حافظ و قاری کے ہونے کے ساتھ آپ عالم و فاضل بھی ہو گئے۔ جس سے قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتویؒ کی روح کو بے حد مسرت ہوئی ہوگی۔ کہ علم وفضل کا یہ سلسلہ خاندان قاسمی میں قائم رہا۔ بلکہ آئندہ نسلوں میں اس کے منتقل ہونے کی صورت پیدا ہوگئی۔ اور دوسرے علماء دیوبند بھی اس فضل و کمال سے مسرور ہوئے۔

صاحب سوانح کے دو خواب یہاں صاحب سوانح کے دو خواب بھی ذہن میں رکھنے کے لائق ہیں۔ خود حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم کا بیان ہے کہ جس سال میں نے عربی شروع کی، اس سال ایک رات یہ خواب دیکھا کہ ہاپوڑ سے جو ریلوے لائن مراد آباد جاتی ہے۔ اس ٹرین میں اپنے تمام اکابر موجود ہیں، حضرت اقدس نانوتویؒ بھی سوار ہیں۔ امروہہ سے پہلے گنگا کا پل آتا ہے ریل گاڑی اس پر آکر ٹھہر گئی ، رات کا وقت ہے۔ میں چھوٹا بچہ تھا کھیلتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے دیکھا کہ گنگا کے اندر سینکڑوں دیواریں پانی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کوئی ادھر جارہی ہے اور کوئی اُدھر۔ اور ان کے نیچے پانی بہہ رہا ہے۔ میں ان دیواروں پر ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گیا۔ اس وقت میری عمر کوئی دس سال یا گیارہ سال کی تھی۔ میزان منشعب شروع ہو چکا تھا۔ حضرت نانوتویؒ نے جب مجھے اپنے پاس نہیں پایا تو پوچھا طیب کہاں گیا، کہیں باہر تو نہیں نکل گیا۔ رات کا وقت ہے اور نیچے بڑا دریا ہے۔ اسے تلاش کر کے لاؤ بعض حضرات میری تلاش میں نکلے میرے پاس پہنچ کر کہنے لگے تم کہاں چلے آئے۔ حضرت خفا ہو رہے ہیں۔ اور تم پانی میں دیواروں پر گھوم رہے ہو۔ میں ان کے ساتھ ریل کے ڈبہ میں آیا، دیکھا کہ پورا ڈبہ اکابر سے بھرا ہوا ہے۔ حضرت بھی تشریف فرما ہیں۔ اور آپ کے سامنے حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ (م ۱۳۳۰ھ)، اور حضرت شیخ الہند دونوں مخصوص تلامذہ باادب بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے حضرت کے سامنے لایا گیا تو حضرت نے فرمایا تو کہاں

گیا تھا؟ میں نے کہا دریا کی سیر کرنے گیا تھا۔ فرمایا یہ دریا کی سیر کا وقت ہے؟ پھر پوچھا جو کچھ پڑھا ہے کچھ یاد بھی ہے؟ میں نے کہا خوب یاد ہے، پھر تو حضرت نے میرا امتحان لیا۔ مگر میں ہر سوال کا جواب پورے طور پر نہیں دے سکا، فرمایا کیا اِسی کو یاد کہتے ہیں۔ اس کے بعد محبت سے مجھے اپنے سینہ سے لگایا اور زور سے دبایا۔ اور فرمایا اچھا "اِمکان نظیر" پر تقریر کرو میں بہت تیزی سے فرفر تقریر کرنے لگا۔ حضرت اِس وقت اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھے ہوئے تھے، جب اِس موضوع پر تقریر پوری ہو چکی تو فرمایا۔ اب "امکان کذب" پر تقریر کرو۔ میں نے اِس عنوان پر بھی بڑی تیزی سے تقریر کی۔

حضرت مہتمم صاحب مدظلہ، فرماتے ہیں کہ میں نے جب یہ خواب اپنے اکابر سے بیان کیا تو انھوں نے یہی تعبیر دی کہ خواب بہت مُبارک ہے اللہ تعالیٰ تم کو علمِ دین عنایت فرمائیں گے۔ اور حضرت نانوتویؒ کی طرف سے علم کا فیضان ہوگا۔

دُوسرا خواب دوسرا خواب اِس سال دیکھا جس سال آپ دورۂ حدیث پڑھ رہے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ دارالعلوم میں بڑی ہمہ ہمی ہے۔ اور ایک جشن کی صورت ہے۔ میں نے طلبہ سے دریافت کیا آج کیا بات ہے۔ جس کی یہ دھوم دھام ہے اور جشن کی تیاری، طلبہ نے بتایا آج بخاری شریف کا ختم ہے۔ اور ختم کرانے حضرت نانوتوی قدس سرہ تشریف لارہے ہیں۔ میں بہت خوش ہوا کہ چلوں حضرت کی زیارت کر دں گا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت نانوتویؒ دارالحدیث کے شمالی زینے سے نیچے اُتر رہے ہیں۔ اور نیچے کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ ایک چھوٹا سا سفید عمامہ باندھے ہوئے ہیں اور عمامہ کے اوپر ایک سفید چادر اِس طرح اوڑھے ہوئے ہیں کہ چہرہ کچھ تھوڑا کھلا ہوا ہے مگر پورا کھلا ہوا نہیں ہے۔ البتہ ڈاڑھی کے بال کچھ نظر آرہے ہیں۔ حضرت تیزی سے مولسری کے کنواں کی طرف آرہے ہیں، اس موقع سے حضرت کی زیارت ہوئی۔

اِن دونوں خوابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ کو پوتے کے عالمِ دین ہونے کی بے حد مسّرت ہوئی۔ اور ہونی چاہیئے۔

بعض اساتذہ کے خصوصی اثرات

صاحب سوانح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے اپنی بعض مجلسوں میں صراحت کے ساتھ فرمایا کہ "مجھے علم حدیث سے لگاؤ اور مناسبت حضرت والد محترم (مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ) کے درس سے حاصل ہوئی ان کا بیان بہت دلنشین اور مؤثر ہوتا تھا اور حدیث کی تشریحات اور اس کے معانی پر دسترس حضرت شاہ صاحب (مولانا انور شاہ صاحبؒ) قدس سرہ کے ذریعہ حصہ میں آیا، اور مسائل کی تعبیر اور تفہیم کا انداز حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھا۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علم حدیث پر نظر بہت گہری اور وسیع تھی، اس کے معانی پر پورا عبور رکھتے تھے اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فصیح و بلیغ زبان عطا کی تھی۔ اور اپنی بات دوسروں کے ذہن نشین کر دینے پر پوری قدرت حاصل ہے۔

فن سپہ گری

علم و فن میں مہارت کے ساتھ حضرت والا فن سپہ گری کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں یہ فن میں نے اور سعید بھائی گنگوہیؒ نے امیر شاہ خاں صاحب خورجوی سے حاصل کیا۔ جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں سے تھے۔ اور نہایت متقی اور پارسا بزرگوں میں سے تھے یہ لاٹھی اور بنوٹ وغیرہ ہم لوگوں کو سکھایا کرتے تھے۔ اور اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔

خوشنویسی اور جلد بندی

مطبع قاسمی دیوبند میں منشی محبوب علی صاحب میرٹھیؒ بہترین خوشنویس تھے۔ پریس حافظ صاحب کا اپنا ذاتی تھا اسی میں کام کرتے تھے۔ پریس کی دیکھ بھال بھی انہی سے متعلق تھی ان سے آپ نے خوش نویسی سیکھی فرماتے ہیں کہ مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ استاذ شعبۂ کتابت بھی انہی کے شاگرد ہیں۔ منشی محبوب علی صاحب محبوب رقم کے نام سے مشہور تھے۔ فرماتے ہیں کہ جلد بندی کا کام میں نے دفتری محمد علی صاحب میرٹھی سے سیکھا جو اس فن کے ماہر تھے۔ اور جلد بندی کے سارے اوزار و آلات بھی خریدے اب بھی میرے ذاتی کتب خانہ میں بہت ساری کتابوں کی جلدیں میرے ہاتھ کی بندھی ہوئی ہیں۔" دفتری محمد علی صاحب مرحوم دارالعلوم میں جلد بندی کے کام پر

مامور تھے، کتب خانہ امدادیہ ان کا ہی قائم کیا ہوا ہے جو ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔

علمی مناسبت

علمی مناسبت طالب علمی کے زمانہ سے حاصل ہے، تقریر و تحریر دونوں کا ذوق تھا۔ زیادہ محنت سے طبعیت گھبراتی نہیں تھی، اور علم کی ایک دھن تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خداداد ذہانت، علم فراست علمی ذوق، وسعت مطالعہ اور کتب دینیہ سے دلچسپی شروع سے تھی۔ قوت حافظہ بھی قابل رشک عطا ہوا ہے۔ پھر جن اکابر اساتذہ سے جو فن حاصل کیا تھا وہ اس فن میں کامل تھے۔ اور مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ جو ماحول آپ کو میسر تھا وہ کم لوگوں کے حصہ میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی مسائل و حقائق کو دلائل عقلیہ سے اس طرح عام فہم بناکر بیان کرتے ہیں۔ کہ ہر دل و دماغ بڑی خوشی سے قبول کرلیتا ہے اور بے حد خوشی محسوس کرتا ہے۔ جس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنے پاتا ہے۔ خاکسار کے علم کے مطابق اس وقت آپ کی مجلس جس قدر عالمانہ ہوتی ہے۔ اس کا دوسری جگہ کہیں نام و نشان نہیں، حضرت تھانویؒ کا رنگ نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ یہ مجلس ایسی ہوتی ہے کہ اسے قلم بند ہونا چاہئے تھا۔

آپ کے استاذ محترم محدث کبیر شیخ الحدیث حضرت کشمیریؒ کو آپ کی تقریر بہت پسند تھی، اور اپنے زمانہ صدارت میں وہ آپ کو مختلف مجلسوں میں اور جلسوں میں تقریر کیلئے بھیجتے رہتے تھے، بسا اوقات اپنے ہمراہ بھی لے جاتے تھے اور آپ کی تقریر پر اطمینان اور مسرت ظاہر فرماتے تھے۔

دیگر علماء سے اجازت حدیث

دارالعلوم دیوبند سے تو آپ نے فراغت حاصل ہی کی تھی، دوسرے مشاہیر علمائے وقت سے بھی آپ کو اجازت حدیث حاصل ہے۔ مثلاً حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۴۶ھ) نے آپ کو بطور خود سہارنپور بلایا، اور صحاح ستہ کی اوائل کی حدیثیں پڑھوا کر سنیں اور اجازت عطا فرمائی، اور اپنے دست خاص سے خصوصی سند حدیث لکھوا کر مرحمت فرمائی۔ اسی طرح حضرت مولانا عبداللہ انبیٹھوی (م ۔۔ھ) یعنی آپکے حقیقی بڑے پھوپھا اور آپ کے والد ماجد نے بھی اپنی طرف سے خصوصی محنت فرمائی۔

نسبت قاسمی خداداد متانت و سنجیدگی اور علمی ذوق کی وجہ سے اس وقت کے تمام قابل ذکر علماء اور اہل اللہ نے آپکے لئے علم و عمل کی خصوصی دعائیں کیں۔ اپنی شفقت و محبت اور خصوصی توجہات سے نوازا، حوصلہ افزائی فرمائی۔ اسکے نتیجہ میں جوش عمل، جدوجہد اور محنت کے جذبات ابھرے اور مطالعہ کا ذوق راسخ ہوتا چلا گیا۔ اور وہ آگے چل کر رنگ لایا اور دنیا مستفید ہوئی۔ اور انشاء اللہ بہت زمانہ تک ہوتی رہے گی۔

تزکیہ باطن اور تصفیہ قلب

علم باطن علم ظاہری کے ساتھ علم باطنی بھی ضروری ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرہ ۱۵)

اے ہمارے رب اس جماعت کے اندر انہیں میں سے ایک ایسے پیغمبر بھی مقرر کیجئے جو ان لوگوں کو آپکی آیتیں پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو آسمانی کتاب کی خوش فہمی کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کر دیں بلاشبہ آپ ہی غالب القدرت کامل الانتظام ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ-۱)

اللہ کی وہ ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں کی جماعت سے پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیت پڑھکر سناتے ہیں اور انکو پاک کرتے ہیں اور انکو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتے ہیں۔

کتاب وحکمت کی تعلیم وتلاوت کے ساتھ آپ کے فرائض منصبی میں تزکیہ باطن بھی داخل تھا، حدیث میں اس کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث جبریل میں صراحت ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ احسان کیا ہے۔ تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (مشکوٰۃ)

یہ کیفیت تزکیہ باطن کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔ اِس لئے علماءِ اُمت اور صوفیاء نے اِس کی بھی ترغیب دی ہے اور اِس کے لئے مجاہدات وریاضات کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ یہ سلسلہ بہت قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے، کہ آدمی کسی اہل اللہ سے تعلق قائم کرکے کیفیت احسان کے حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے اور محنت اور ریاضت کر کے اسے حاصل کرنے میں کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

حضرت شیخ الہند کی مالٹا سے واپسی

صاحب سوانح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ جب دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کرچکے اور درس وتدریس کی خدمت میں مشغول ہوچکے تو آپ کو تزکیہ قلب کا خیال پیدا ہوا، اس لئے کہ ہمارے یہاں زمانہ طالب علمی میں اس طرف انہماک کو پسند نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اِس میں لگنے سے منع کیا جاتا ہے۔

اِس دور میں سب سے بڑے عالم شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو انگریزی حکومت کی مخالفت کے جرم میں اِن دنوں مالٹا میں قید تھے۔ اور اسیری کی زندگی گذار رہے تھے، بڑی جدوجہد کے بعد ۱۳۳۹ھ کے ابتدا میں آپ کی ہندوستان واپسی ہوئی۔

ساحل بمبئی پر جس وقت آپ پہنچے ہیں ہزاروں مسلمان اور عقیدت مند وہاں موجود تھے، دارالعلوم دیوبند سے جہاں سینکڑوں علماء استقبال کیلئے بمبئی گئے تھے۔ دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ خلف الرشید

حضرت نانوتویؒ بھی اپنے دونوں صاحبزادوں طیّب و طاہر کے ساتھ تشریف لیگئے تھے، اور استقبال کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔

بیعت سلوک وہاں سے جب حضرت شیخ الہندؒ دیوبند پہنچے تو ایک دن بعد نماز عصر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ، نے بیعت کرنے کی درخواست کی اِس پر حضرت اقدسؒ نے فرمایا۔

"اِس وقت اپنی جماعت میں دو ہی صاحبزادے ہیں۔ جن کا پوری جماعت احترام کرتی ہے۔ ایک مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ (ابن حضرت نانوتوی قدس سرہ) اور ایک مولانا حافظ مسعود احمد صاحبؒ (ابن حضرت گنگوہیؒ) لوگوں کا مجھ پر الزام یہ ہے کہ اُس نے دونوں صاحبزادوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر میں نے تم دونوں بھائیوں کو بیعت کر لیا، تو لوگ کہیں گے کہ اب تو یہ قبضہ موروثی ہوگیا۔ پھر فرمایا کہ بھائی مالٹا سے میں کوئی بدل کر تھوڑا ہی آیا ہوں میں تو وہی کا وہی ہوں جو مالٹا جانے سے پہلے تھا۔ آپ نے عرض کیا حضرت ہم وہ نہیں ہیں۔ جو پہلے تھے۔ پہلے ہمیں حضرت کے بارے میں کچھ شعور نہ تھا۔ اب ہوگیا ہے۔ بہرحال یہ باتیں آپ نے مزاحی رنگ میں فرمائیں اور اس کے بعد سکوت فرمایا۔ نماز مغرب کا وقت آگیا۔ اور سب اُٹھ کھڑے ہوئے یہ دونوں بھائی بھی چلے آئے۔

مگر پھر اسی دن بعد نماز مغرب ایک طالب علم کو بھیجا مولوی طیب کو دارالعلوم میں بُلا کر لاؤ۔ چنانچہ حضرت کی طلب سے تشریف لے آئے، آپ کو دیکھ کر فرمایا: مولوی طاہر کہاں ہے؟ اِن کو بھی بُلا لو۔ چنانچہ اِن کے پاس آدمی گیا۔ اور وہ بھی آگئے۔ جب دونوں صاحبزادگانِ محترم حاضر ہوگئے تو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ، نے عرض کیا حضرت! کیسے یاد فرمایا بھائی مُرید کرنے

کو، تم دونوں وضو کرلو، چونکہ یہ دونوں بھائی باوضو تھے ۔ لہٰذا عرض کیا حضرت ہم دونوں باوضو ہیں ۔

اب حضرت نے دونوں صاحبزادوں کو اپنے پاس بٹھایا۔ اور باضابطہ دونوں کو بیعت فرمایا۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک مختلف نصیحتیں فرماتے رہے ۔

حضرت مرشد کے نصائح

ان نصیحتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ :۔

بیعت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی دنیاوی عزت یا دولت مل جائے گی، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ نفس اور باطن کی اصلاح ہو جائے اور وہ پاکیزہ و مہذب ہو جائے ۔ کیونکہ انسان کے نفس کے ساتھ ہزاروں روگ لگے ہوئے ہیں، جیسے تکبر، حرص، حسد، کینہ، بغض، عداوت اور عناد وغیرہ دنیاوی فسادات بھی انہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انسان کی آخرت بھی انہیں سے برباد ہوتی ہیں۔ بیعت کا منشا یہ ہے کہ اخلاق ذمیمہ مغلوب ہو جائیں ۔ اور اخلاق فاضلہ غالب آجائیں ۔ جیسے انابت الی اللہ صبر و شکر، حیا و سخا غیرت و حمیت انابت الی اللہ اور توکل وغیرہ اور یہ چیزیں کثرت ذکر سے پیدا ہوتی ہیں ۔ جس قدر ذکر کیا جائے گا۔ اخلاق فاضلہ اسی انداز سے قوی ہوں گے اور طاعت کی رغبت پیدا ہوگی۔ اور اسی کے ساتھ معصیت سے نفرت بڑھتی جائے گی ۔

اس تقریر کے بعد حضرت اقدسؒ نے صاحبزادوں کو اذکار بھی بتائے۔ اور یہ دونوں بھائی ان اذکار کو پابندی سے بجالاتے رہے، مگر اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ بہت کم دن تقریباً چھ ماہ بقید حیات رہے، کوئی چھ ماہ بعد آپ کی وفات ہوگئی، جس سے پورے ہندوستان میں صفِ ماتم بچھ گئی ۔

حضرت کشمیریؒ کی طرف رجوع

آپ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ کے لئے ۔سوال پیدا ہوا کہ

اذکار کی تعلیم کس سے حاصل کریں، چنانچہ آپ نے اپنا یہ رشتہ اپنے استاذ محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جوڑا، انھوں نے باضابطہ بیعت تو نہیں فرمایا۔ مگر تعلیم دیتے رہے

حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مجاز تھے یہ سلسلہ بہت دنوں تک قائم رہا۔ مگر جب حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل تشریف لے گئے۔ تو آپ کی خدمت میں حاضری کی نوبت کہاں آتی یا آتی تو بہت کم،

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں

اسی اثنا میں حضرت والد محترم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ دونوں بزرگوں کو حیدرآباد کا سفر پیش آیا، یہ سردی کا زمانہ تھا۔ ان بزرگوں کے ساتھ سفر میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ بھی تھے دیوبند سے چل کر درمیان میں بھوپال ایک رات قیام رہا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا بیان ہے کہ

جس کمرہ میں ان حضرات کی چارپائی تھی۔ اس کی پائنتی میں میرے لئے بھی چارپائی بچھا دی گئی۔ تہجد کا جب وقت آیا۔ تو یہ دونوں بزرگ اور مولانا سعید الدین صاحبؒ ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند ریاست بھوپال اٹھے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ میں اسوقت جاگ رہا تھا مگر بستر پر پڑا رہا۔ اٹھا نہیں، مولانا سعید الدین صاحب رامپوری جو حضرت گنگوہیؒ کے خاص لوگوں میں تھے۔ مجھے سوتا ہوا دیکھ کر ان حضرات سے فرمایا کہ اس کو کسی بزرگ کی طرف رجوع کرانا ضروری ہے اور اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ ہماری جماعت میں اس وقت حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ بڑے لوگوں میں ہیں، ان سے وابستہ کرنا مناسب رہے گا۔

یہ مشورہ اِن بزرگوں کی سمجھ میں آگیا، جب یہ حضرات حیدر آباد کے سفر سے دیو بند واپس آئے، تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں خط لکھا کہ ہم لوگوں کی خواہش یہ ہے کہ مولوی محمد طیب کو سلسلہ ترتیب باطن آپ کے سپرد کریں۔ اور آپ اس کی اصلاح فرمائیں۔

اِس کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا کہ "وہ میری اولاد ہے جب چاہے آجائے۔ لیکن اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود لکھے" آپ اِس سے فرمادیں کہ وہ خود براہ راست میرے نام خط لکھے چنانچہ اِن حضرات کا ایما ہوا۔ تو میں نے حضرت والا کی خدمت میں ایک خط لکھا اور اس میں وابستگی کی درخواست کی، حضرت والا نے جواب میں تحریر فرمایا "تو میری اولاد ہے کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں ہے، جب بھی فرصت ہو۔ فوراً آجاؤ،

تھانہ بھون حاضری

اِتنے میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔ میں دارالعلوم کی مسجد میں تراویح سنانا شروع کردی۔ ڈیڑھ پارہ سنا کر بیس دنوں میں قرآن پاک ختم کیا۔ اور بیس رمضان کو تھانہ بھون حاضر ہوگیا اور اخیر عشرہ تھانہ بھون میں حضرت کے پاس گذارنے کے ارادے سے حاضر ہوگیا۔ حاضر ہونے کی اطلاع پہلے دے چکا تھا جس دن میں پہنچا وہ جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کا وقت ہو چکا تھا مسجد نمازیوں سے بھری پڑی تھی۔ میرے پہنچتے ہی خانقاہ کے دروازہ پر مولوی شبیر علی صاحبؒ برادر زادہ حضرت تھانویؒ میرے منتظر تھے۔ ان سے مصافحہ ہوا۔

دیو بند سے میرے ہمراہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ بھی تھے۔ ہم لوگوں کے پہنچتے ہی بھائی شبیر علی نے فرمایا کہ حضرت (تھانویؒ) نے سلام فرمایا ہے۔ اور تین باتیں کہی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ خانقاہ کے حجرہ ۱۲ میں آپ کا قیام ہوگا۔ وہاں سامان پہنچا دیا گیا ہے، دوسری بات یہ کہ اگر کوئی تکلیف تکلف نہ ہو تو اِن دس دنوں میں ایک کلام پاک تراویح میں تین تین پارے لو میہیں سنادو، اور تیسری بات یہ ہے کہ آپ تین دن تک میرے مہمان رہیں گے اِس کے بعد آپ اپنے کھانے پینے وغیرہ کا بندوبست خود کریں گے۔ اِس تیسری بات

سے قدرے گرانی کا میرے دِل پر اثر ہُوا، کہ اتنے قریبی روابط (قرابت داری) بزرگوں سے علاقہ اور خود مجھ پر اولاد جیسی شفقت کے ہوتے ہوئے حضرت نے یہ غیریت کی بات کیوں اختیار فرمائی ؟

نمازِ تراویح مگر چونکہ حاضری اصلاح کیلئے ہوئی تھی۔ اس لئے سب باتیں بخوشی منظور کرلیں اور حکم کے مطابق نامزد کمرہ میں قیام کیا۔ اس وقت تک میری آواز بہت بُلند تھی اور خوش آوازوں میں شمار تھا۔ اس کی شہرت بھی تھی۔ روزانہ تراویح میں تین پارے سُنانے لگا۔ تمام مساجد سے بکثرت عوام وخواص ذوق وشوق سے خانقاہ کی مسجد میں قرآن سننے کی غرض سے آنے لگے۔ اور مسجد سے باہر حوض اور مدرسہ کا صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔

جب تین دِن پورے ہوگئے۔ تو حضرت تھانویؒ نے یاد فرمایا اور بُلا کر کہا کہ میں نے میزبانی میں تین دِن کی شرط لگائی تھی، وہ ایک ضابطہ اور اصول کی بات تھی۔ تُو میری اولاد ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ تھانہ بھون آکر تُو اپنے کھانے کا بندوبست کرے۔ تیرا کھانا وغیرہ میرے ساتھ ہی ہوگا۔ میں نے دس دِن اسی شان سے قیام کیا۔ قرآن شریف پورا ہو گیا۔ اور حضرت نے تعلیم وتربیت شروع فرمادی، اور ذکر وشغل کے طریقے بتائے۔ اس کے بعد میرا تعلق حضرت سے مضبوط ہوتا گیا۔ اور آپ کی تعلیم کے مطابق عمل کرتا رہا۔ کئی سال کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت بیعت بھی فرمالیں، فرمایا ضرورت تو ہے نہیں مگر جب دل کی خواہش ہے تو بہتر ہے اور یہ کہہ کر بیعت بھی فرمالیا۔"

خرقۂ خلافت حکیم الامت حضرت مرشد تھانویؒ کی تعلیم رنگ لائی۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ کا شمار حضرت والا کے ممتاز لوگوں میں ہونے لگا۔ خط وکتابت اور آمد ورفت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جو کچھ ادھر سے ہدایتیں ہوتی تھیں۔ ان پر آپ پورا عمل فرماتے،

آپ کا ہی بیان ہے کہ ایک دِن حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا ایک گرامی نامہ ملا اس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ :-

بے ساختہ میرے دل پر یہ وارد ہوا ہے کہ میں تجھے خلافت دوں
اس لئے میں تم کو خلافت دیتا ہوں۔ جو کوئی بہ نیت اصلاح و تربیت
آئے اِسے توبہ کرادیا کرو۔ اور مشائخ کے معمولات تلقین کردیا کرو۔
اصلاحی باتیں پوچھے بتادیا کرو۔ اور جو کوئی بیعت ہونا چاہے اسے بیعت
کرلیا کرو۔ یہ تمہارے لئے بھی نافع ہوگا اور مستفیدین کے لئے بھی"

بیعت وارشاد

اس اجازت نامہ کے بعد جو کوئی آپ سے بیعت ہونے کی درخواست کرتا ہے۔ آپ قبول فرمالیتے ہیں۔ اور اپنے سلسلہ میں بخوشی داخل فرمالیتے آج ملک کا کوئی گوشہ اور حصہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے متوسلین کی بڑی تعداد نہ ہو۔ بیعت ہونے والوں کی زیادہ تعداد جنوبی ہند میں ہے۔ بمبئی، مدراس، حیدرآباد، بنگلور میسور، اور گجرات کے متعدد شہروں اور قصبات میں آپ سے وابستہ ہونے والے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ غیر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ سعودی عرب، افریقہ پاکستان، بنگلہ دیش، انگلستان، ایسٹ افریقہ، سری لنکا۔ برما اور ایران میں بھی بکثرت لوگ داخل سلسلہ ہیں۔ اور بہت سے لوگوں کو آپ سے اجازت بیعت بھی حاصل ہے۔

بہت سے وہ افراد واشخاص جن کو علماء دیوبند سے دور رکھنے کی ان کے حلقہ کے علماء نے برسہا برس سے سعی کر رکھی تھی۔ آپ کے مواعظ حسنہ سننے کے بعد ایسے تمام افراد خاندان بھی جو دور رہنے کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا رکھے گئے تھے۔ یا مبتلا تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آپکے دست حق پرست پر بیعت ہو گئے۔ اور اس طرح اِن کے عقائد اور اخلاق واعمال کی آپ کے ذریعہ اصلاح ہوئی۔ اور وہ آج آپ کے گرویدہ اور جاں نثاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

"فاتح بمبئی" بمبئی میں

حضرت اقدس مہتمم صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ جب میں پہلی مرتبہ بمبئی گیا۔ تو میرے خلاف بدعتیوں نے قد آدم پوسٹر لگائے اور عوام کو بتایا گیا کہ نعوذ باللہ کفار دیوبند میں یہ شخص اکفر الکفار ہے، کیونکہ

دیوبند کے تمام بڑے کفار سے اسے نسبت حاصل ہے حضرت شیخ الہندؒ کا مرید ہے حضرت تھانویؒ کا مجاز ہے، حضرت علامہ انور شاہؒ کا مخصوص شاگرد ہے اور حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ کا سگا پوتا ہے اس لئے اس میں ساری کفریہ نسبتیں جمع ہیں سنی بھائیوں کو چاہیئے کہ اس کی صورت بھی نہ دیکھیں ورنہ ایمان کے سلب ہو جانے کا خطرہ ہے۔

عجیب اتفاق یہ پوسٹر ہی اس جلسہ میں جس میں آپ کی تقریر ہونے والی تھی لوگوں کی غیر معمولی حاضری کا سبب بن گیا لوگوں نے کہا کہ دیکھنا تو چاہیئے کہ آخر اتنے بڑے "کافر" کی صورت شکل کیسی ہوگی اور وہ کیا کیا کفریہ باتیں لوگوں کو تلقین کرے گا۔

اس پوسٹر میں دوسرے علماء دیوبند کو بھی سب و شتم سے جی بھر کر نوازا گیا تھا لیکن خلاف توقع اس دن وعظ میں اتنا بڑا اجتماع ہوا کہ بمبئی کی تاریخ میں اتنا بڑا مجمع لوگ کہتے ہیں کہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا پرانے قبرستان کے میدان میں جلسہ تھا تا حد نظر پورا میدان انسانوں سے بھرا ہوا تھا لوگوں کا محتاط اندازہ ہے کہ تیس چالیس ہزار انسانوں کا اجتماع تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا بمبئی ٹوٹ پڑا ہے اس دن آپ کا وعظ تقریباً تین گھنٹے ہوا مجمع پر سکوت طاری تھا آپ اپنے دستور کے مطابق مثبت انداز میں تقریر فرما رہے تھے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے حوالے سے اکابر اولیاء اللہ کے واقعات اور اپنے اسلاف و اکابر کی خدمات کا تذکرہ بڑے مؤثر انداز میں بیان فرما رہے تھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سامعین نے غیر معمولی اثر لیا اور پورے بمبئی میں مشہور ہو گیا کہ اگر علماء دیوبند ایسے ہوتے ہیں پھر ان سے بہتر تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان محلوں سے تقریر کی دعوتیں آنی شروع ہو گئیں جو خاص مخالفین علماء دیوبند کے محلے کہلاتے تھے اور پھر انتیس دن تک مسلسل یومیہ آپ کی تقریریں بمبئی کے مختلف محلوں میں ہوتی رہیں جن میں عوام و خواص کی بہت بڑی بھیڑ ہوتی تھی۔

اسی کے پیش نظر حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کو "فاتح بمبئی" کا خطاب عطا فرمایا۔

اس سے پہلے اہلِ بمبئی کو علماء دیوبند سے اس درجہ متنفر کر دیا گیا تھا کہ اگر کوئی دیوبندی عالم متبدعین کی کسی مسجد میں چلا جاتا تھا تو مسجد دھلوا کر پاک کرائی جاتی تھی۔ لیکن اس ۱۰ ۱۲ سال کے بعد نوعیت یہ ہوئی کہ جن لوگوں نے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پستول دکھا کر مرعوب کرنا چاہا تھا۔ وہی لوگ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان لغویات سے توبہ کی۔ اور اہلِ اللہ میں ہونے کی جد وجہد میں مصروف ہیں۔

جن لوگوں کو حضرت اقدس مدظلہ سے قریب بیٹھنے کا موقع ملا ہے، یا جو آپ کی مجلسوں میں کچھ دنوں شریک ہوئے ہیں، اس کی تصدیق کریں گے۔ کہ آپ کے ذاتِ گرامی موجودہ دور کے اُن تمام تکلفات اور تدبیر و سیاست سے پاک ہیں۔ جو عام طور پر خاندانی پیروں اور پیرزادوں میں ہوتے ہیں۔ کہیں یہ ظاہر ہونے نہیں دیتے کہ آپ کوئی خدا رسیدہ بزرگ ہیں یا عالمِ ربانی کے مقام پر فائز ہیں۔ طبیعت بالکل سادہ، گفتگو خاص علمی اور مذہبی، حقائق و واقعات مؤثر و نصیحت آمیز، آپ کی مجلسوں میں نہ کسی پر تنقید و تبصرہ ہوتا ہے۔ نہ غیبت اور بغض و عناد کی کا کوئی چرچہ، کتاب و سنت سے طبیعت مانوس ہے زبان پر کتاب اللہ کی آیات اور حدیثِ نبوی کے ٹکڑے چڑھے ہوئے ہیں۔ جو دلائل میں سناتے رہتے ہیں۔ شرعی احکام و مسائل کی حکمتیں بکثرت بیان ہوتی ہیں۔ علماء ربانیین اور اولیاء اللہ کے واقعات بالخصوص اپنے علمائے دیوبند کی دینی و علمی اور اصلاحی خدمات کا تذکرہ، پھر کمال یہ ہے کہ جو کچھ بیان فرماتے ہیں۔ بڑے ہی دلنشین انداز میں اور پورے اخلاص کے ساتھ، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان سے دل و دماغ بھی غذا پاتے ہیں۔ اور عقل و شعور کو بھی جلا حاصل ہوتی ہے۔

مخلص اور دیندار افراد و اشخاص آپ کی طرف کھنچتے ہیں۔ جن کے مزاجوں میں فطری کجی ہوتی ہے۔ یا جن کا انداز فکر توڑ جوڑ رہتا ہو۔ یا سیاسی دیکھا گیا ہو۔ وہ عام طور سے آپ کے قریب نہیں ہوتے اس لئے کہ ایسے لوگوں کی تسکین کا آپ کے یہاں کوئی سامان نہیں ہے۔ آپ پر حکیم الامت تھانویؒ اور آپکے جد امجد کا رنگ غالب ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کے متوسلین عموماً صالح، پختہ عقیدہ کے مالک اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔

آپ کے حلقہ ارادات میں علماء و حفاظ بھی ہیں اور ملازمین اور تاجر حضرات بھی کسان بھی ہیں،

اور مزدور بھی، شہری بھی ہیں۔ اور دیہاتی بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، مرد بھی ہیں، عورتیں بھی امراء اور رؤسا بھی ہیں۔ اور غرباء وفقراء بھی، ہر طبقہ کے لوگ ہیں۔ مگر ان سب میں عموماً ایک بات مشترک نظر آئیگی کہ وہ کسی کے درپئے آزار نہیں، پھر ان میں نام ونمود کا ابھرتا غلط جذبہ ہوتا ہے۔ اور نہ فتنہ وفساد اور شرانگیز مزاج ہاتھ میں ہاتھ ڈالتے ہی وہ بدل جاتے ہیں۔ صوم وصلوٰۃ اور زکوٰۃ ادا کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔ اور ملی کاموں میں آگے بڑھ کر حصہ لینے والے۔ مختصر یہ کہ آپ کے مزاج کا اعتدال اور اس کی پاکیزگی بہت جلد وابستہ لوگوں میں منتقل ہونے لگتی ہے اور وہ رزق حلال اور صدق مقال کے عادی ہو جاتے ہیں۔

حکیم الاسلامؒ کی شادی

شادی خانہ آبادی

زندگی کے مراحل میں ایک اہم مرحلہ شادی خانہ آبادی بھی ہے۔ آپ کے پدر بزرگوار نے آپکے درسیات سے فراغت کے بعد آپ کی شادی کی فکر کی، اساتذہ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے رشتہ داروں کے مشورہ سے آپ کا رشتہ رام پور منیہاران ضلع سہارنپور میں طے پایا۔

مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب

اس قصبہ رامپور میں مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ممتاز شمار ہوتا ہے۔ اس خاندان کے اہل علم اور اہل دل کافی شہرت رکھتے ہیں۔ خود مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ اور آپ کے ارشد خلفاء میں شمار ہوتے تھے اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شیخ سالار بندگی تھے جن کا رام پور میں مزار موجود ہے۔ سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاری رضؓ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم، تک پہنچتا ہے۔ جو مدینہ منورہ کے قبیلہ خزرج سے تھے۔ اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً قیام فرمایا تھا۔

مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب کے کوئی اولاد نہیں ہوئی ان کے حقیقی بھائی جناب حاجی علاؤ الدین

صاحب تھے اس خاندان کی نسل اُنہی سے چلی۔ ان کے تین صاحبزادے تھے، مولانا حافظ حکیم احمد صاحب رئیس رامپور، مولوی محمد صاحب مرحوم اور مولانا حافظ محمود صاحبؒ فاضل دیوبند و وزیر ریاست اندرگڑھ (راجپوتانہ) مولانا محمود صاحب نے یہیں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی تھی اور آپ کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود صاحب (م ۱۳۳۹ھ) اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی سے خصوصی شرف تلمذ حاصل تھا اور رابطہ و علاقہ قوی تھا۔

مولانا محمود صاحب مولانا محمود صاحب کی شادی مشہور بزرگ حضرت شاہ ابو المعالی قدس سرہٗ انبیٹھوی ضلع سہارنپور کے خاندان میں حضرت شاہ صادق احمد صاحب انبیٹھوی کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی حضرت شاہ ابو المعالیؒ کا خاندان انبیٹھہ میں اہل علم و فضل اور اہل دل کا ممتاز خانوادہ رہا ہے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث خلیفہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

انہی مولانا حافظ محمود صاحب رامپوریؒ کی صاحبزادی حنیفہ خاتون سے حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم کا رشتہ طے پایا۔ جو انکی اکبر اولاد تھی۔ یہ رشتہ اِس وقت کے صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ لے کر رامپور پہنچے، چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کا تعلق بھی وہاں سے گہرا تھا اور مولانا محمود کے بھائی حکیم احمد صاحب سے فرمایا کہ بھائی، میں اِس وقت نائی کی حیثیت سے طیب کا رشتہ آپ کی بھتیجی سے لے کر آرہا ہوں یہ رشتہ ان حضرات نے بڑی خوش دلی کے ساتھ منظور کرلیا، بلکہ دلی مسرت کا اظہار بھی کیا۔ بات طے پانے کے بعد یہ رشتہ تین چار سال لگا رہا،

نکاح ۱۳۴۲ھ میں جب مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کی عمر بیس سال ہو چکی تھی نکاح کی تاریخ طے پائی، اور متعینہ تاریخ میں سوا سو علماء کرام اور صلحاء عظام بصورت بارات آپ کو لے کر رامپور پہنچے۔

حضرت حکیم الامتہ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ (م ۱۳۶۲ھ) نے آپ کا نکاح پڑھا۔ اور سبھوں نے دعائیں کیں۔ بارات کے سلسلہ میں خود حکیم الاسلام مدظلہٗ لکھتے ہیں۔

.:::.

بارات کی واپسی ایک شب قیام بعد اگلے دن عصر کے بعد ہوئی ، اور رات کو تقریباً گیارہ بجے دیوبند پہنچنا ہوا ، سردی کا زمانہ تھا عشاء کے بعد دیوبند میں اس غیر معمولی تاخیر سے تشویش محسوس کی گئی بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ مولانا محمود صاحب نے کافی اور بہت قیمتی جہیز دیا تھا جس کی شہرت تھی حتی کہ علاوہ ہمہ قسم سامانوں کے دلہن کیلئے نفیس پالکی اور دولہا کیلئے گھوڑا بھی جہیز میں دیا۔ جو سر سے پیر تک چاندی سے آراستہ تھا۔ اور زین مخملی تھا جس پر زری کے کارچوب کا کام تھا یہی نوعیت دوسرے قیمتی سامانوں کی بھی تھی۔ رات کا وقت کچی پکی سڑک اور درمیان میں دیہات کا قصبہ اس لئے دیوبند میں تاخیر سے تشویش محسوس کی گئی ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ شادی کے سلسلہ میں مقامی نظم کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے اس تشویش کا طلبہ سے اظہار کیا جس پر ڈھائی تین سو طلبہ دیوبند سے رامپور کی سڑک پر روانہ ہوگئے دیوبند سے چھ میل آگے پہنچ کر طلبہ کا مجمع بارات سے جا ملا۔ اور بارات کے ساتھ لوٹا۔ طلبہ نے اپنی محبت و تعلق سے پالکی والے کہاروں کو ہٹا کر خود پالکی اپنے کندھوں پر اٹھائی اور نوبت بنوبت پالکی لے کر چلے ، وہ سماں عجیب تھا۔ کہ مختلف وطنوں کے طلبہ بنگالی ، پنجابی ، آسامی ، سرحدی اور گجراتی وغیرہ اپنی اپنی زبانوں میں گیت گاتے جاتے تھے۔ اور پالکی اٹھائے جا رہے تھے ، یہ مرحومہ کی خوش قسمتی تھی کہ رشتہ سرتاج علماء شیخ الہند لیکر گئے۔ نکاح سرخیل علماء حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا۔ بارات میں وقت کے تمام علماء صلحاء اور اکابر وقت شریک ہوئے اور پالکی اٹھانے والے طلبہ علم دین تھے جو اپنے سروں پر مرحومہ کو لائے اور آخر جنازہ بھی جب اٹھا تو وہ بھی انہی طلبہ اور علماء کے کندھوں پہ اٹھا۔ (جذبات الم صد ۱ و صد ۹)

اہلیہ کے اوصاف

اس وقت یہ شادی بڑے اہتمام سے ہوئی ، علماء ربانیین کی دعاؤں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جوڑ

بڑی عزت اور عظمت عطا ہوئی، اور خواص و عوام میں قبول عام حاصل ہوا، حضرت حکیم الاسلام مدظلہ کی خدمت علمیہ کی تفصیل آپ اس کتاب میں اپنی جگہ پڑھیں گے، آپ کی اہلیہ بھی ماشاءاللہ خاندان میں ممتاز حیثیت کی مالک تھیں، اس سلسلہ میں بھی تفصیل حضرت حکیم الامت مدظلہ کے ہی قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔ اپنی اہلیہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :۔

خود اپنی ذات سے بھی نہایت صالحہ، پابند اوقات، اور اپنے معمولات پہ مستقیم تھیں۔ میں ان کے معمولات غبط کی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اور لبا اوقات ذہن میں یہ تصور بندھ جاتا ہے کہ شاید یہی خاتون میرے لئے بھی نجات کا ذریعہ بن جائے۔ مرحومہ کو فرائض کی ادائیگی کا صد درجہ اہتمام تھا۔ گھر کے کیسے ہی اہم کام میں مصروف ہوں، اذان کی آواز سنتے ہی ہر کام سے بیگانہ وار اٹھکر اوّل اوقات میں نماز ادا کئے بغیر مطمئن نہ ہوتی تھیں۔ ایک ہزار دانے کی تسبیح ہمیشہ ان کے سرہانے رہا کرتی تھی۔ نماز عشاء کے بعد ایک ہزار بار کلمہ طیبہ اور وقت خواب ادعیہ ماثورہ پڑھنے کا معمول تھا جو سفر حضر میں جاری رہتا تھا۔ نماز صبح کے بعد تلاوت قرآن کریم اور حضر میں بغیر کسی شدید اور غیر اختیاری مجبوری کے ناغہ نہیں ہوتا تھا۔

حج کا بھی ایک شغف دل میں تھا۔ میری معیت میں سات بار حج وزیارت روضہ اقدس سے مشرف ہوئیں۔ حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی ثم المکی زید مجدہم مہتمم دارالعلوم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے عزیز داری تھی، مکہ میں قیام انہیں کے دولت خانہ پر ہوتا تھا مولانا کے گھرانے کے ہر بچے اور بڑے کو ان سے ایک خاص انس اور علاقہ تھا۔ ہر سال حج کے موقع پر اُدھر سے برابر یاد ہوتی اور یاد دہانی کی کہ ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی علاقہ خاص سے حضرت مولانا سلیم صاحب کا مقولہ تھا کہ :۔

جو شخص یہ ثابت کر دے کہ مکہ مکرمہ میں (مولانا) محمد طیب صاحب کا گھر

نہیں ہے تو میں اسے ایک ہزار روپیہ انعام دینے کیلئے تیار ہوں"۔ بہر حال مولانا کا سارا گھرانہ ان سے حد درجہ مانوس تھا اور وہ ان سے مانوس تھیں بالخصوص عزیز محترم مولوی محمد شمیم سلمہٗ ابن حضرت مولانا محمد سلیم صاحب تو خاص طور پر ان کی خاطر داری اور مدارت میں لگے رہتے تھے۔ اور ان سے مرحومہ کو خاص اُنس تھا اور کہا کرتی تھیں کہ مجھے شمیم پر ایسا ہی پیار آتا ہے جیسے سالم پر" (جذبات الم ص۶)

زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام

ان خوبیوں کے ساتھ مرحومہ میں داد و دہش کی خوبی بھی بدرجۂ اتم تھی، خود حضرت حکیم الاسلام لکھتے ہیں۔

"حج و نماز اور اوقات کی پابندی کے ساتھ ان میں ادائے زکوٰۃ کا شغف یہ تھا کہ پائی پائی کا حساب کر کے عموماً ماہ رمضان میں زکوٰۃ ادا کیا کرتی تھیں، شہر کے عزیزوں میں سے غرباء اور بالخصوص غریب بیواؤں کی فہرست انکے سامنے رہتی تھی۔ (جذبات الم ص)

تراویح کا اہتمام

آپ کی اہلیہ کو رمضان شریف میں تراویح کا خاص اہتمام تھا، اور یہی وجہ تھی کہ حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ آخر کے چند سال سے تراویح اپنی بیٹھک میں پڑھا کرتے تھے، دالان میں پردہ ہوتا تھا۔ پس پردہ اہلیہ محترم اور گھر اور محلہ کی دوسری عورتیں تھیں اور پردہ کے باہر جانب قبلہ بیٹھک میں مردوں کی جماعت ہوتی تھی،

جب کبھی رمضان میں حضرت والا کا قیام گھر پر نہیں ہوتا تو یہ فرض مولانا سالم صاحب استاذ دار العلوم دیوبند آپ کے صاحبزادہ انجام دیتے تھے۔

اس طرح اہلیہ محترمہ اذکار و اوراد، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سب کی نہایت پابند تھیں، اور اسی رنگ میں اپنے پورے خاندان اور گھرانے کو رنگنے کی سعی کرتی رہتی تھیں

ذمہ داروں کا احساس

حضرت والا کو اہلیہ کی وجہ سے بڑا ذہنی سکون حاصل تھا، بچوں کی پرورش، تعلیم و تربیت اور

دیکھ بھال سب اہلیہ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ حضرت کو اس طرف سے بالکل آزاد کر رکھا تھا۔ چوں کہ ذہین و ذکی تھیں اس لئے آپ کی راحت رسانی کا پورا خیال اور لحاظ و پاس تھا۔ گجراتی اور ہندی زبان بھی لکھنا اور بولنا جانتی تھیں، دارالعلوم میں گجراتی اور ہندی خطوط آتے تھے تو ان کا ترجمہ آپ اکثر ان ہی سے کراتے تھے۔

جذبہ راحت رسانی

آپ کے ساتھ انہوں نے ہند و بیرون ہند کے بہت سے مقامات کا سفر بھی کیا تھا۔ اور جہاں جاتی عورتوں میں رہ کر ان کو دین کی باتیں بتاتی تھیں اور ان کی اصلاح کرتی تھیں۔ حضرت اقدس مدظلہٗ نے لکھا ہے کہ:

"ان کے ساتھ میری رفاقت ساٹھ سال رہی ہے، اس پوری مدت میں اہلیہ ہونے کے رشتہ سے میں ان سے اتنا متاثر نہیں تھا۔ جتنا کہ ان کی ذاتی صلاحیت واستقامت اور جذبۂ راحت رسانی واطاعت وغیرہ سے متاثر رہا۔ خدمت واطاعت میں مزاج شناسی اور نفسیات کی رعایت کا انہیں خاص ملکہ تھا بات سن کر فوراً اس کی تہ میں پہنچ جانا اور اصولی جواب ان کا خاص رنگ تھا۔ یہی ذہانت تھی کہ عمر کا ایک بڑا حصہ راجپوتانہ میں گذارنے کے سبب گجراتی زبان اور ہندی لکھنے پڑھنے کا خاص ملکہ پیدا کر لیا تھا۔ اکثر دارالعلوم کے ہندی اور گجراتی زبانوں کے خطوط انہیں سے پڑھواتا اور ترجمہ کراتا تھا۔ گجرات کے سفروں بڑودہ، سورت، اندھیر اور بمبئی وغیرہ میں وہ گجراتی عورتوں کی باتیں بے تکلف سمجھ کر ان سے گجراتی میں بات چیت کر لیتی تھیں، اسی طباعی کا اثر تھا کہ حجاز کے متعدد سفروں میں معمولی عربی سمجھنے اور ٹوٹی پھوٹی بول لینے میں انہیں تکلف نہیں ہوتا تھا۔ حجاز میں اکثر عرب اور مصری عورتوں سے ٹوٹی پھوٹی عربی میں گھنٹوں بات چیت کرتی رہتی تھیں۔" (جذبات الم منا)

حضرت کی اہلیہ شعر بھی کہہ لیا کرتی تھیں، اور اِن کے اشعار رواں ہوتے تھے یہاں کے کچھ اشعار بھی چھپ گئے ہیں، غیر ممالک کے سفر میں بھی حضرت کے ساتھ جانا ہوا اور اچھے اثرات چھوڑ کر آئیں اِس رفیقۂ حیات نے یوم عاشورہ ۱۰ محرم ۱۳۹۴ھ کو داغِ مفارقت دِی،

الحمدللہ اِس رفیقۂ حیات سے آپ کو کئی اولاد ہوئیں، زندہ اولاد میں تین صاحبزادے (۱) مولانا محمد سالم صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند (۲) مولانا محمد اسلم صاحب رمزی ناظم شعبۂ برقیات دارالعلوم دیوبند (۳) محمد اعظم صاحب استاذ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اور تین صاحبزادیاں پھر بحمدللہ اِن اولاد کی اولاد کا سلسلہ بھی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ لکھتے ہیں اولاد کی طرف سے بھی حق تعالیٰ نے انہیں خوش نصیب بنایا تھا۔ انہوں نے اپنے تین نسلیں اپنی زندگی میں پروان چڑھتے دیکھیں، بیٹے، بیٹیاں، پوتے، پوتیاں، نواسے نواسیاں اور ان کی اولادیں مِلا کر مجموعی تعداد ۵۱ تک پہنچ گئی ہیں۔ اور بعد میں بھی اضافہ ہوا۔ انہوں نے خوشیوں اور مسرتوں کی فضائیں دیکھیں خود اپنی ساری اولاد کی شادی بیاہ اور کافی حد تک اولاد کی اولاد کی تقریبات وغیرہ سے اپنی زندگی میں ہی فراغت پالی تھی اور یہ کم خوش نصیبی نہیں کہ ان کے انتقال تک ان کی اولاد اور اولاد در اولاد کا عدد ماشاء اللہ ۵۱ تک پہنچا ہوا تھا جن میں سے سات اولاد اللہ کو پیاری ہوئی۔ اور اب بحمدللہ ۴۴ موجود ہیں۔ کثرہم اللہ تعالےٰ وابقاہم" (جذبات الم ص ۱۸ و ص ۱۹)

فرائض درس و تدریس

آپ نے ابتدا سے انتہا تک دارالعلوم میں تعلیم پائی، اور طالب علمی کی پوری زندگی یہیں گذری، اس لئے آپ کا علمی شغف، کتابی استعداد، ذہن و فکر کی سلامتی، مزاج کا اعتدال، طبعی شرافت اور متانت و سنجیدگی سبھوں پر عیاں تھی۔ اس لئے فراغت کے

بعد آپ کو درس تدریس پر لگا دیا گیا۔ جس سے علمی رسوخ ذمہ داریوں کا احساس اور طلبہ عزیز سے مناسبت پیدا ہوتی ہے۔

درس تدریس کی اہمیت

کہا جاتا ہے کہ طالب علمی کا دور اسباب کی فراہمی کا دور ہوتا ہے، اور اصل تعلیم مدرسی کے زمانے سے شروع ہوتی ہے، اور جب تک تازہ فارغ شدہ پڑھنے پڑھانے پر نہیں لگتے اِن کی علمی استعداد خام رہتی ہے پختگی نہیں آتی۔ اس لئے کہ اِس سے پہلے کا مطالعہ کچھ زیادہ ذمہ دارانہ نہیں ہوتا کیونکہ اس پر دارو گیر کرنیوالا نہیں ہوتا۔ آدمی خود پڑھتا اور سمجھتا ہے۔ اس لئے اِس پر علم کا جیسا دباؤ چاہیئے نہیں پڑتا۔ اور نہ اس کو اپنے مطالعہ کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کیا پڑھا اور کیا سمجھا وہ صحیح بھی تھا یا نہیں،

اِس کے برعکس جب معلّم بن کر آدمی مطالعہ کرتا ہے تو اس وقت اس کا یہ مطالعہ ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت اسکو خود سمجھنا نہیں ہوتا کہ خاموشی کیساتھ کتاب دیکھی اور اِس کا مفہوم اِس کے ذہن کے خزانے میں بطور امانت جمع ہوگیا۔ بلکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ جو میں نے سمجھا ہے اِسے زبان سے بلند آواز کے ساتھ دوسرے پڑھنے والوں تک پہنچانا ہے۔ جو خود تیار ہو کر آئے ہیں اور اِن میں ہر استعداد کے طلبہ ہوتے ہیں جہاں بے فکرے اور بے رغبت ہیں وہیں ذہین و ذکی اور مخلص بھی ہوتے ہیں۔ پھر اس کا بھی یقین ہوتا ہے کہ جو بات ان میں سے کسی کی سمجھ میں نہ آئے گی وہ دریافت بھی کرے گا۔ اس کی تشفی کرنی ہے۔ مختصر یہ کہ خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا ہے اور ان کے ذہن نشین کرنا ہے۔

درس تدریس پر محنت

حضرت اقدس مدظلہٗ نے درس تدریس پر کافی محنت کی، اور سچ پوچھیے تو آپ کا طبعی رجحان پڑھنا پڑھانا ہی تھا، چنانچہ اپنی مجلسوں میں اب تک فرمایا کرتے ہیں کہ مجھے اکابر نے زبردستی اہتمام پر بٹھایا ورنہ اب بھی اس سے مجھے مناسبت طبعی نہیں ہے۔

نوجوانی کا دور تھا اور جوش وخروش کا عالم طبیعت میں جولانی تھی۔ اور اُمنگ و ولولہ، جیسا کہ عام طور پر نئے نوجوان مدرس میں قدرتی طور پر ہوتا ہے۔ آپ کے والد محترم

زندہ بقید حیات تھے اور اس وقت کے بڑے تجربہ کار عالم اور استاذ، اس لئے آپ کو اس شعبہ میں تدریجی طور پر کتابیں دی گئیں یعنی پہلے ابتدائی کتابوں کے اسباق سپرد کئے گئے۔ تاکہ صرف نحوی استعداد پختہ سے پختہ تر ہو جائے۔ اور آگے اونچی کتابیں آسانی کے ساتھ آپ پڑھا سکیں، چنانچہ پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی لکھتے ہیں۔

"جوانی سے لے کر اب تک میں نے خوب دیکھا ہے، تعلیم سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ دار العلوم میں ابتدائی کتابیں پڑھانے لگے تھے میں نے ان سے ہدایۃ النحو اور قدوری پڑھی تھی۔

انوار القاسمی صہ ۲۳۲

درس تدریس میں ترقی

پھر ہر سال اسباق میں ترقی ہوتی گئی۔ اور ہر علم وفن کی کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ صرف، نحو، فقہ حدیث، تفسیر کلام معانی آپ کی محنت اور تدریس سے جہاں منتظمین مطمئن اور خوش تھے وہاں پڑھنے والے طلبہ بھی کیوں کہ آپکا انداز بیاں دلنشیں تھا۔ اپنے اندر جذب و کشش رکھتا تھا۔

اس کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس شعبہ میں بڑا دخل خداداد ذہانت، علم و ذکاوت علمی شغف کتابی مناسبت اور ذوق و وسعت مطالعہ کو حاصل ہے۔ اور بحمد للہ آپ کے حصہ میں یہ تمام خوبیاں قدرتی طور پر آئی ہیں قوت حافظہ بھی قابل رشک پایا تھا۔ پھر آپنے جن اساتذہ سے تعلیم پائی تھی۔ وہ اس وقت اپنے فن کے ماہر استاذ تھے اور ساتھ ہی زہد و تقویٰ کے پیکر اس لئے تلامذہ میں اس کے اثرات نمایاں طور پر ہوتے ہیں۔

جس زمانے میں آپ نے تعلیم پائی تھی۔ وہ آج سے بالکل مختلف تھا۔ ہندوستان میں جس طرح کے لائق و فائق اور ذی علم اور صاحب فضل و کمال اس زمانہ میں پیدا ہوئے۔ شائد اس کے بعد اس کی کوئی مثال نہیں ملتی آج کے طلبہ واقعہ یہ ہے کہ اس دور کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کہ اس زمانہ کے طلبہ کس قدر ذی استعداد اور محنتی ہوتے تھے۔ اور آپ تو ماشاء اللہ خاندان قاسمی کے چشم و چراغ تھے جنکی تعلیم و تربیت پر محنت کی گئی تھی۔ اور خود آپ اپنے

خاندانی علوم و معارف سے دلچسپی تھی۔

حضرت شاہ صاحب کا تعلیمی دور

محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جو تلامذہ آج بھی موجود ہیں گہری نظر ڈالئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ سب اپنے اپنے حلقہ اثر میں امتیازی علمی حیثیت کے مالک ہیں اور علم و فن سے گہرا شغف رکھتے ہیں، بلکہ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ سے گفتگو کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے استاذ کے مقابلہ میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اور ان میں اپنے علم پر اعتماد کی شان نمایاں ہے۔

آپ کو یہی نہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کی آپ پر خصوصی توجہ تھی۔ اس لئے علم و فن میں آپ کا باکمال ہونا ہرگز حیرت انگیز نہیں۔

نودرہ کی برکت

آپ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کسی کتاب کا کوئی مقام مطالعہ میں حل نہیں ہوتا تھا تو اس کے لئے بڑی کد و کاوش پہلے خود کرتا تھا، پھر کسی استاذ کی طرف رجوع کرتا تھا، خود آپ نے اپنی ایک مجلس سے فرمایا۔

جب میں فارغ ہوگیا تو ابتدائی کتابوں کے اسباق میرے سپرد کئے گئے ہیں میں نے اپنے لئے نودرہ کی درمیانی درسگاہ پسند کی بعض حضرات نے کہا کہ اس کے دونوں طرف درس گاہیں ہیں۔ ان میں شور و شغب زیادہ رہتا ہے۔ نودرہ کی پشت پر پہلے تو بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں اور جہاں اب تحتانی دارالحدیث ہے۔ اس جگہ بہت بڑا تالاب تھا۔ بعض مرتبہ بارش کے زمانہ میں تالاب بھر جاتا تو پانی درس گاہ میں بھی آجاتا تھا۔ اس لئے یہ درس گاہ مناسب نہیں تھی۔ مگر پھر بھی میں نے اسی درس گاہ کو پسند کیا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس درس گاہ کے بارے میں میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا مکاشفہ سُنے ہوئے تھا کہ میں اس درسگاہ سے عرش تک نور کا ایک سلسلہ زنجیر کی مانند دیکھتا ہوں۔ اس لئے اس میں حل مسائل کی برکت راسخ ہے

چنانچہ بار ہا ایسا ہوا کہ مطالعہ سے ایک بات حل نہیں ہوئی اور سمجھ میں نہیں آئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ یا دوسرے اساتذوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ بات کر دی۔ مگر مسئلہ میں انشراح نہیں ہوا لیکن اس درس گاہ میں پہنچ کر خود بخود چند منٹوں میں سارا مسئلہ حل ہو گیا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کسی کتاب میں کوئی سخت مقام آگیا۔ نہ خود سے حل ہوا اور نہ ہی اساتذہ کی تقریر سے انشراح ہوا۔ ارادہ ہوا کہ طلبہ سے کہہ دوں گا۔ اس کے حل کیلئے ہم نے بہت کوشش کی مگر حل نہیں ہو سکا۔ بات میری سمجھ میں پوری طرح نہیں آئی۔ تم لوگ کسی استاذ سے حل کرالینا۔ مگر جب پڑھانے کا وقت آیا تو اس مشکل مقام کیلئے ایسی تقریر خود بخود ذہن میں آئی کہ مسئلہ بالکل واضح اور صاف ہو گیا۔ اور طلبہ بھی منشرح ہو گئے۔ میں نے اسے نودرہ ہی کی برکت محسوس کی۔

فرائض درس وتدریس حسبۃً للہ انجام دیتے تھے۔ اس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتے تھے ۱۳۳۷ھ سے ۱۳۴۳ھ تک درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اور پوری محنت اور رغبت کے ساتھ، جس میں کبھی کسی کوتاہی کو پسند نہیں فرمایا۔ بلکہ اہتمام میں آپ کو لینے پر بزرگوں نے ایک وجہ یہ بھی پیش کی تھی جیسا کہ خود ممدوح ہی کا بیان ہے کہ اسے قبول کر و معاوضہ اگر جاری ہوا تو انتظامی خدمات کا ہوگا تعلیم کا سلسلہ جیسے اب تک حسبۃً للہ یہ بلا معاوضہ جاری ہے۔ آئندہ بھی حسبۃً للہ جاری رہے گا۔ اور جیسے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عمر بھر کبھی تعلیم پر معاوضہ نہیں لیا یہی نوعیت تمہاری بھی رہے گی۔

زینت مسند اہتمام

دوران تدریس و درس میں آپ کی مزید صلاحیت اکابر واساتذہ کے سامنے آئی۔ اس لئے ان کی دلی خواہش ہوئی کہ آپ کو بتدریج دارالعلوم کی مسند قیادت پر فائز کیا جائے۔ تاکہ آئندہ اس

درس گاہ کا علمی رنگ اور دینی ماحول برقرار رہ سکے، اور دارالعلوم جس نہج خاص پر گامزن ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ آنے پائے۔

شاید یہ بھی خیال ہو کہ بانی دارالعلوم حضرت قاسم العلوم سے آپکو نسبت خاص حاصل ہے اور تجربہ نے ثابت کیا تھا کہ دارالعلوم کی ترقی اس خاندان سے وابستہ ہے۔ جو شخصیت سامنے ہے وہ بھی اپنی گوناگوں صلاحیت کی وجہ سے ہر طرح موزوں و مناسب ہے، وسیع حوصلہ، مرنجاں مرنج طبیعت، دارالعلوم سے دلی وابستگی، علم و عمل میں بڑی حد تک ممتاز، سبھوں کے ساتھ یکساں برتاؤ، کبر و نخوت سے پاک، تواضع و خاکساری کا پیکر، تحریر و تقریر دونوں سے طبعی مناسبت، درس و تدریس سے شغف، بہت ساری خوبیاں سے مرصع۔ اور بہت سارے اوصاف و کمالات کا حامل،

مسند اہتمام پر

چنانچہ ۱۳۴۲ھ میں اس وقت کے اکابر اور اساتذہ کی رائے طے پائی گئی کہ آپ کو مسند اہتمام پر بٹھایا جائے۔ اور اس کی صورت یہ تجویز ہوئی کہ پہلے نیابتِ اہتمام پر لایا جائے اور کام کا موقع دیا جائے تاکہ اِن کی انتظامی صلاحیت ابھر کر سامنے آئے۔ ادھر یہ طے ہو رہا تھا ادھر آپ کا یہ حال تھا کہ اِن ذمہ داریوں کے سر آنے کا وہم بھی نہیں تھا۔ پھر طبیعت درس و تدریس سے کافی مانوس ہو چکی تھی۔ اور اس سے مناسبت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ اِس لئے رات دِن اپنے انہی مشاغل میں منہمک تھے اور اسی لائن کی ترقی کیلئے بدل وجان کوشاں تھے جب یہ بات آپ کے سامنے آئی تو آپ نے بڑے ادب سے اِس خدمت سے معذرت پیش کر دی۔ اور اس عہدہ کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اِس عہدہ پر فائز کرنے کی وجہ

اِس زمانہ میں اندرون دارالعلوم کوئی ہنگامہ بھی جاری تھا۔ اس کی وجہ سے بھی کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آپ کے آنے سے یہ ہنگامہ فرو ہو جائیگا۔ خود آپ کا بیان ہے۔

"۱۳۴۲ھ کا واقعہ ہے کہ اہتمام میرے سپرد کیا جا رہا تھا۔ اور میں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں عرض کرتا تھا کہ میری طبیعت طالبعلمانہ ہے۔ یہ

انتظامی جھگڑے مجھ سے برداشت نہیں ہونگے مگر بزرگوں نے کہا کہ یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہ ہوگا جب تک تم کو اہتمام پر نہ لیا جائے۔ میں نے زبانی طور پر ان سے بہت معذرت کی، مگر وہ نہیں مانے۔ جب مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا سعیدالدین نے میرے والد بزرگوار کے رُوبرو مجھ سے یہ بات کہی تو میں نے حضرت والد صاحب مرحوم کو حیدرآباد کی نصیحت یاد دلائی کہ آپ نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ دارالعلوم کے اہتمام کے جھگڑے میں ہم نے چالیس سال برداشت کیئے مگر تم اس سے بچنا اور اپنی جدّی میراث سنبھالنا اور وہ علم ہے۔ ان انتظامی جھگڑوں میں نہ پڑنا۔ یہ وصیت یاد دلا کر عرض کیا کہ جب خود آپ کی یہ نصیحت تھی اب پھر آپ کے سامنے مجھے ان جھگڑوں میں پڑنے کیلئے کیوں کہا جا رہا ہے اور آپ اس کی تائید کیسے فرما رہے ہیں۔ میری یہ باتیں سُنکر حضرت والد صاحب نے فرمایا میری نصیحت اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔ مگر اس وقت صورتِ حال مجبورکن پیدا ہو گئی ہے اور تمام بزرگوں کا فیصلہ یہی ہے۔ اس وقت ان کی بات مان لو، آگے تم کو ہر وقت اختیار ہے۔ اس اختیار والی شرط کے پیشِ نظر میں نے دباؤ میں آکر مجبوراً اُس وقت بزرگوں کا یہ فیصلہ مان لیا۔"

اہتمام سے عدم مناسبت

مگر چونکہ آپ کو اہتمام کے کاموں سے طبعی مناسبت نہیں تھی، اس لیے تقرر کے باوجود کوئی دلچسپی نہیں بلکہ برائے نام یہ خدمت انجام دیتے رہے اور اسکی صورت بقول خود یہ تھی کہ:۔

" اہتمام سے مناسبت تھی نہیں اس لیے ہر تیسرے چوتھے دن مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے سامنے رجسٹر پیش کر دیتا ہے۔ سال بھر اسی طرح معاملہ چلتا رہا، لیکن جب جب موقع ملتا تھا اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرتا رہتا تھا۔ اور یہ کہ مجھے اس خدمت سے معاف فرما دیا جائے، مگر میری درخواست قبول نہیں کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ سب کام چھوڑ کر میں تھانہ بھون بھاگ گیا۔ اور یہ لکھ دیا کہ آپ کا یہ کام ہم سے نہیں ہو سکے گا۔ کسی اور کے

سپرد کر دیا جائے۔ میرے اس طریقے سے سارے بڑے بہت پریشان ہوئے حضرت مدنیؒ (حضرت مولانا حسین احمد مدنی) مولانا ابراہیم صاحب بلیاویؒ مولانا اعزاز علیؒ (شیخ الادب) اور مولانا عبدالسمیع صاحبؒ یہ چاروں حضرات تھانہ بھون پہنچے اور حضرت اقدس تھانویؒ سے فرمایا۔ حضرت! آپ کے یہاں ہمارا ایک چور آیا ہے۔ اور آپنے اسے پناہ دے رکھی ہے۔ حضرت تھانویؒ کو اس واقعہ کی کوئی خبر نہیں تھی فرمایا! کیسا چور؟ کیا مطلب؟ ان حضرات نے میرا نام لے کر عرض کیا یہ تھانہ بھون آگئے ہیں اور وہاں یہ تحریر لکھ کر دے آئے ہیں۔ کہ مجھ سے جھگڑے برداشت نہ ہوں گے، کسی دوسرے کے سپرد کیا جائے۔ فرمایا جائے ہم لوگ مدرسہ کس کے سپرد کریں۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا مجھے اس کی کچھ خبر نہیں۔ پھر مجھے طلب فرمایا اور مخاطب کر کے کہا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی کہ سارا کام چھوڑ کر یہاں آگئے۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے، یہ گاڑی مجھ سے نہیں چل سکے گی۔ ان آنے والے حضرات نے فرمایا ضرور چلے گی کیسے نہیں چلے گی۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ سے یہ کام نہیں چل سکتا ہے۔ وہ حضرات بار بار فرماتے رہے۔ میں انکار کرتا رہا۔ ان حضرات نے کہا جیسے ہو گا تم کو زبردستی لے کر جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حضرات مجھے وہاں سے لے کر آئے مگر میرا عجب حال تھا اور سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا کہ کیا کیا جائے۔ میں اہتمام چاہتا نہیں اور یہ حضرات مانتے نہیں۔

بکرِ عہدہ پر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا مدظلہ نے اہتمام سے بچنے کی بڑی جدوجہد کی۔ اور جو کچھ بس میں تھا وہ سب کیا، مگر بزرگوں کے آگے مجبور ہو جاتے تھے۔ اور واقعہ ہے کہ جب کوئی کام طبیعت کے خلاف ہوتا ہے تو آدمی بڑی ہی کشمکش میں اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اوراس وقت اور بھی جب اوپر سے دباؤ پڑ رہا ہو، دارالعلوم ہو یا کوئی دوسرا تعلیمی ادارہ اس کے اہتمام کا کام علمی مزاج سے قطعاً میل نہیں کھاتا۔ علمی مزاج یکسوئی چاہتا ہے اور سبھوں سے کنارہ کشی، اور اہتمام کا تعلق چونکہ مدرسین، طلبہ اور متعلقین سبھوں سے ہوتا ہے اس لئے یہاں یکسوئی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہر دن ایک نیا جھگڑا سامنے آتا ہے۔ اور اسے چکانا پڑتا ہے اور پھر علماء کرام کا جھگڑا تو عجیب طرح کا ہوتا ہے۔ عموماً اوپر کی سطح ساکن ہوتی ہے مگر اس کی تہ میں طوفانی موجیں ٹھاٹھیں مارتی ہوتی ہیں، کھل کر کوئی بات نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ادب واحترام اور علم وفضل کا تقاضہ سنجیدگی ومتانت کو چاہتا ہے چنانچہ ظاہر ہی کیا جاتا ہے، اور علمی غرور ونخوت اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اِس لئے وہ نیچے نیچے ڈبکی کشتی فرائض انجام دینے پر شائد مجبور رہوتا ہے۔

آپ کا طبعی مزاج

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کا جو آج بھی مزاج ہے۔ واقعہ ہے اس سے کار اہتمام موجودہ سیاسی دور میں قطعاً میل نہیں رکھتا۔ جس کی اور ہر سال کی مجلس میں کبھی غیر بات سننے میں نہیں آتی، جہاں خرافات ولغویات کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ جو کسی کی دل آزادی کو لمحہ بھر کیلئے پسند نہیں کرتا ہو جس کے سوچنے اور کرنے کی لائن خالص تعمیری ہو۔ جو ہر شخص کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہو اور جس نے کسی سے ٹوٹ کر کبھی گفتگو نہ کی ہو۔ وہ ایسے انتظامی معاملات جن سے ایسے ہزاروں افراد منسلک ہوں جو مختلف ممالک اور مختلف آب وہوا کے پروردہ ہوں کیسے برداشت کرنے پر آسانی سے آمادہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اب بھی کبھی کبھی اپنی مجلسوں میں فرماتے ہیں کہ ان جھگڑوں سے اب بھی مجھے کوئی طبعی مناسبت پیدا نہیں ہوئی۔ بزرگوں نے یہ امانت سپرد کی تھی اسے ڈھنو رہا ہوں۔

باوجود ناگواری اہتمام پر رہنے کی وجہ

حضرت موصوف فرماتے ہیں کہ بہت دنوں تک اہتمام کے معاملے میں ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے پھر ایک دو خواب کے بعد

تھوڑا سا اطمینان ہوا۔ خود فرماتے ہیں :-

"پھر ایک ڈیڑھ سال کے بعد ہم نے ایک خواب دیکھا اور خواب یہ تھا کہ میں اور یہ سارے بزرگ مدینہ منورہ میں حاضر ہیں اور ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ہیں، ان میں حضرت مدنیؒ بھی ہیں اور مولانا عبدالسمیعؒ وغیرہ دوسرے سارے بزرگ بھی، مولانا مدنیؒ نے چائے منگوائی اس پر میں نے عرض کیا ہم لوگ زیارت کیلئے آئے ہیں۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ پہلے زیارت سے فارغ ہوجائیں۔ پھر چائے پیتے رہیں گے۔ چنانچہ سب حضرات ہوٹل سے اُٹھ گئے۔ اور حرم نبوی شریف پہنچے میں نے دیکھا کہ نیچے حرم شریف ہے اور اس کے اُوپر دارالعلوم دیوبند مدرسہ ہے، اس منظر سے مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ دارالعلوم تو ہندوستان میں ہے اور اسے ہم یہاں حرم نبوی کے اوپر دیکھ رہے ہیں۔ میں دارالعلوم میں زمانہ طالب علمی میں صدر دروازے کے اوپر جس کمرہ کے اندر رہا کرتا تھا۔ میں نے سوچا جب پورا دارالعلوم ہے تو اس میں میرا وہ حجرہ بھی ہوگا۔ اور دفتر اہتمام بھی ہوگا۔ چنانچہ میں پہلے اپنے کمرہ میں گیا۔ پھر اہتمام میں حاضر ہوا۔ دیکھا وہاں ہمارے سارے بزرگ موجود ہیں حضرت مدنیؒ کے بڑے بھائی مولانا سید احمد بھی موجود ہے۔ اور پلاؤ کا ایک دیگچہ بھی تیار رکھا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، کھانا کھالو ورنہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔ پلاؤ نکل کر سامنے بھی آگیا۔ سب حضرات کھانے پر بیٹھ گئے۔ یہاں پھر میں نے سبھوں سے عرض کیا حضرت ہمارا مقصد زیارت ہے، نہ کہ یہ کھانا میری رائے تو یہ ہے کہ ہم لوگ پہلے زیارت سے فارغ ہوجائیں پھر اطمینان سے کھانا کھائیں۔ یہ سن کر سب حضرات نے فرمایا یہ ٹھیک کہتا ہے کھانا چھوڑ دو چلو پہلے زیارت کرلیں۔ پھر کھانا کھالیں گے۔ وہاں سے اُٹھ کر ہم سب نیچے حرم شریف میں آگئے۔ میں نے دیکھا کہ حرم شریف اس قدر چوڑا ہے کہ اس میں ہزاروں ستون ہیں اور آخیر میں بالکل اندھیرا ہوگیا ہے۔ وہاں کوئی

روشنی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز نظر آتی ہے ۔ اور ہم لوگ حرم میں داخل ہو گئے اور جس طرح ہم لوگ بڑھتے جا رہے تھے اندھیرا بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اندھیرے کی وجہ سے کچھ لوگ واپس ہو گئے آخیر میں تنہا رہ گیا۔ میں نے کہا جو کچھ ہو میں ہر حال میں زیارت سے فارغ ہو کر ہی جاؤں گا۔ پھر ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا۔ کافی دور پہنچنے کے بعد ادھر سے کچھ روشنی محسوس ہوئی۔ میں نے روضہ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا کہ وہ بارہ دری سے بنی ہے۔ ہر طرف تین تین دروازے ہیں۔ اور ان کے درمیان میں ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ اس پر سرور کائنات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں۔ اور سر سے پیر تک سفید چادر تنی ہے۔ اس وقت میری یہ کیفیت ہے کہ مجھ پر گریہ وزاری طاری ہے اور اس کی وجہ سے آنکھیں تر ہیں۔ ہیبت کی وجہ سے میرے پیر حرکت نہیں کرتے مگر اندر سے جذبہ یہ ہے کہ جو بھی ہو کسی طرح اندر پہنچ جاؤں۔ آنکھوں میں آنسو، پیر آگے بڑھتے نہیں۔ مگر پھر بھی آہستہ آہستہ چل رہا ہوں یہاں تک روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو گیا۔ اور میرے گھٹنے اس چارپائی سے لگ گئے۔ جس پر آپ آرام فرما ہیں۔ آپ نے اپنا دست مبارک باہر نکالا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے مضبوط تھام لیا اور اسی حالت میں میری آنکھ کھل گئی۔ مگر دیکھا میرے ہاتھ اسی طرح تھے جس طرح میں نے آپ کا ہاتھ مضبوط تھام رکھا تھا۔ اس خواب کے بعد جو طبیعت میں گرانی تھی۔ وہ جاتی رہی اور میں نے سمجھا یہ خدمت میرے سپرد منجانب اللہ ہے۔ لہذا اس سے معاوضہ مناسب نہیں ہے۔ کہیں اس کا مجھ پر کوئی وبال نہ پڑھ جائے۔ گو اس کام سے کراہت تھی۔ مگر استعفاء دینا میں نے ترک کر دیا۔

ایک خواب اسی پریشانی کے عالم میں آپ نے دوسرا خواب دیکھا، اس میں یہ دیکھا کہ اہتمام کے اوپر جو کمرہ ہے اور جس میں آپ اس زمانہ میں یکسوئی

کے ساتھ اہتمام کے کام انجام دیا کرتے تھے۔ وہ جنت میں آگیا ہے یا وہ جنت میں ہی ایک کمرہ ہے جس وقت اس کمرہ میں پہنچے ہیں کوئی ہاتف کہہ رہا ہے۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ

مگر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے، کہ وہ کون ہے، پھر آپ کی آنکھ کھل گئی۔ فرماتے ہیں اس خواب سے بھی مجھے تسکین ہوئی اور بار بار استعفار دینے کا جو خیال دل میں آتا ہے۔ اسے میں نے نکال دیا۔

مختصر یہ کہ ان دنوں خوابوں کی وجہ سے آپ کو اہتمام کے سلسلہ میں جو وحشت تھی وہ جاتی رہی۔ اور مفوضہ خدمات برضا و رغبت انجام دینے لگے۔ اور بحمد للہ اب تک اس خدمت میں منہمک ہے۔

عہدہ قائمقام پر تقرر

سنہ ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم کے اندر جو شورش برپا ہوئی تھی اس زمانہ میں آپؒ کے والد محترم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند بیمار تھے۔ چنانچہ مجلس شوریٰ نے یکم ربیع الاول سنہ ۱۳۴۳ھ سے آپ کا تقرر قائمقام مہتمم کے عہدہ پر باضابطہ کر دیا گیا۔ مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا آپ نے یہ فریضہ پوری دلچسپی سے انجام نہیں دیا لیکن چونکہ ہو گئے ذمہ دار اس لئے اس سے مفر بھی نہیں تھا۔ سنہ ۱۳۴۴ھ میں دارالعلوم میں کوئی خلفشار پیدا ہوا۔ آپ کے والد بزرگوار جو اس وقت مہتمم تھے بیمار تھے۔ اس لئے اس ہنگامہ کے سال آپ کو تدبیر و جانفشانی اور تندہی کا ثبوت دینا پڑا۔ اس سال کی رُوداد میں آپکی خدمت سے متعلق ان الفاظ میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔

> اس شورش کے وقت بعض مرتبہ اچھے اچھے مدبروں سے بھی لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ یا عجلت میں وہ کچھ کر گذرتے ہیں، جو نہ کرنا چاہیئے، بسا اوقات بحالت غضب نامناسب امور سرزد ہو جاتے ہیں مگر بحمد للہ انکے تدبر اور علم نے ثابت کر دیا کہ خصائل علمیہ کے ساتھ ہی ساتھ آپ میں تدبر اور علم بھی ہے۔ انہوں نے طلبہ کی ان حرکات کی جو حد سے متجاوز ہو چکی ہیں مطلقاً

نہ اِن سے کسی قسم کی مزاحمت کی۔ تقریروں میں اِن پر تعریضیں بھی کی گئیں بعض مرتبہ تصریح کی نوبت بھی آئی مگر انہوں نے کوئی ایسا موقع نہ آنے دیا کہ جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ اگر مولوی صاحب موصوف سکوت کرتے تو شورش ترقی پذیر نہ ہوتی۔ انہوں نے اِس وقت نہایت سکون اور صبر کے ساتھ گذارا۔ انہیں کی تقلید میں دیگر کارکنان دارالعلوم نے بھی طلبہ سے مقاومت نہ کی۔" (رو داد دارالعلوم ص۱ ۱۳۴۸ھ)

مخالفت کے باوجود کام

حضرت والا (مولانا محمد طیب مدظلہٗ) اس عہدۂ قائمقامی پر جمادی الاخریٰ ۱۳۴۸ھ تک کام کرتے رہے

یہ دور جیسا کہ معلوم ہو چکا بڑا ہی ناگوار اور پُرشور تھا، اور ایک بڑی جماعت دارالعلوم کے اندر آپکی سخت مخالف تھی، مگر آپنے چونکہ خدمت کا بزرگوں کے کہنے پر ارادہ کرلیا تھا۔ اس لئے بڑی خوش اسلوبی اور صبر و ضبط سے انجام دیتے رہے۔ جن لوگوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اخلاص و للہیت کی وافر دولت سے نوازا ہے۔ موجودہ سیاسی مزاج کی کوئی معمولی سے پرچھائیں بھی آپ پر پڑنے نہیں پائی ہے۔ اندر سے معصوم، صاف باطن اور پاک نفس واقع ہوئے حلم و تواضع کی دولت سے بھی بھرپور حصہ عطا ہوا ہے۔ مروت و شرافت طبعی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے کا لحاظ و پاس آپ کو ورثہ میں ملا ہے۔ ان اوصاف و خصائل نے آپ کو بہت بلند کر دیا اور سچ پوچھئے تو یہی اوصاف و کمالات ہیں۔ جن کے آگے مخالفین اور بدباطنوں کی کبھی نہیں چلی اور نہ ان شاء اللہ کبھی چلے گی۔ ورنہ آپ کے ساتھ اس وقت جو معاملہ ہوا۔ اور آج تک جس طرح ایک سیاسی جماعت درپئے آزار ہے۔ آپ کو کنارہ کشی اختیار کرلینی چاہیئے تھی۔ اور شاید مجبور ہو کر کبھی کبھی ایسا ارادہ بھی کرنا پڑا ہو۔ مگر عملاً برابر لگے رہے پہلے آپکے والد محترم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کا انتقال ہوا جسکی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ اُن کے بعد عہدۂ اہتمام پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی فائز کئے گئے جو پہلے سے عہدہ نیابت پر فائز چلے آرہے تھے۔ مگر مولانا عثمانیؒ کی زندگی نے بھی وفا نہ کی۔ اور تھوڑے سے ہی دنوں کے بعد رجب

سنہ ۱۳۴۸ھ میں حضرت مولانا کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت دارالعلوم دونوں پُرانے خادموں سے محروم ہوچکا تھا۔ جن کا تدبر ہمارے حلقہ میں مشہور تھا، اور جو بہت سارے اساتذہ کے استاذ کی حیثیت رکھتے تھے۔

عہدۂ اہتمام پر فائز

یہ وقت دارالعلوم کیلئے بڑا ہی نازک اور صبر آزما وقت تھا اور خواص وعوام پر ان دونوں بزرگوں کے دفعۃً اُٹھ جانے سے بڑا ہی ناگوار اثر تھا، اور اس فکر میں مبتلا ہو رہے تھے کہ اس کشتی کا کھیّبان کون بنے گا۔ حکیم الامتہ حضرت تھانویؒ بقید حیات تھے۔ اور دارالعلوم کے سرپرست تھے۔ اور بے پناہ اثرات کے مالک تھے پورے برصغیر کے علماء ومشائخ اور ارباب فضل وکمال آپ سے وابستہ تھا۔ اِن حادثات سے حضرت تھانویؒ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اور سب سے زیادہ آپ کو دارالعلوم کی فکر تھی۔ آپنے حالات کا جائزہ لے کر ۶ رجب سنہ ۱۳۴۸ھ کو ایک اشتہار شائع فرمایا جس میں مفارقت اختیار کرنیوالوں کے متعلق آپ کے ذاتی تاثرات تھے۔ اسی اشتہار میں آپ نے یہ بھی اعلان فرمایا۔

"مصالح مدرسہ پر نظر کر کے حتی الامکان جلد سے تجویز ہے کہ ارکان شوریٰ کا جلسہ منعقد کر کے نسبت تقرر مہتمم مستقل ودیگر ضروریات وقتیہ کا فیصلہ کیا جائے۔ جب تک جلسہ میں معاملات مصالح مدرسہ پر نظر کر کے مناسب معلوم ہوا کہ مولوی محمد طیب صاحب جو اس وقت تک نائب مہتمم ہیں فوری طور پر عارضی مہتمم مقرر کردیا جائے، پھر جلسہ شوریٰ جو کچھ باقاعدہ طے کرے، اس کا دوبارہ اعلان کردیا جائے۔ ،،مزید احتیاط اس کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ انعقاد جلسہ اور مسئلہ اہتمام کے طے ہونے تک قائم مقام مہتمم کی امداد وتقویت کیلئے حضرت مولانا حسین احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب مدرس مدرسہ اور مولانا مولوی سید مرتضیٰ حسن صاحب ناظم تعلیمات مدرسہ کو ان کا مشیر مقرر کیا جائے کہ معمولی کاموں کے علاوہ جو امر اہم پیش آجائے، ان تینوں حضرات سے

مشورہ کر کے عمل کریں اگر اتفاقاً باہم اختلاف ہو تو سرپرست ایک شق کو ترجیح دے سکے گا۔

(اشرف علی ۶ ر رجب ۱۳۴۸ھ)

والد محترم حضرت مولانا حافظ احمد صاحبؒ کی اخیر زندگی میں عہدوں کی ترتیب یہ تھی کہ حضرت حافظ صاحبؒ مہتمم تھے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نائب مہتمم اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ قائمقام مہتمم، جب مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کا انتقال ہو گیا، تو آپکی جگہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم بنائے گئے اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مولانا عثمانیؒ کی جگہ نائب مہتمم ہو گئے تھے اور جب مولانا عثمانیؒ کا انتقال ہو گیا اور اہتمام کا عہدہ خالی رہ گیا۔ تو مذکورہ بالا اعلان کے ذریعہ سرپرست دارالعلوم دیوبند حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ العزیز حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ نیابت اہتمام سے قائمقام مہتمم بنائے گئے۔ اور اس طرح دارالعلوم کی ذمہ داری آپ کے سر آگئی۔ سرپرست دارالعلوم کے مطابق آپنے ساری ذمہ داری سنبھال لی اور پوری تندہی سے یہ فرائض انجام دینے لگے۔ ماشاء اللہ اس وقت جوان تھے۔ کام کرنے کا جذبہ تھا۔ اور حالات کا دباؤ بھی تھا کہ آپ پوری بیدار دماغی اور دوراندیشی سے اپنے فرائض انجام دیں۔ (بقیہ تفصیل دوسرے حصہ میں آرہی ہے)

مجالس حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

کی

علم وحکمت اور بزرگان کے واقعات سے بھرپور

علمی مجالس

مرتبہ

مولوی حبیب اللہ صاحب ناظم ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند

مطالعہ سے پہلے

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا۔ اَمَّا بعد۔ یہ اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ بزرگانِ دین اور علماءِ ربانیین کی مجالسِ حسنہ اور ان کے مواعظ و ملفوظات، ان کی صحبت کے بَدَل ہوا کرتے ہیں۔ اسی لئے علماء حضرات نے ان کی سوانح حیات اور علمی، اصلاحی اور دینی کارناموں کو ہمیشہ قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ آنیوالی اُمت ان کی شخصیت سے متعارف ہوکر ان کے فیوض و برکات سے استفادہ کر سکے۔ اگر ان کے حالاتِ زندگی کو قلم بند کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو علم و اصلاح اور ان کی دینی خدمات کا ایک بہت بڑا حصہ ان کے ساتھ چلا جاتا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی عالمگیر شخصیت بالکل نمایاں ہے آپ ان کی مجالس کو پڑھ کر یہ احساس ضرور کریں گے کہ اگر یہ مجالسِ حسنہ قلم بند نہ کی جاتیں تو علم و حکمت کا ایک بہت بڑا حصہ آپ کے ساتھ چلا جاتا اور مستفیدین ان سے محروم رہ جاتے

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر اور احسان ہے کہ جن مجالس کی طباعت اور اشاعت کیلئے کافی عرصہ سے کوشش کی جارہی تھی۔ وہ چھپ کر منظرِ عام پر آگئی ہیں اس کتاب کی تیاری میں بڑی کوشش اور محنت کی گئی ہے اس کے باوجود اگر کتابت و طباعت وغیرہ کے سلسلے میں آپ کوئی کمی محسوس کریں تو اعتراض کے بجائے بطور اصلاح ادارہ کو اطلاع دیں تاکہ آئندہ اس کی رعایت کیجائے

دوسری جلد میں صرف مجالسِ حسنہ ہی کا سلسلہ رہے گا ـــــــ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالسَّلَامُ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

مجلس بسم اللہ شریف کی اہمیت اور اس کے فضائل پر ایک محققانہ بیان

سوال:۔ بسم اللہ شریف کے بارے میں حدیث شریف میں آیا ہے کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَاءْ بِبِسْمِ اللّٰہِ فَھُوَ اَقْطَعُ۔ یعنی ہر وہ کام جو بسم اللہ کے ساتھ شروع نہ کیا جائے وہ نامکمل ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے اہم کام بغیر بسم اللہ کے کئے جاتے ہیں اور وہ مکمل ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سے اہم کام بسم اللہ کے ساتھ شروع کئے جاتے ہیں مگر وہ پھر نامکمل ہوتے ہیں۔ تو حدیث کا مطلب کیا ہے؟

جواب:۔ حضرت والا نے فرمایا کہ جتنے بھی اہم کام ہیں شریعتِ اسلام نے ان کے سلسلے میں فرمایا ہے کہ بسم اللہ سے ابتداء کی جائے جیسا کہ حدیث میں ہے کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَاَ بِبِسْمِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَھُوَ اَقْطَعُ اور بعض روایات میں ہے کہ کل اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَاَ بِبِسْمِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَھُوَ اَبْتَرُ۔ اور بعض روایات میں ہے کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَھُوَ اَقْطَعُ اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَاَ بِاِسْمِ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃِ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَھُوَ اَبْتَرُ۔ یہ مختلف صیغے احادیث میں آتے ہیں۔ بعض نے تو اس کا مطلب یہ سمجھا کہ ذکر اللہ سے ابتداء ہونی چاہیے خواہ وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہو یا اور کوئی ذکر ہو۔ غرض اللہ کے نام سے

سے ابتداء ہو تو وہ کام بابرکت ہو گا لیکن جب بعض روایت میں بسم اللہ کی صراحت موجود ہے تو بسم اللہ کی تخصیص زیادہ اولیٰ ہوگی۔ بات تو یہی ہے کہ کوئی اہم کام جو زندگی میں اہم سمجھا جاتا ہے وہ بسم اللہ کے بغیر نہ ہونا چاہیئے۔ عملی صورت شریعت نے اس کی مختلف پیش کی ہے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ جس کھانے کی ابتداء بسم اللہ سے کی جائے اور اس کی انتہاء اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا پر ہو، تو غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ یعنی اس کے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں خواہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہوں۔ بہرحال مغفرت کا وعدہ ہے۔ بسم اللہ کی فضیلت کے لیے صرف یہی ایک حدیث بہت کافی ہے کھانا کھانے لباس پہلنے کے وقت، اسی طرح ہر کام شروع کرنے کے وقت شریعت کا یہی حکم ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر شروع کرو۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی دوسری دعائیں حدیث شریف میں آئی ہیں جن کے پڑھنے کا حکم حدیث شریف میں آیا ہے مثلاً کوئی گھر سے باہر نکلے تو اس کو حکم ہے کہ یہ دعا پڑھے :-

بِسْمِ اللّٰہِ اٰمَنَّا وَعَلَى اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ
اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ کُلِّ عَمَلٍ یُّخْزِیْنِیْ وَاَعُوْذُبِكَ
مِنْ کُلِّ صَاحِبٍ یُّؤْذِیْنِیْ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ کُلِّ اَمَلٍ یُّلْھِیْنِیْ وَاَعُوْذُ
بِكَ مِنْ کُلِّ فَقْرٍ یُّنْسِیْنِیْ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ کُلِّ غِنًی یُّطْغِیْنِیْ ۰

کُلِّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَاْ بِبِسْمِ اللّٰہِ ایک اصول ہے۔ اس اصول کے تحت امر یہ ہے کہ گھر سے باہر نکلو تو بسم اللہ پڑھو۔ جب ان امور میں بھی بسم اللہ کا حکم ہے تو ظاہر بات ہے جو کام ضروری اور اہم ہوں گے ان میں بسم اللہ سے شروع کرنا اولیٰ ہوگا، اور اس کے بغیر اس میں برکت نہیں ہوگی۔ اس لیے فَھُوَ اَقْطَعُ فرمایا گیا کہ یہ کام مقطوع البرکت ہو جائے گا۔ اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ بعض

لوگ بسم اللہ نہیں پڑھتے اور کام ہو جاتا ہے۔ تو اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک ہے دُنیوی کاموں کی تکمیل۔ یہ بسم اللہ پر موقوف نہیں ہے اور ایک ہے آخرت کی برکت تو عنداللہ اس کا مقبول ہونا اور اس پر ثواب ملنا یہ بغیر بسم اللہ کے نہیں ہے۔ شریعت کا موضوع اولاً آخرت کے لئے کام کرنا ہے باقی دنیوی معاملات تو اس کے تابع ہیں۔ لہٰذا اگر دُنیوی کام بغیر بسم اللہ کے مکمل ہو جائے تو ضروری نہیں ہے کہ آخرت میں وہ مقبول بھی ہو جائے اور اس پر اس کو اجر ثواب بھی ملے۔ جیسے بعض افعال حسّی ایسے ہیں کہ بغیر بسم اللہ کے اگر وہ کیئے جائیں تو شریعت نے ان پر بھی ثمرات مرتب کئے ہیں لیکن وہ ثواب کا مستحق بھی بنے یہ ضروری نہیں ہے۔ مثلاً ایک شخص نے بلا نیت کے وضو کر لیا تو وہ مفتاح صلوٰۃ بن جائے گا اور نماز ہو جائے گی۔ لیکن وضو کے عمل پر جس خیر و برکت کا شریعت نے وعدہ کیا ہے وہ اس کو نہیں ملے گا۔ ایک تو یہ ہے دنیا میں کسی کام کا مفتاح بن جانا، اور کام ہو جانا، اور ایک ہے عنداللہ مقبول ہونا۔ تو شریعت کا مقصد یہ ہے کہ وہ عنداللہ مقبول بنے۔ دُنیا میں اگر کامیابی ہو جائے تو ہو جائے مگر آخرت کی کامیابی بغیر بسم اللہ کے نہیں ہوگی۔ تو یہاں فھو اقطع کا معنیٰ... مقطوع البرکت کے ہیں مقطوع الثمرہ کے نہیں ہیں کہ کوئی ثمرہ ہی مرتّب نہ ہو۔ بلکہ کبھی ثمرات بھی مرتّب ہو جاتے ہیں جیسے بغیر نیت کے وضو کا مفتاح صلوٰۃ بن جانا یا غسل جنابت کا بلا نیت کے نماز کے لئے مفتاح بن جانا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیوی عمل پر ثمرہ مرتب فرمایا ہے لیکن وضو اور غسل کا جو ثواب ہے وہ مرتّب نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے لئے نیت شرط ہے۔

اس سے دھوکا نہ کھایا جائے کہ بہت سے ہمارے کام بغیر بسم اللہ کے ہو جاتے ہیں وہ کام دنیا کی حیثیت سے ہیں۔ آخرت میں ان پر کوئی ثمرہ مرتّب

نہ ہو گا۔

نظام الملک کا واقعہ یہاں پہنچکر آپ نے آخرت کے ثمرات مرتب ہونے اور نہ ہونے کے متعلق نظام الملک کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ آلِ سنجر کا ایک وزیر تھا ان کا نام نظام الملک تھا وہ بہت دیندار وزیر تھا اس نے ارادہ کیا کہ میں احیاء علوم کے لئے ایک مدرسہ بناؤں گا تاکہ تعلیم عام ہو۔ چنانچہ اس نے لاکھوں روپیہ اپنی ذات سے خرچ کر کے ایک بہت بڑی... عمارت بنائی اور شیخ تقی الدین ابنِ دقیقؒ کو جو وقت کے بہت بڑے محدث فقیہہ عارف باللہ اور عارف عالِم تھے۔ ان کو صدر مدرّس بنایا اور بڑے بڑے اکابر علماء کو مدرّسین مقرر کیا۔ غرض طلباء فارغ التحصیل ہونے لگے۔

ایک دفعہ نظام الملک کے کانوں میں یہ خبر پہنچی کہ عام طور سے طلباء کی نیتیں فاسد ہیں اور وہ اُمور دین کو دُنیوی اغراض کے لئے حاصل کر رہے ہیں جس کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ وہ علم وبال ہے اگر اس کو ذریعہ بنایا جائے دنیا کے لئے۔ تو اس نے ارادہ کر لیا کہ میں مدرسہ توڑ دوں گا۔ اس کے بعد اس نے خیال کیا کہ ممکن ہے یہ خبریں غلط ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ میں خود بھی تحقیق کر لوں۔

ایک دن اُس نے بھیس بدل کر عامیانہ لباس پہن کر مدرسہ میں گھومنا شروع کیا۔ سینکڑوں طلباء مطالعہ اور تکرار میں مصروف تھے۔ نظام الملک نے طلباء سے دریافت کرنا شروع کیا کہ تم علم کیوں حاصل کرتے ہو؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ میرے خاندان میں وزارت کا عہدہ چلا آرہا ہے میں اس لیے پڑھ رہا ہوں کہ میں بھی وزارت کے عُہدے پر پہنچ جاؤں، کسی نے کہا کہ ہمارے خاندان میں قاضی کا عُہدہ چلا آرہا ہے میں اس لیے پڑھ رہا ہوں کہ قاضی بن جاؤں۔ کسی نے کہا کہ میں اس لیے پڑھ رہا ہوں تاکہ مشہور ہو جاؤں میرا مقصد

شہرت حاصل کرنا ہے۔

غرض عام طور پر طلباء نے جو اغراض بیان کیے وہ فاسد ہی اغراض تھے۔ یہ سُن کر نظام الملک نے ارادہ کر لیا کہ اب مَیں مدرسہ توڑ دوں گا۔ میں تو لاکھوں روپے صَرف کروں اور اغراض فاسد ہوں تو فاسد اغراض سے علم بھی فاسد بن جائے گا اور مبنیٰ فساد بن جائے گا۔ پھر ایک طالب علم کو دیکھا کہ ایک ٹمٹماتے ہوئے دِیے کے سامنے مطالعہ میں مصروف اور بہت زیادہ منہمک ہے نظام الملک نے اس سے پوچھا کہ تو کس لیے پڑھ رہا ہے۔ اس طالب علم نے نگاہ تک اُٹھا کر نہیں دیکھا، اُس نے کہا کہ بھائی ایک آدمی آپ کے پاس کھڑا ہے اور کچھ پوچھنا چاہتا ہے کہ تم کون ہو۔ اس پر اس طالب علم نے کہا کہ مَیں جو گھر بار چھوڑ کر آیا ہوں تو کتاب دیکھنے کے لئے آیا ہوں مجھے اتنی فرصت کہاں ہے کہ مَیں آپ سے گفت گُو کروں۔

یہ سُن کر نظام الملک کے دل میں اس کی بڑی وَقعت ہوئی اور کہا کہ میں آپ سے مختصر سوال کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ تم اتنی محنت کیوں کرتے ہو۔ طالب علم نے جواب دیا کہ میں نے اپنے باپ دادا اور خاندانی روایات سے یہ معلوم کیا ہے کہ ہمارا کوئی خالق اور رب ہے اور ظاہر بات ہے کہ اتنا بڑا مُحسن کوئی نہیں کہ جس نے زندگی عطا کر دی ہے بغیر کسی محنت اور قیمت کے، اور جس نے بقا کے سامان کیے ہیں ہر آن اس کے احسانات ہیں اور وہ احسانات لامحدود ہیں، اس لیے ہم پہ شکر گذاری لامحدود واجب ہے، اور احسانات کا ماننا بھی ضروری ہے اور یہ کہ ہم انتہا سے زیادہ مانیں مگر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ادائیگی حقوق اور احسان اور ان سے ملنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے اس لئے میں پڑھ رہا ہوں تاکہ ہم کو یہ طریقہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے احسان اور شکریہ کا حق کس طرح ادا کروں۔ اس نے

اس طالب علم کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا کہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس مدرسہ کو توڑ دوں۔ اس لیے کہ عام طور پر طلباء کے اغراض فاسد ہیں ایک تو ہے کہ جس سے معلوم ہوا حقیقۃً آخرت کے لئے پڑھ رہا ہوں دُنیا کے لیئے نہیں اس لیے اب میں مدرسہ کو جاری رکھوں گا اور لاکھوں روپیہ خرچ کروں گا صرف ایک تیری وجہ سے، جب تو فارغ التحصیل ہو جائے گا تو میں غور کروں گا کہ مدرسہ کو توڑ دوں یا باقی رکھوں۔

یہ طالب علم تھے۔ امام غزالیؒ اس لئے امام بننا کوئی آسان چیز نہیں ہے جب تک آدمی اپنی جان کو قربان نہ کر دے اور خالص نیت طلب آخرت کی نہ ہو امام کا رتبہ نہیں مل سکتا۔ اس میں نیت اور اخلاص کی ہی برکت ہے کہ ایک شخص امامت کے درجہ پر پہنچا اور اس نے امامت قبول کی۔

حضرت تھانویؒ کے معمولات

اِس پر مجھے حضرت تھانویؒ کا واقعہ یاد آیا جب حضرت دارالعلوم دیوبند میں پڑھنے کے لئے آئے ہیں تو حضرتؒ کے چار طریقے تھے۔ پہلا تو یہ تھا کہ انھوں نے اپنے لیے کچھ ساتھی منتخب کر لیے تھے اور ان سے معاہدہ کر لیا تھا کہ نمازِ عشا کے بعد نہ تکرار کریں گے نہ مطالعہ کریں گے۔ بلکہ فوراً سو جائیں گے۔ اور اخیر شب میں اُٹھ کر تہجد پڑھیں گے اور اس کے بعد مطالعہ اور تکرار کریں گے۔ جو کام لوگ ابتدائی رات میں کرتے ہیں وہ ہم آخر رات میں کریں گے۔ چنانچہ ان کے سب ساتھی اس کے پابند ہو گئے۔ اور دوسرا معمول یہ تھا کہ منڈی میں جو دیوبند کا بازار ہے وہاں چوراہے پر تحصیل کے سامنے عصر کی نماز کے بعد روزانہ وعظ فرماتے تھے۔ قرآن شریف کی تلاوت فرماتے، اور ہر روز پابندی سے وعظ فرماتے۔ ایک آدمی آجائے جب بھی دس آدمی آجائیں جب بھی۔ بیس آدمی آجائیں جب بھی۔ سردی پڑ رہی ہو یا گرمی، بلا ناغہ ہر جمعرات کو وعظ بیان کرنے کا معمول تھا۔ اسی لیے حضرتؒ نے طالب علمی

ہی کے زمانے میں پورے قرآن شریف کا وعظ وہاں سُنایا۔ اور تیسرا معمول یہ تھا کہ جمعہ کا دن منتخب کر رکھا تھا اساتذہ کی خدمت میں حاضری کے لیے۔ مولانا محمد یعقوبؒ صاحبؒ کی خدمت میں ایک گھنٹہ اور مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ کی خدمت میں ایک گھنٹہ، اور مولانا منفعت علی صاحبؒ کی خدمت میں ایک گھنٹہ۔ غرض جتنے اساتذہ تھے جمعہ سے پہلے ایک ایک گھنٹہ ان کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ اور یہ اپنے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر فرماتے کہ میرے متعلق جو خدمت ہو میں حاضر ہوں۔

کبھی مولانا منفعت علی صاحبؒ فرماتے کہ برسات آگئی ہے۔ چھت پر مٹی پڑے گی ذرا مٹی ڈلوا دو۔ یہ سنتے ہی حضرت مولانا جاتے اور گدھوں پر مٹی لاد کر لاتے اور چھتوں پر ڈال کر پیٹتے۔ جب یہ کام انجام پا چکتا تو لکڑیوں کے لئے ٹال پر جاتے وہاں سے لکڑیاں لاد کر لاتے۔ طلباء کو بلاتے اور لکڑیاں لاکر ان کا چٹہ لگا دیا کرتے جس اُستاد نے جو کام بتا دیا وہ کام کر دیا۔ اور اگر کوئی علمی بات معلوم کرنی ہوتی یا کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو پوچھ لیا کرتے۔ یہ مولانا کا تیسرا معمول تھا اور چوتھا... معمول یہ تھا کہ حجرے میں ایک گھڑا رکھ چھوڑا تھا۔ جو خط آتا بغیر پڑھے ہوئے اسی گھڑے میں ڈال دیا کرتے۔ ایک سال میں جو دس بیس خط جمع ہو جاتے ان کو سالانہ امتحان سے فارغ ہو کر پڑھتے۔ کسی میں یہ لکھا ہوتا کہ فلاں کے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے اور کسی میں لکھا ہوتا کہ فلاں کا انتقال ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر تھانہ بھون پہنچکر کسی کے یہاں تعزیت کے لئے حاضر ہوتے اور کسی کے یہاں... تہنیت اور مبارک بادی کے لیئے۔ سب لوگ کہتے کہ بھائی ہم نے خط لکھا تھا مگر تم نے جواب بھی نہیں دیا تو حضرتؒ فرماتے کہ میں پڑھنے گیا تھا، کتابیں پڑھنا میرا موضوع تھا ان کو پڑھنا خطوط پڑھنا میرا موضوع نہیں تھا۔ میں خطوط کو گھڑے

میں ڈال دیتا تھا۔ امتحان سے فارغ ہو کر ان کو پڑھا، اب میں خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ یہ چار معمول تھے۔ اس سے شغف معلوم ہوتا ہے علم کا، ان کو کتابوں کے پڑھنے سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ عزیز واقرباء کے خطوط کو پڑھیں۔

مولانا مملوک علیؒ کا واقعہ

اکابر نے جو علم حاصل کیا تھا وہ اسی حُسنِ نیت اور اخلاص کی برکت تھی۔ مولانا مملوک علی صاحبؒ جو استاذ الکل تھے۔ ان بزرگوں کے یعنی حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے۔ وہ ایک دن فرمانے لگے کہ تم علم کیا حاصل کروگے۔ علم ہم نے حاصل کیا ہے اور جو ہم نے محنتیں اٹھائی ہیں تم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ فرمایا کہ ہمارے پاس کوئی غذا کا سامان نہیں تھا اور نہ کوئی کھانا ہی مقرر تھا، اور نہ کوئی وظیفہ تھا ہمارے پاس کھانے کا ڈھنگ یہ تھا کہ شام کو سبزی منڈی جاتے تھے۔ جب سبزی فروش سبزیاں بیچ کر چلے جاتے تھے تو وہاں سبزیوں کے ڈنٹھے اور پتے پڑے رہتے تھے ان سب کو جمع کر کے دھوتے اور پاک کرتے اور اس میں نمک ڈالتے اور اُبال کر کھا لیا کرتے تھے۔ یہ کھانا ہوتا تھا۔ بعض دفعہ روٹی بھی نہیں ہوتی تھی پتّے ہی کھا کر گذر کیا کرتے تھے۔ اور فرمایا کہ مطالعہ کی صورت یہ تھی کہ مدرسہ میں کوئی روشنی کا بندوبست نہیں تھا ہم چلے جاتے تھے بازار میں بنیوں کی دکان پہ۔ ان تختوں کے بیچ میں چراغ کی روشنی کی چھینٹ پڑ جاتی تھی۔ بنیوں کا قاعدہ یہ تھا کہ رات بھر دوکان میں چراغ جلاتے تھے وہ اسے بدفالی سمجھتے تھے کہ رات کو دوکان میں اندھیرا رہے، وہ دکان کے اندر شام کو چراغ جلا کر چھوڑ دیتے۔ مولانا مملوک علی صاحبؒ نے فرمایا کہ ہم دکانوں کے تختوں پر بیٹھ کر جو روشنی دکان سے نکلتی تھی اس میں کتاب دیکھا کرتے تھے یہ ہمارے مطالعہ کا طریقہ تھا۔ اس پہ فرمایا کہ تم کیا علم حاصل کروگے کیا محنتیں

اٹھاؤ گے۔ محنتیں تو ہم نے اٹھائی ہیں۔

بہر حال اس سے اخلاص اور علم کی راہ میں فنائیت معلوم ہوتی ہے۔

مولانا مملوک علیؒ کا دوسرا واقعہ

اور مولانا ہی کا واقعہ ہے کہ ایک رات دوکان کے تختے پر بیٹھ کر کتاب دیکھ رہے تھے اتفاق سے کسی شہزادہ کی سواری نکلی، ہاتھی پر شہزادہ سوار اور گھوڑے کے نقیب اور چوبدار صدا لگاتے ہوئے نکل رہے تھے۔ مگر مولانا کافیہ کے مطالعہ میں اتنے منہمک تھے کہ ان کو یہ خبر نہیں تھی کہ کس کا جلوس آرہا ہے یہ ٹانگیں زمین پر رکھے ہوئے کتاب دیکھ رہے تھے۔ نقیبوں نے آوازیں دیں مگر ان کے کان میں کچھ آواز نہیں آئی۔ یہ اپنی کتاب دیکھتے رہے شہزادے کی سواری قریب آئی تو اس کو غصہ آیا اور چوبدار کو حکم دیا کہ اس کو دھکا دو۔ اب ان کو پتہ چلا کہ کوئی سواری نکل رہی ہے۔

مولانا کو کافیہ پر اتنا اعتماد تھا کہ فوراً فرمایا کہ بڑا بے چارہ شہزادہ بنا پھرتا ہے اگر کافیہ کا ایک مسئلہ پوچھ لوں تو میاں سے جواب نہ بن پڑے گا۔ یہ مولانا کو اعتماد اور ناز تھا۔ اپنی کافیہ پر۔ "کافیہ کافی ست باقی دردِ سر" یہ مولانا کی ہی مثل ہوگئی ان کو اس قدر علمی انہماک تھا کہ کتاب دیکھنے میں نہ بادشاہ کی خبر، نہ بادشاہ گیری کی خبر، اس محنت سے گویا علوم حاصل ہوئے۔ یہ صدق و اخلاص ہی کی برکت تھی۔

حضرت نانوتویؒ کا واقعہ

اور یہی شان حضرت نانوتویؒ کی تھی۔ وہاں رہنے کے لئے کوئی مکان نہیں تھا۔ مطبع مجتبائی میں ایک کوٹھری تھی اس میں کاغذ بھرے رہتے تھے انہوں نے کچھ اپنے تعلق کی وجہ سے اجازت دیدی تھی کہ اس کوٹھری میں آپ رہیں اس کوٹھری میں مولانا

رہتے تھے۔ تالا اور کنجی بھی پاس نہیں۔ سامان ہی کیا تھا کہ تالا اور کنجی رکھتے۔ طریقہ یہ تھا کہ کواڑ کو چولے سے اُتارا اور اندر داخل ہو گئے اور جب باہر گئے تو کواڑ کو چولے سے برابر کر کے چلے گئے۔ ہفتوں گذر جاتے تھے مگر حجامت تک کی خبر نہ ہوتی۔ جیسے مولانا یعقوب صاحبؒ نے لکھا ہے کہ چہرہ پر جذب وجلال کا اتنا اثر تھا کہ آنکھ ملانی مشکل ہوتی تھی، بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہوتے تھے کتاب دیکھنے اور مطالعہ کرنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اور ان کا بھی یہی طریقہ تھا کہ ایک ڈیڑھ دن کی روٹیاں جمع ہو گئیں ان کو رکھ لیا وہ سوکھ کر ٹکڑے ہو جاتیں۔ جب بھوک ستاتی تو اُنھیں پانی میں تر کر کے اور نمک ملا کر کھا لیا کرتے یہ غذا تھی نہ کوئی کھانا مقرر تھا، نہ کوئی وظیفہ۔

بہر حال یہی اکابر کا اخلاص تھا۔ اور ان کی حسن نیت تھی جو اُن کو ملا۔ اسی وجہ سے ان کو علم آیا اور دنیا نے ان کو بحر العلوم کا لقب دیا۔ اور یہ کیفیت بغیر ذکر اور بسم اللہ کے پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اسکی قدرتی معنیٰ یہ ہیں کہ ان کا ہر کام اللہ کے نام سے آغاز ہوتا تھا۔ اور اللہ ہی کے نام پر اختتام ہوتا تھا۔

بسم اللہ یہ علامت ہے حسن نیت کی اور یہ حسن نیت ہی کا سودا تھا جو اُن کو ملتا تھا جیسا کہ صحیح حدیث میں بھی ہے کہ انما الاعمال بالنیات کہ اعمال کا تعلق نیت سے ہے جیسی نیت ہو گی ویسا ہی عمل ہو گا۔ اور ویسا ہی اس پر ثمرہ مرتب ہو گا۔ یہ سارے اکابرین نیت خالص رکھتے تھے اور اس کی علامت یہ ہے کہ ذکر اللہ ان کے اندر موجود تھا۔ بسم اللہ کہنا اس کا ایک عنوان تھا۔ كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَمْ يُبدأ بذكر الله تعالیٰ فهو اقطع۔ ان کے قلوب میں ذکر اللہ رچا ہوا تھا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ کا واقعہ

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ کا ایک واقعہ

میں نے مولوی محمود احمد صاحبؒ سے جو میرے خسر ہوتے تھے، سُنا جب وُہ دارالعلوم میں پڑھتے تھے تو ان کا قیام مفتی صاحبؒ کی مسجد میں تھا جو چھوٹی مسجد کہلاتی ہے وہ مسجد کے حجرہ میں رہا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مفتی صاحبؒ دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے حجرہ میں آکر قیلولہ کیا کرتے تھے۔ ظہر سے پہلے میں نے دیکھا کہ وہ لیٹتے ہیں تو گھٹنے پیٹ میں دے کر سکڑ کر لیٹتے ہیں۔ کبھی پَیر پھیلا کر سوتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا۔ میں سمجھا کہ یہ اتفاقی ہو گا۔ لیکن دیکھا کہ معمول ہی ہے روزانہ اسی طرح سونے کا۔ تو ایک دن میں نے جرأت کر کے عرض کیا کہ حضرت آپ پَیر پھیلا کر کبھی نہیں سوتے۔ فرمایا کہ بھائی پَیر پھیلا کر سونے کی جگہ قبر ہے۔ یہ دنیا نہیں ہے اس سے اندازہ کیا جائے کہ ہر وقت ان کے قلوب میں آخرت کس طرح سمائی ہوئی تھی جو درحقیقت اسی قلب کے ذکر کی برکت تھی۔ اور اسی کا اثر یہ تھا حضرت مفتی ہی صاحبؒ کا واقعہ ہے کہ ایک دن عشاء کے بعد لیٹے اور لیٹ کر یہ خیال آیا کہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ کہ انسان کو وہی چیز ملے گی جو اس کی سعی اور اس کا عمل اور اس کی جدوجہد ہے انھیں کے ثمرات ملیں گے اور ادھر احادیث میں ہے کہ ایصال ثواب کیا جائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کا عمل دوسرے کے کام آتا ہے اور آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کچھ نہیں ملے گا بجز اس کے سعی کے تو بظاہر آیت اور روایت میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے تھے کہ میں نے کتابیں دیکھیں اور کچھ علماء سے رجوع کیا مگر تشفی نہیں ہوئی۔

ایک دن مکان میں سونے کے لئے لیٹے تو غلبہ کے ساتھ یہ خیال جم گیا کہ میرے قلب کے اندر آیت اور روایت کا تعارض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ آیت پر میرا پورا ایمان ہے نہ حدیث پر اگر اس حالت میں موت

آگئی اور اگر ایک آیت اور ایک روایت کے بارے میں شک لے کر گیا تو میرا انجام کیا ہوگا۔ اس جذبہ کا آنا تھا کہ چارپائی سے اُٹھ کر روانہ ہو گئے یہاں تک کہ گھر والوں کو بھی اطلاع نہیں کی۔ سیدھے گنگوہ کا راستہ اختیار کیا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے اس مسئلہ کو حل کروں گا۔ پیدل چلنے کے عادی نہیں تھے لیکن بائیس۲۲ کوس کا راستہ رات ہی رات میں طے کیا، صبح کی نماز کے لیے حضرت گنگوہیؒ وضو فرما رہے تھے۔ انہوں نے پہنچ کر سلام عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا کون؟ کہا عزیز الرحمٰن! فرمایا کب آئے کہا ابھی پہنچا ہوں فرمایا رات بھر سفر کیا کہا حضرت رات بھر سفر کیا۔ فرمایا کہ ایسی کیا ضرورت پیش آئی کہ ساری رات پیدل سفر کیا۔ مفتی صاحب نے کہا کہ حضرت! قصہ یہ پیش آیا کہ میرے دل میں اس آیت اور اس روایت میں تعارض ہے اور وہ حل ہوا نہیں تو میرے ذہن میں یہ خطرہ گذرا کہ اس حالت میں اگر موت آگئی کہ ایک قرآنی آیت اور ایک حدیث کے بارے میں میرے قلب کے اندر ایک قسم کا ریب اور شک ہے تو میرے ایمان کا کیا حال ہوگا۔ کھڑے کھڑے حضرتؒ نے دو جملے فرمائے کہ ... لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى میں جو سعی ہے اس سے سعی ایمانی مراد ہے کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا مومن بن جائے اور نجات اسے دے دی جائے اس میں عمل کا ذکر نہیں ہے یہ سعی ایمانی ہے جو سعیٔ قلبی ہے اور حدیث میں جو حکم ہے وہ بدن کا عمل ہے نفل پڑھ کر خیرات کرو تلاوت کرو ثواب پہنچادو تو وہاں سعی ایمانی مراد ہے اور یہاں سعی عملی مراد ہے۔ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

حضرت مفتی صاحب یہ کہتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پردہ ہٹ گیا اور علم کا دروازہ میرے لئے کھل گیا۔ تو اس پر میں نے عرض کیا کہ ایک چھوٹی سی بات تھی

لیکن کتنا شدید اہتمام کیا کہ رات بھر پیدل چلے اور کمزوری کی حالت میں سفر کر کے یہ مسئلہ حل کیا۔ آخرت ہر وقت پیش نظر تھی۔ تب ہی تو اہتمام فرمایا اور یہ ناممکن کہ جب تک ذکر اللہ قلب کے اندر جاگزیں نہ ہو اور یہ کیفیت پیدا ہو۔ ورنہ علماء اور طلباء کو سینکڑوں شبہات پیش آتے ہیں۔ اور وہ ایسا اہتمام نہیں کرتے مگر ان کے یہاں یہ نہیں تھا۔ بلکہ جب بھی کسی قسم کا شبہ ہوتا فوراً اکابرین کی خدمت میں حاضر ہو کر حل کرتے۔

بہرحال ذکر اللہ یا بسم اللہ سے ابتداء کرنا اور اس کی لگن دل میں ہونا یہ اس کے بغیر نہیں ہوگا کہ ذکر قلب کے اوپر چھایا ہوا نہ ہو اور بسم اللہ کہنا اس کی علامت ہے اس لیے فرمایا گیا کہ کُلُّ اَمْرٍ ذِی بَالٍ لم یبدأ ببسم اللہ تعالیٰ ھُوَ اَقطع تو کوئی امر مہم اگر بغیر بسم اللہ یا ذکر اللہ اور اسم حق کے شروع کیا گیا تو وہ مقطوع البرکت بن جائے گا۔ اس میں نورانیت پیدا نہیں ہوگی۔ دیگر ثمرات کا مرتب ہونا وہ الگ بات ہے۔ جیسے وضوء اس کا مادہ وضاء ہے اس کے معنیٰ روشنی کے ہیں۔ یہ روشنی حاصل نہ ہوگی۔ جب تک نیت نہ کرو اور بسم اللہ سے آغاز نہ کرو ورنہ مطلقاً تطہیر بدن ہو جائے گی۔ مگر جو نورانیت کا وعدہ ہے وہ پیدا نہ ہوگی جب تک کہ ذکر اللہ نہ ہو۔ یہ چند باتیں ہیں جو میں نے بسم اللہ کے بارے میں عرض کی۔ تو حدیث کی مراد مقطوع البرکت ہے مقطوع الثمرہ نہیں ہے۔

مجلس نمبر (۲)

دین کی بنیاد نقل صحیح پر ہے

سوال :- ایک مجلس میں حضرت حکیم الاسلام مدظلہ نے فرمایا تھا کہ دین کی بنیاد نقل صحیح پر ہے - چونکہ یہ مجلس نقل نہیں کی گئی تھی - اس لئے حضرت سے گذارش کی گئی کہ یہ مضمون دوبارہ بیان فرما دیں تاکہ نقل کر لیا جاوے -

۲۵ رشعبان المعظم ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۳ ر ستمبر ۱۹۷۴ء مجلس میں شریعت اسلامیہ کے ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے پاک ہونے پر عقلی اور نقلی دلائل مختلف پہلو سے پیش کئے گئے - اس مجلس کے مطالعہ سے بہت سے شکوک و شبہات ختم ہو جاتے ہیں اس لیے وہ نقل کی جا رہی ہے -

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی نے فرمایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ دین نقلی ہے عقلی نہیں - اگر دین محض عقلی اور اختراعی ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کے دنیا میں تشریف لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی - ہر شخص اپنی عقل سے اور اپنے فہم سے ایک دین بنا لیا کرتا اور اس سے اللہ تک پہنچ جایا کرتا - لیکن اسمیں اصل یہ ہے کہ عقل کا ایک دائرہ ہے وہ اسی دائرے میں چل سکتی ہے - وہ محسوسات ہیں - عقل جتنا بھی کام کریگی - وہ انھیں کے دائرے میں رہ کر کر سکتی ہے - وہ محسوسات ہیں - جو چیزیں اس کے سامنے آجائیں گی - یا تو عقل ان جزئیات کو سمجھ لے گی یا چند جزئیات کو جمع کر کے ایک کلیہ بنا لے گی، کوئی اصول اخذ کر لے گی - یا کوئی اصول سامنے آئے تو اس سے جزئیات کا.... استنباط کر لے گی - مگر یہ تمام چیزیں ہوں گی محسوسات ہی کے دائرہ میں -

یہی اس کی حد ہے۔ اسی کے اندر وہ کام کر سکتی ہے اور بالکل اس کی نظیر یہ ہے
کہ حق تعالیٰ نے انسان میں حواسِ خمسہ رکھے ہیں۔ یعنی چھونے کی قوت، دیکھنے
کی قوت، چکھنے کی قوت، سننے کی قوت اور سونگھنے کی قوت۔ یہ حواسِ خمسہ ہیں
تو ہر حاسّے کا ایک دائرہ ہے۔ عقل اسی میں کام کر سکے گی مثلاً آنکھ کا کام یہ ہے
کہ وہ صورتیں اور رنگ وغیرہ دیکھے اگر آنکھ یہ چاہے کہ میں آوازیں سُن لوں تو وہ
اس کے دائرہ کی چیز نہیں۔ کان کا کام یہ ہے کہ وہ آوازوں کا ادراک کرے
اور ان کا علم حاصل کرے۔ وہ صورتیں دیکھنا چاہے تو یہ کان کے بس کی بات
نہیں ہے اسی طرح سے زبان۔ اللہ نے چکھنے کے لئے دی ہے تو وہ ذائقہ
چکھے گی۔ یعنی کھٹا میٹھا وغیرہ اس کا آوازوں اور صورتوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا
عام بشر کے بدن میں احساس کی طاقت ہے۔ وہ چھو کر کسی چیز کی
سختی، نرمی محسوس کر لیتا ہے۔ اس کا آوازوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور
یہ اللہ کی عجیب حکیمانہ قدرت ہے کہ تمام حواس چہرے ہی میں جمع ہیں
مثلاً آنکھ ہے کان ہے ناک ہے زبان ہے یہ سب چہرے میں جمع ہیں اور
ان میں زیادہ فصل بھی نہیں ہے آنکھ اور کان میں دیکھا جائے تو دو انچ کا فصل
ہے۔ اسی طرح آنکھ کو اور زبان کو دیکھو تو کوئی زیادہ لمبا فاصلہ نہیں ہے
لیکن ہر ایک کے درمیان ایسی سدِ سکندری حائل ہے کہ ایک دوسرے
کے دائرہ میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ آنکھ چاہے میں آوازوں کو سُن لوں یا کان
ناک کی جگہ آجائے یہ ناممکن ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر حاسّے کا ایک دائرہ ہے
وہ اسی دائرہ میں اپنا کام کرے گا دوسرے دائرہ میں کام لینا چاہے تو وہ
عاجز اور بے کار ہوگا اور کام لینے والا احمق کہلائے گا۔

اسی طرح عقل کا ایک دائرہ ہے وہ جزئیات کا ادراک کر کے اس میں سے

کلیات نکال لیتی ہے یا کلیات میں سے جزئیات کا استنباط کر لیتی ہے تو وہ پانچوں حواس اس دائرہ میں بے کار ہیں۔ وہ عقل ہی کر سکتی ہے یہ کام نہ کان کا ہے نہ آنکھ کا نہ زبان کا نہ ناک کا۔ بلکہ ان کا دائرہ الگ الگ ہے اور سب کے دائرے محدود ہیں محسوسات کے ساتھ۔ اب آگے مغیبات کا قصہ ہے وہ غیبی امور ہیں ان کا ادراک ان چھ کی بس کی نہیں ہے نہ اُن کو حواسِ خمسہ کر سکتے ہیں۔ نہ عقل کر سکتی ہے اس لئے کہ اِن کا دائرہ محسوسات ہی ہیں یہ ان سے باہر کام نہیں کر سکتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سارے حواس غیبی اُمور کے لیے بیکار ہیں اور ان کے سامنے عقل بھی کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تو غیبی امور کے لئے کوئی اور ذریعہ ہونا چاہیئے۔ وہ ذریعہ کیا ہے وہ وحی خداوندی ہے یہ ذریعہ اصل میں قلب اور وجدان ہے اس پر وحی کے ذریعہ علم کا ترشح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلب کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ غیبی امور کا بھی ادراک کر لیتا ہے۔ حق تعالیٰ نے قلب کو ایک ایسا جامع لطیفہ بنایا ہے کہ اس کا تعلق عالم شاہد سے بھی ہے اور عالم غائب سے بھی۔ یہ جتنے حواس ہیں یہ سب اپنی معلومات اور اپنی کار گزاریاں قلب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اور قلب ادراک کر لیتا ہے اور پھر ان سے بالاتر ہو کر غیبی امور کا ادراک کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے کیا فرمایا اس کے اصول کیا ہیں اور ان کے قوانین کیا ہیں تو گویا قلب کے دو دریچے ہیں ایک دریچہ کھلا ہوا ہے عالمِ شاہد کی طرف، وہ محسوسات کا ادراک کرتا ہے اور ایک دریچہ کھلا ہوا ہے عالمِ غیب کی طرف وہ مغیبات کا ادراک کرتا ہے تو جامع ترین لطیفہ انسان میں قلب کا ہے جو غیب اور شاہد دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔

اسی لیے امام رفعیؒ نے لکھا ہے کہ اقلیم بدن کے اندر قلب بادشاہ کے مانند ہے اور جتنے اعضاء اور جتنی قوتیں ہیں وہ سب ان کے خدام ہیں وہ اپنی اپنی کارگزاری اس کے آگے لاکر پیش کر دیتے ہیں۔ اور وہ علم حاصل کر لیتا ہے اور اوپر سے مغیبات کا علم بھی حاصل کرتا ہے۔ ان علوم کے تحت وہ زندگی گذارتا ہے اور اپنی اقلیم بدن کی حکومت چلاتا ہے اگر محسوسات اس کے سامنے اپنا علم نہ رکھیں اور وہ ادراک نہ کرے تو دنیا کی زندگی تباہ ہو جائے۔ جب قلب کے سامنے دیکھنے کی کوئی چیز ہی نہیں تو جہاں چاہے گا گھس جائے گا۔ یا کوئی... چکھنے کی چیز ہی نہیں تو جو چاہے گا کھالے گا۔ خواہ زہر ہی کیوں نہ ہو یہ ادراک ہے جو اقلیم بدن کی حفاظت کرتا ہے اور اقلیم بدن کا تمام نظام قلب کے تحت ہے اور اسی پر اس کا مدار ہے پھر علوم غیبیہ کا درجہ ہے جو روحانی قوتوں کو جذب کرتا ہے اب ظاہر بات ہے کہ روحانی قوتیں یا علومِ غیب جب وہ عقل سے سمجھنے یا حواس ادراک کرنے میں نہیں آتے تو ان کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ ہونا چاہیئے وہ ذریعہ وحی الٰہی ہے اسی کے ذریعہ ان کا ادراک ہوتا ہے اور وحی منتقل ہو کر آتی ہے آسمان سے عالمِ شاہد کی طرف اس لیے دین کی بنیاد نقل پر ہو گئی عقل پر نہیں۔ جب وحی عالمِ غیب سے عالمِ شاہد کی طرف منتقل ہو کر آئی ہے تو اس کے لئے سند صحیح ہونی چاہیئے کہ واقعی یہ اللہ کا کلام ہے تو اس کے لئے نقل ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ استنباط بھی ہو تاکہ کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے اس لیے اس کو سمجھنا چاہیئے۔

حقیقت میں حق تعالیٰ شانہٗ تو منبع ہیں علوم کے۔ اُنہوں نے علم کو القا فرمایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام پر اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس کو القا فرمایا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر، تو ابتدائی سند جو دین کی ہے

اِس میں گویا دو واسطے ہیں یعنی اللہ سے دین آنے میں جبرئیل امین اور محمد الامین صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر، تو ظاہر ہے کہ جبرئیل امین ان کا لقب ہی امین ہے اس لئے نقل روایت میں کوئی کمی ممکن نہیں۔ اول فرشتہ جو معصوم اور امانت کے لحاظ سے معروف ہیں۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کے اوصاف

اسی واسطے قرآن شریف میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں بحیثیت راوئ دین ہونے کے وہ وہی اوصاف ہیں جو تاریخ کے بنیادی اوصاف ہیں۔ گویا حق تعالیٰ شانہٗ نے دین کو محض جبرئیل علیہ السلام کی ذاتی عظمت کے دباؤ کی وجہ سے منوانا نہیں چاہا۔ بلکہ فنی قواعد سے ان کے اوصاف بیان کئے فرمایا کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ؕ یہ جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں ہے اول رسول کا لفظ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قاصد ہیں اور ظاہر بات ہے کہ کوئی بھی حکومت اپنا سفیر یا قاصد اسی کو بنا سکتی ہے جو حکومت کی پالیسیوں اور رازوں کا امین ہو اور پورا ہم آہنگ ہو اس کا۔ اگر ذرہ برابر بھی بغاوت یا نافرمانی کا کوئی شائبہ ہوگا تو حکومت اس کو اپنا سفیر قرار نہیں دے گی۔

حق تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو جب اپنا قاصد مقرر کیا اور رسول بنایا تو رسول کے لفظ سے خود ان کی امانت واضح ہے کہ اللہ نے ایسا ہی اپنا قاصد بنایا ہے جس کی امانت اور دیانت پر حق تعالیٰ شانہٗ کو پورا اعتماد ہے۔ اسی لیے رسول فرمایا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ کوئی یوں کہے کہ رسول تو ہیں مگر اخلاقی حالت درست نہیں۔ اس میں ممکن ہے کہ کچھ دغل فسل ہو جائے اس لیے رسول کے بعد ایک کلمہ اور بڑھایا کہ کریم یعنی کرامت اور بزرگی والا۔ جس کے معنیٰ یہ نہیں کہ محض قاصد ہیں۔ بلکہ ذاتی اوصاف بھی اس کے مقتضی تھے کہ ان کو قاصد بنایا جائے۔

کرامت ان میں ہے بزرگی ان میں ہے۔ رشد ان میں ہے تو رسول ہیں کریم بھی ہیں۔ لیکن دل کے کمزور ہیں ممکن ہے کسی کے دباؤ سے الفاظ وحی بدل دیتے یا اپنی جان یا آبرو کے خوف سے صحیح وحی کے پہنچانے میں کمی اور زیادتی کرتے ہوں اس کو دوسروں کے دباؤ سے ہر وقت خطرہ رہتا ہے لہٰذا ایسے قاصد قابلِ اعتماد نہیں۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھا دیا کہ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ذِیْ قُوَّۃٍ۔ بڑا طاقتور فرشتہ ہے۔

ان کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ ان کی ایک ہی ڈانٹ سے قومِ ثمود کے کلیجے پھٹ گئے۔ یہ طاقت ہے ان کی آواز میں۔

لوط علیہ السلام کی بستیاں حق تعالیٰ کے حکم سے ایک ہتھیلی پر اٹھا کر اوپر لے جا کر پٹک دی۔ جس کی طاقت کا یہ عالم ہو تو ممکن نہیں کہ کوئی قابو پالے یا کوئی دبا لے۔ اور وہ کسی کے دباؤ سے کچھ سے کچھ کہہ دے تو رسول کا لفظ بھی فرمایا، اور ذی قوۃ کا بھی۔ تاکہ ان کی صداقت میں شبہ نہ رہے لیکن اس پر بھی کوئی اشکال کر سکتا تھا کہ بے شک رسول بھی ہے، بزرگ کریم بھی ہے طاقتور بھی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ سننے میں غلطی کرتے ہوں لہٰذا ایسے قاصد کا کیا اعتبار ہے اس لیے ایک جملہ اور بڑھایا کہ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ عرش کے پاس ہی ان کا مقام ہے۔ کوئی دوری نہیں ہے۔ بلکہ حق تعالیٰ شانہ کے بالکل قریب ہیں۔

یہاں محدثین حضرات صحیح روایت کے لئے شرط لگاتے ہیں کہ سماع ہونا چاہیئے معیت ہونی چاہیئے۔ دور کی سنی سنائی راوی کی بات کا اعتبار نہیں تو اس لیے یہ جملہ بڑھا دیا۔ یعنی عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ وہ عرش والے کے پاس ہی مقیم ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ ان کا مقام ہے جہاں ساتوں آسمان ختم

ہوجاتے ہیں۔اور وہاں سے پورے عالمِ غیب کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں اس واسطے یہ جملہ بڑھا دیا۔ یعنی عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ کل چار اوصاف ہوگئے (۱) رسول بھی ہیں (۲) کریم بھی ہیں (۳) طاقتور بھی ہیں (۴) عرش والے کے پاس بھی ہیں۔ تو دُور سے سُنی سُنائی بات نہیں ہے کہ کچھ سے کچھ سُن لیں لیکن اس پر بھی یہ سوال ہوسکتا تھا کہ یہ سب باتیں صحیح ہیں۔ مگر اثر کچھ نہیں، ان کو کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ بعض آدمی باعزت ہوتے ہیں مگر اثر نہیں ہوتا۔ لوگ نہیں مانتے۔ اگر اثر نہ ہو تو روایت بے اثر ہوجائے گی۔ لوگ سُنیں گے مگر یہی کہیں گے ایسے بہتیرے کہنے والے کہتے ہیں کیا ضروری ہے کہ اسے مانا ہی جائے، اس واسطے ایک جملہ قرآن نے اور بڑھا دیا۔ مطاعٍ کہ وہ مطاع بھی ہیں کہ سب ان کی اطاعت میں لگے ہوئے ہیں۔

حتّٰی کہ وہ سیّد الملائکہ ہیں۔ تمام ملائکہ علیہم السلام کے سردار ہیں۔ اللہ نے ان کو سب کا راس رئیس مقرر فرمایا ہے۔ یہاں مُطاع کا لفظ بولا گیا۔ ظاہر ہے کہ سیّد اور مطاع وہی شخص ہوگا جس کی اطاعت میں لوگ سرگرم ہوں۔ اس کی چھوٹی بات کو بھی بڑی سمجھیں گے اور دل میں جگہ دیں گے کہ بڑے کی کہی ہوئی بات ہے۔

ایک کلمہ وہ ہے کہ ہم اور آپ کہیں تو کوئی اثر نہیں۔ اور وہی کلمہ اگر وزیرِ اعظم یا پریسیڈنٹ کی زبان سے نکلے تو ساری دنیا میں اس کا اثر لیا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جب تک شخصیت بااثر نہ ہو اس وقت کلام بھی بااثر نہیں ہوسکتا۔ کہ لوگ ماننے کے لیئے مجبور ہوجائیں۔

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے لفظ مطاع بڑھایا تاکہ ذاتی اوصاف کے ساتھ ساتھ ان کی حیثیت ظاہر ہوجائے لیکن ہوسکتا تھا کہ کوئی یوں کہے

کہ سب کچھ ہیں لیکن ذرا لاابالی ہیں۔ بعض ذمّہ داروں کے اندر ایک لاپرواہی ہوتی ہے۔ باوجود بزرگی کے وہ جوشِ جذبات میں جو کلام کرتے ہیں۔ اس میں فرق آجاتا ہے اس لیے یہاں ایک جملہ اور بڑھایا ثَمَّ اَمِیْن۔ امانت دار بھی ہیں، معلوم ہوا کہ کوئی لاابالی پن نہیں ہے۔ اور پورے طور پر امین ہیں اور امانت و دیانت کا پورا لحاظ و پاس ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ راوی جب بیچ میں ایسا ہو کہ رسول خداوندی بھی ہو اور کرامت و بزرگی والا بھی ہو، عرش والے کے مقیم بھی ہو اور مطاع اور سید الملائکہ بھی ہو اور اوپر سے ذاتی طور پر امانت و دیانت کا مجسمہ بھی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی روایت نہ مانی جائے۔

فنی طور پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی خلاف ورزی کی جائے بلکہ اس کی بات مانی جائے گی۔ اس لیے ایسا ہی راوی مقرر کیا گیا ہے اب اس کے بعد میں انھوں نے روایت لاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی۔ اور حضورؐ کے سامنے اس طرح پیش نہیں کی کہ محض سُنا دیا ہو، کیونکہ احتمال تھا کہ سُننے میں غلطی ہو جائے۔ سماعت کے اندر کوئی وقتی فرق آجائے بلکہ وہ قلب جو ساری شعوری، ادراکی اور علمی قوتوں کا مخزن ہے وہ سُنتا بھی ہے دیکھتا بھی ہے، سمجھتا بھی ہے۔ اس قلب کے اندر اس کلام خداوندی کو اُتارا گیا۔ جہاں نہ چور جا سکے، نہ ڈاکو جا سکے نہ کوئی خلط ملط کر سکے اور فرمایا کہ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ یعنی بے شک کلام پاک رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جس کو حضرت جبرئیلؑ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اتارا ہے تاکہ کھلی ہوئی عربی زبان میں آپ لوگوں کو ڈرا سکیں۔

یہ اللہ کا کلام ہے اس کو لے کر نازل ہوئے جبریل امین اور لاکر اتارا۔ سیدالبشر کے قلب پر تو راوئ اوّل حضرت جبرئیل امین ہیں اور راوئ ثانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ دونوں راوی نقل روایت کی صحت پر پورے طور پر اترتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف

جہاں حضرت جبرئیل امین کے اوصاف بیان فرمائے گئے۔ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بھی بیان کئے گئے۔ چنانچہ آپ صلعم کے متعلق فرمایا گیا وَمَا.... صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ جبرئیل علیہ السلام جیسا فرشتہ کلامِ خداوندی کو لے کر آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا۔ کوئی مجنون تھوڑے ہی ہیں۔ ان کی عقل تو سارے انبیاء علیہم السلام اور ساری اُمت کی عقلوں سے مجموعی طور پر زیادہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب خاتم النبیین اور سید البشر ہیں تو سارے عالم کی عقلیں ایک طرف اور آپ کی عقلِ صافی کو ایک طرف رکھو تو پھر بھی عقل میں بڑھے ہوئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ علماء نے اور اربابِ سیرت نے جہاں آپ کی نبوت کے کمالات کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ذاتی طور پر آپ کی عقلِ مبارک کا بھی ذکر کیا ہے.... سینکڑوں فیصلے ایسے ہیں جو آپ صلعم نے وحی نازل ہونے سے پہلے کئے ہیں۔ اور وہ ایسے اٹل فیصلے ہیں کہ بڑے بڑے دانش منداور بڑے بڑے دانشور اس فیصلے کے آگے گردن جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ اس قسم کے بیسیوں فیصلے آپ کے نقل کئے گئے ہیں۔ اس لئے یہ جملہ فرمایا وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ کہ جن کے قلب پر یہ کلام آیا ہے وہ معاذ اللہ دیوانے تھوڑے ہی ہیں کہ وہ نہ سمجھنے کی کوشش کریں اور نہ سمجھیں۔

اگر کوئی یُوں سوال کرے کہ عقل مند کیوں نہیں کہا، جنون کی نفی کی۔ اگر عقل

کا اثبات کرتے اور آپ کو دانشمند ثابت کرتے تو کیا حرج تھا۔ جواب یہ ہے کہ... عقل مند اس لیے نہیں کہا گیا کہ کہیں فلسفی ہونے کا شبہ نہ ہو جائے۔ دین کے اندر عقل کا رگذار نہیں ہوتی۔ بلکہ نقل محض کارگذار ہوتی ہے۔ اس لئے عقل کے اثبات کے بجائے جنون کی نفی کی۔ اور یہ ایک انتہائی اعلیٰ مرتبہ ہے کہ کسی کے متعلق کہا جائے بھائی وہ کوئی مجنون تھوڑے ہی ہیں۔ باقی عقل تو مانی ہوئی ہے اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی یہ کافی ہے۔ کہ جنون کی نفی کردی جائے

اب آگے یہ سوال رہ جاتا تھا کہ بے شک آپ دانشمند بھی ہیں آپؐ میں عقل کامل بھی ہے۔ اور قلب صالح بھی ہے لیکن کچھ راوی کی روایت یا سماع ثابت نہیں۔ ممکن ہے کسی نے غیبی آواز لگادی ہو اور آپؐ کے کان میں پڑگئی ہو۔ آپ سے سماع ثابت نہیں یا رویت یعنی دیکھنا ثابت نہیں۔ اور روایت میں سب سے بڑی چیز دیکھنا ہی ہے اسی پہ مدار ہوتا ہے روایت کا۔

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک جملہ اور بڑھایا کہ...
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ۝ یعنی انھوں نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا بھی ہے یہ نہیں کہ محض غیب سے اعتماد کر لیا ہے یا محض عقیدے سے سمجھ لیا ہے الافق المبین یعنی جو تمام آسمانوں کا کنارا ہے۔ اس میں خود جبرئیل کو آپ نے دیکھا ہے۔ جیسا حدیث شریف میں ہے کہ دو مرتبہ آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اصلی صورت میں دیکھا ایک دفعہ جب پہلی وحی آئی تو اس وقت دیکھا۔ اور ایک دفعہ شب معراج میں دیکھا جو ان کی اصلی ہیئت تھی اور وہ یہ تھی کہ مشرق سے لیکر مغرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک جتنی فضا تھی سب ان کے بدن سے گھری ہوئی تھی۔ آپ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مشرق میں ایک کندھا اور مغرب میں ایک کندھا۔ جنوب میں سینہ اور شمال میں پشت، اور آسمان سے ملا

ہوا سر اور زمین پہ پیر، پوری فضا بھری ہوئی تھی اور لباس سبز تھا اور تاج پہنے ہوئے تھے جس سے شعائیں پھوٹ رہی تھیں اور چہرہ آفتاب سے بھی زیادہ روشن تھا آپ کے چہرہ سے شعائیں نکل رہی تھیں۔ چنانچہ آپ پہلی دفعہ دیکھ کر مرعوب اور دہشت زدہ ہو گئے اور کپکپی طاری ہو گئی۔

آپ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے تو فرمایا کہ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ مجھے کمبل اڑھاؤ اِنِّیْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ، مجھے اب ڈر ہو گیا ہے کہ شاید اب زندہ نہ رہوں تو اس وقت اصلی صورت میں آپ نے دیکھا اس لیئے فرمایا کہ:۔
---- وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ؕ تو جہاں جبرئیل علیہ السلام کے اوصاف بیان فرمائے گئے، جو بحیثیت راوی کے ضروری ہیں تو وہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی تین اوصاف بیان فرمائے گئے۔

ایک تو وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ کہ یہ تمہارے ساتھی معاذ اللہ کوئی دیوانے تھوڑے ہی ہیں کہ کوئی چیز انہوں نے سُن لی اور کہہ دی اور ایسے موقع پہ گویا نفی جنون ہی کی کیا کرتے ہیں۔ عقل ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ اپنی جگہ ثابت شدہ ہے۔ اب جب کمال دانائی کمالِ عقل اور کمالِ فراست ہے تو آگے سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جس راوی سے سُنا اس راوی کو دیکھا بھی ہے کیا اسکے پاس بھی گئے ہیں یا دُور ہی دُور کی بات ہے۔ تو آگے فرمایا وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ؕ جبرئیل علیہ السلام کو اُنہوں نے افق مبین میں خود دیکھا ہے، تو گویا سماع اور روایت دونوں ثابت ہوئیں۔ تیسری بات یہ تھی کہ سُن بھی لیا۔ دیکھ بھی لیا۔ رویت بھی آگئی۔ لیکن دوسروں کو بتلانے کو جی نہیں چاہتا۔

اکثر اہلِ کمال اس میں بخیل دیکھے گئے ہیں جو چیز کمال کی ہوتی ہے اُسے

دوسرے کو نہیں بتاتے کہ وہ چیز ہم سے جاتی رہے گی۔ اس لیے اہلِ کمال اس سلسلے میں بخیل ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے اہلِ کمال جب دُنیا سے رخصت ہوئے تو اپنا کمال بھی ساتھ لیتے گئے۔ دُنیا میں اس کا وجود ہی باقی نہیں رہا۔ ایسے کو کمال دینا نہ دینا برابر ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی کو لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لیئے دیدو۔ مگر وہ لے جاکر صندوق میں بند کر دے تو دینے سے فائدہ کیا ہوا۔ اس لئے راوی میں یہ شان ہونی چاہیئے کہ وہ جو کچھ سُنے اُسی کے مطابق دوسروں کو سُنائے۔

اس لیے قرآن میں ایک جُملہ اور بڑھایا گیا یعنی وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ یہ غیب کے بارے میں بخیل واقع نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کا ذاتی جذبہ ہے کہ دین دوسروں کو پہنچے اور دوسرے اس سے فائدہ اٹھائیں اور مستفید ہوں۔ تاکہ ان کو سعادتِ دنیا و آخرت حاصل ہو، تو پانچ اوصاف حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بیان کئے گئے جو راوئ اوّل ہیں اور تین جامع اوصاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کیے گئے جو راوئ ثانی ہیں۔

تو اب روایت کی شان یہ ہو گئی کہ مروی عنہ یعنی جس نے دین دیا وہ تو حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ وہاں سے دین چلا اس کے پہلے راوی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں وہ اسے لے کر چلے، اور دوسرے راوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس طرح سے آپ تک وہ روایت پہنچی پھر آپ نے اپنی اُمّت کو سُنایا

تبلیغ اور تبلیغ کا حکم:

اس لیے اسی قرآن نے آپ کو یہ بھی حکم دیا ہے کہ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ۔ یعنی جو چیز آپ کے رب کی طرف سے آپ تک پہنچائی گئی ہے وہ دوسروں کو پہنچا دیں تو آپ گویا مامور من اللہ ہیں کہ وہ چیز

دوسروں تک پہنچائیں جو آپ کو دی گئی ہے پھر آپ نے اُمّت کو مامور کیا اور فرمایا کہ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً ؕ میری طرف سے اس کی تبلیغ کرو، اگرچہ ایک چھوٹی ہی بات یا چھوٹی سی آیت یا چھوٹی سی روایت ہو، وہ دوسروں کو پہنچادو۔ اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں صراحۃً امر فرمایا کہ فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ یعنی جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ غائبین تک میرا پیغام پہنچا دیں۔ اُمت نے پھر اس کی رعایت بھی کی ایک ایک جُملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ قرآن کا دوسروں تک بڑی دینداری کے ساتھ پہنچایا۔ پھر محدثین اور علماء نے تواتر طبقہ کے ساتھ ایک ایک حدیث کو سندِ صحیح کے ساتھ پہنچایا اور پُوری امت میں وہ روایات اسناد کے ساتھ ہوتی آرہی ہیں جس سے قرآن کے نہ ایک شوشے میں فرق نہ زیر وزبر میں فرق نہ آیتوں میں فرق۔ وہ سب چیزیں محفوظ ہیں۔ تو ظاہر بات ہے کہ جب رُواۃ بالکل سچے اور صحیح، اور روایت بالکل حق اور اپنی جگہ قابلِ قبول کہ معقول بھی ہے اور منقول بھی۔ تو آگے کوئی وجہ نہیں کہ اسے قبول نہ کیا جائے۔

اسی بناء پر مَیں نے کہا تھا کہ دین کی بنیاد عقل پر نہیں ہے۔ بلکہ نقل و روایت پر ہے۔ دین ہوتا ہی ہے نقلی۔ پس اس میں یہ دیکھا جائے گا۔ کہ راوی بھی بیچ میں صحیح ہیں یا نہیں۔ تو رسول سے بڑھ کر کون سچا کہ فرشتے معصوم، اور اللہ صدق وسچائی کا مخزن اور منبع ہے۔

اسی لیے اللہ تعالےٰ کا نام امین بھی ہے تو امین سے روایت چلی امین تک آئی۔ اور آخر میں امین تک پہنچی لہٰذا جب تین امینوں کے درمیان میں یعنی اللہ تعالیٰ اور جبرئیل علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل ہو کر آئے تو اس کی صحت میں کیا شک ہوسکتا ہے اسی لئے دین کی روایت

مضبوط ہوگئی اور بنیاد اس کی نقل پر ہوگئی۔ عقل پر نہیں۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اب یہاں سوال صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ پھر عقل کیا کام کرے گی۔ بنیاد تو ٹھہر گئی نقل پر اور دی گئی انسان کو عقل، تو عقل بالکل بے کار ہوگئی۔

اس پر میں عرض کرتا ہوں کہ عقل میں دو درجے ہیں۔ ایک درجہ تو تقلید کا ہے۔ اور ایک درجہ تحقیق کا، دنیا کے جس عقل مند کی بات ہو۔ عقل مقلد نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی عقل ہے۔ ایک بات ارسطو نے کہی یا افلاطون نے یا ابن سینا نے تو ان کو ماننا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے کیونکہ ہمارے اندر بھی عقل ہے ممکن ہے کہ ہم یہ ثابت کردیں کہ ان کا کہا ہوا غلط ہے اور یہ صحیح ہے جو ہم ثابت کررہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ فلسفے کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ اگلا فلسفی پچھلے والے کو احمق بتاتا ہے کہ اس نے نہیں سمجھا۔ میں نے سمجھا ہے۔

فیثا غورث کا دعویٰ تھا کہ مثلاً سورج چکّر کھاتا ہے اور زمین ساکن ہے اور بعد کے فلسفی یہ ثابت کرتے ہیں کہ زمین حرکت کرتی ہے۔ سورج ساکن ہے تو یہ انھیں بے وقوف بتاتے ہیں تو اس طرح سے فلسفہ کے مختلف نظریات ہوتے اس میں ضروری نہیں ہے کہ ایک فلسفی دوسرے فلسفی کا مقلد ہی ہو، اور وہ ماننے پر مجبور ہو۔ لیکن نقل روایت اس میں امانت کی ضرورت ہے اگر اس میں عقل دخل دے گی۔ تو روایت میں فرق پڑجائے گی۔ تو وہاں عقل کو مقلد بننا پڑیگا۔ عقل کا کام صرف اتنا ہے کہ نقل و روایت صحیح سے جو دین کی باتیں ثابت ہوں ان کو سمجھے اور سمجھنے کے بعد وحی کے دائرے کے اندر رہ کر اس کے اندر سے اجتہاد اور استنباط کرے اور لطائف نکالے اور علوم پیدا کرے مگر مراد ربانی اللہ کی طرف سے متعین ہوگی۔ اور عقل اس مراد کے اندر رہ کر کاوش کرے گی۔ تو دین

تو دین میں سینکڑوں فنون پیدا ہوں گے جو عقلی بھی ہوں گے۔ اور نقلی بھی ہوں گے۔ تو جب تک عقل نہ ہو اس وقت تک اجتہاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اجتہاد کو رکھا ہی گیا ہے کہ وہ عقل سے ہو مگر وحی کے دائرے میں محدود ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین بنانے کے لئے عقل نہیں ہے۔ بلکہ بنے بنائے دین میں تفصیلات پیدا کرنے کے لئے ہے جیسا کہ قرآن کریم کے بارے میں احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ یعنی قیامت آجائے گی مگر کلام پاک کے عجائبات علمی ختم نہ ہوں گے۔ تو علمی عجائبات عقل ہی کی وجہ سے نکلیں گے۔ اس میں عقل اجتہاد کرے گی، اس سے علوم اور لطائف پیدا ہوں گے تو لہٰذا اسلام کے اندر عقل بے کار نہیں ہے بلکہ زیادہ کار آمد ہے۔ اس لیے اسلام کوئی رسمی دین نہیں، کہ چند بندھی جڑی رسمیں بتلادی گئی ہوں اور انھیں اختیار کر کے آدمی مسلم بن جائے۔ جیسے دوسرے ادیان میں ہے کہ چند رسوم ادا کرنے سے آدمی اس دین کا پیرو سمجھا جاتا ہے۔

مثلاً عیسائی بناتے ہیں تو پہلے ماءِ معمور یہ چھڑکتے ہیں جو زرد رنگ کا پانی ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ صَارَ نصرانیًا یعنی اب یہ نصرانی بن گیا۔ ایک خاص علامت ہے جس سے پہچان لیا جاتا ہے کہ اب یہ دینِ نصرانیت میں داخل ہو گیا۔

اسی طرح ہندو ہے اس نے جنیو ڈال لیا اور قشقہ لگایا اور کچھ کلمات کہہ دیئے تو اب کہیں گے کہ یہ ہندو دھرم میں داخل ہو گیا یا سکھ ہیں۔ مثلاً ہاتھ میں کڑا پہن لیا۔ سر میں کنگھا لگا لیا۔ کمر میں کرپان لگا لیا۔ تین کاف جمع کر لیا تو معلوم ہوا کہ سکھ بن گیا۔ یہ چند رسمیں ہیں۔ جن کے ادا کرنے سے آدمی اس دین کے اندر داخل شدہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اسلام کے اندر یہ نہیں کہ کچھ پانی چھڑکو یا آگ جلاؤ تو مسلمان ہو جاؤ گے۔ یہ سب رسمیات ہیں بلکہ اسلام میں کلمۂ طیبہ پڑھا جاتا ہے اور

دل میں توحید و رسالت کی عظمت پیدا کی جاتی ہے۔

جب توحید کی عظمت دل میں بیٹھ گئی، اور نبوت کی عظمت دل میں جاگزیں ہوگئی تو اب وہ مسلم بن گیا۔ حقائق سمجھنے سے انسان مسلم بنتا ہے۔ رسوم ادا کرنے سے نہیں بنتا، اسی لیے قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ یعنی میں اور میرے ماننے والے بصیرت کے اوپر ہیں۔ سوچ سمجھ کر دلائل سے دین قبول کرتے ہیں یہ رسمیات نہیں ہے کہ بے سوچے سمجھے جو کہہ دیا ان کو مان لو ورنہ دین سے خارج ہو جاؤ گے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں فرمایا گیا۔ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا۔ جب ان کے سامنے آیت پڑھی جاتی ہے تو وہ اندھوں اور بہروں کی طرح نہیں کرتے بلکہ سوچ سمجھ کر اور بصیرت کے ساتھ کرتے ہیں اور دلائل سے اسے سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم میں جتنے احکام ہیں وہ مدلّل ہیں۔ اس میں دلائل اور مسائل سب جمع کر دیئے گئے ہیں، یہ علمی معجزہ ہے۔ دلائل کا سمجھنا یہ عقل کا کام ہے ان کو سمجھ کر عقل دین کے حقائق کو سمجھے گی۔ پھر انھیں حقائق میں سے اجتہاد اور استنباط کر کے مسائل نکالے گی۔ جب اجتہاد چلے گا، قیاس چلے گا، استنباط چلے گا، تو دین پھیل کر ایک گلدستہ بن جائے گا۔ کہ اصول میں سے فروع نکال لیے، اور بہت سے فروع جمع کر کے اصول بنا لیے۔ یہ عقل ہی کا کام ہے کہ اس نے بنے بنائے دین کو جو آسمان سے اترا ہے اس میں کاوش کر کے اس کی تفصیلات کو کھول دیا۔ اس لیے عقل بے کار نہیں۔ بلکہ ضروری ہے اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو بدعقلوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا وہ جب سمجھ میں آئے گا تو عقلمندوں ہی کی سمجھ میں آئے گا، اس لئے کہ اسمیں دلائل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عائشہؓ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سوال کیا کہ یَا رَسُولَ اللّٰہِ میدانِ محشر میں دو آدمی آئیں گے۔ اور ان دونوں نے ایک ہی درجہ کا عمل کیا ہوگا۔ دونوں نے اتنی ہی دیر کی ہوگی۔ اور اتنی ہی ہمت اور قوت سے کیا ہوگا۔ لیکن ثمرات میں فرق ہوگا۔ ایک کو اعلیٰ مقام ملے گا اور ایک کو ادنیٰ مقام، تو یہ فرق کیوں پیدا ہوا۔ جب دونوں نے ایک ہی عمل کیا تو ثمرات میں فرق کیوں ہوگا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنا عقل ہے ایک وہ ہے کہ جس نے بصیرت کے ساتھ سوچ سمجھ کر عمل کیا اور ایک وہ ہے کہ سُنا اور تقلیدی عمل کر لیا۔ اس کے عمل کے اندر سوچ سمجھ اور بصیرت کچھ نہیں تھی۔ تو عقل کی بناء پر درجات میں تفاوت پیدا ہوتا ہے۔

ایک خادم تو وہ ہے کہ جس کام پر لگا دیا وہ مشین کی طرح لگا ہوا ہے اور ایک وہ ہے کہ آقا کے مزاج کو پہچان کر مناسب وقت پر کام کرتا ہے جس سے آقا کے دل میں فرحت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا مقام اعلیٰ ہوگا بہ نسبت اس خادم کے حالانکہ مطیع دونوں ہی ہیں۔ مگر ایک بے بصیرت ہے اور ایک بالبصیرت ہے تو عقل سے جب سوچ سمجھ کر اور دین کے حقائق کو جان کر اور اسرار پر مطلع ہو کر عمل کرے گا تو ایک شخص کا ایک عمل دوسرے کے ہزاروں اعمال کے برابر ہوگا کیونکہ اس میں بصیرت و معرفت اور اخلاص کامل ہے دوسرے کا وہی عمل اس مقام تک نہیں پہنچا سکے گا۔ اس لیے عقل بے کار نہیں بلکہ کارآمد ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ اسلام کے اندر عقل مخدوم ہے اور فلاسفہ کے یہاں عقل خدا کا درجہ رکھتی ہے۔ جو عقل کہہ دے وہ ماننے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کوئی چیستان نہیں ہے چنانچہ فلاسفۂ قدیم نے دس عقلیں مان رکھی ہیں۔ ایک عقل فعّال ہے وہ خالق ہے جس نے پیدا کیا۔ فلکِ اوّل کو اور عقلِ ثانی کو

اور عقلِ ثانی خود خالق ہے اس نے پیدا کیا فلکِ ثانی کو۔ اور عقلِ ثالث کو تو درجہ بدرجہ عقلیں عقلوں کو پیدا کرتی گئیں تو وہ علویات اور سفلیات میں عقل کو خالق مانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب خالق مانا تو پیروی کیوں نہیں کریں گے۔ جتنے فلاسفہ اور بندگانِ عقل ہیں ان کے یہاں عقل مثل معبود کے ہے لیکن اسلام میں عقل خادم کے درجہ میں ہے۔ معبود حقیقی ذات بابرکات حق تعالیٰ ہے ان کی طرف سے جو پیام پہنچے گا ہم اس پر عمل کریں گے اور عقل سے اس کو سمجھیں گے اور بصیرت پیدا کریں گے۔ اس لیے دین مجموعہ ہے عقل اور نقل دونوں کا مگر نقل اصل ہے۔ عقل خادم ہے۔ اور فلاسفہ کے یہاں عقل اصل ہے اور نقل ہے ہی نہیں۔

بس عقل ہی عقل پر مدار ہے اسی لئے وہ ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن انبیاء کا رشتہ چونکہ اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا ہے وہ ہر حقیقت کو صحیح سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام میں نہ کوئی شبہ ہے نہ شک، بلکہ قوت یقین ہے۔ یہ ہے بنیاد جس کی وجہ سے میں نے عرض کیا تھا۔ سائل کے جواب میں کہ دین کی بنیاد درحقیقت نقل پر ہے عقل پر نہیں۔ مگر اسلام میں عقل بے کار بھی نہیں۔ کیونکہ دین کی تفصیلات میں اس کے ذریعہ سے بہت مدد ملتی رہتی ہے۔ اگر عقل نہ ہو تو دین کو سمجھنا ہی مشکل ہو جائے گا۔

مجلس نمبر ۳

صبر اور صبر کی حقیقت اور صابرین کے درجات

_____ ۴ر رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۴ء

سوال:۔ شریعت میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی پریشانی یا مصیبت آئے تو اس پر صبر کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی چیز گم ہو جائے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھے لیکن اگر کوئی شخص اس کے باوجود اپنی گم شدہ چیز کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہے تو کیا ایسا شخص بھی صابرین میں شمار کیا جائے گا؟

جواب:۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ العالی نے فرمایا کہ صبر کا تعلق ہاتھ پیر سے نہیں بلکہ قلب سے ہے اور قلب کا وظیفہ یہ ہے کہ صبر کرے اور صبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ بندہ رضا کا اظہار کر دے کہ جو کچھ من جانب اللہ ہوا وہ ٹھیک ہوا۔ باقی ادھر سے امر ہے کہ جدوجہد بھی کرو اور کوشش بھی کرو۔ ہاتھ پیر سے سعی بھی کرو۔ یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ سعی کا حاصل یہ ہے کہ اس چیز کو پانے کے لئے۔۔ جدوجہد کرو جو گم ہے۔ لیکن جو کچھ نتیجہ نکلے اس پر راضی رہے اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنا بھی صبر ہے۔ اس میں چون وچرا بالکل نہ کریں۔

رہا یہ کہ صبر کس طرح سے کرے تو اس کی بھی تدبیر ہے۔ یعنی قلب کے اندر تشویش نہ ہو کہ ہائے میری فلاں چیز کھو گئی۔ اب کیا ہوگا۔ جب کسی چیز کے تلف ہونے یا فقدان پر صبر کریگا۔ تو جب تک اس کا کوئی بدل موجود نہ ہوگا جس کی طرف رجوع کرے تو اس وقت تک صبر نہیں ہو سکتا ہے اس لیے مصیبت آنے پر اس کے بدل پر غور کرے کہ کیا گیا اور کیا باقی ہے۔

صبر کے متعلق حضرت عمرؓ کی تدبیر

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عجیب و غریب تدبیر بتلائی ہے فرمایا کہ جب کوئی مصیبت آئے تو سب سے پہلے یہ غور کرو کہ یہ مصیبت میرے دین پر آئی ہے یا دنیا پر، اگر دین محفوظ ہے تو خوشی ہونے کی بات ہے کہ اصل سرمایہ محفوظ ہے۔ بس اس خیال کے ساتھ صبر آجائے گا۔ باقی دنیا یہ تو خود ہی جانے والی ہے۔ بعض دفعہ زندگی میں یہ چھن جاتی ہے ورنہ موت سے تو چھن جانا ضروری ہے۔ تو جو چیز چھننی تھی وہ چھن گئی وہ جانے ہی والی تھی۔ اور جو چیز رہنے والی تھی۔ وہ الحمدللہ محفوظ ہے اس طرح صبر آجائے گا کہ بڑی چیز قبضے میں ہے اور چھوٹی چیز چلی گئی۔ اب جو وہ چھوٹی چیز مثلاً دولت یا صحت گئی اور مصیبت آئی تو اس پر بھی غور کرے کہ اس کے آنے سے کچھ فائدہ بھی پہنچا۔ یا نقصان ہی نقصان ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس پر غور کرو کہ بدل میں کیا چیز ملی، اور باقی کیا چیز رہی تو صبر سہل ہو جائے گا مثلاً موت سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں ہے آدمی روتا بھی ہے اور جزع فزع بھی کرتا ہے۔

لیکن اگر اس پر غور کرے جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ اَلْمَوْتُ... تُحْفَۃُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ یعنی مؤمنین کے لئے موت سب سے بڑا تحفہ ہے اور اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ اِنَّ الْمَوْتَ جِسْرٌ یَّصِلُ الْحَبِیْبُ اِلَی الْحَبِیْبِ یعنی موت ایک پل ہے جس سے گذر کر آدمی اپنے محبوب حقیقی تک پہنچتا ہے۔ اب موت خوشی کی چیز ہو جائے گی۔ غمی کی چیز نہیں رہے گی۔ پسماندوں کے لئے یہ ہے کہ سینکڑوں غم سے چھوٹ گیا، اللہ نے راحت دی۔ ان کے لئے صبر کی یہ صورت ہے تو ہر چیز کا ایک بدل تبلایا گیا۔ ایک چیز جائے گی تو اس کے بدلہ دوسری بڑی چیز آئے گی۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ اگر آدمی اپنے

ارادے سے خرچ کرے گا تو وہ اس سے بڑھ کر نعمت پائے گا۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نگاہ کرے کہ کون سی چیز گئی اور کون سی چیز باقی ہے اور کس بڑی مصیبت سے میں بچ گیا۔ اس لیئے کہ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے شکر کا موقعہ دیا ہے مصیبت میں بھی شکر کا موقع ہے کہ اس معمولی مصیبت کے ذریعہ بڑی مصیبت سے بچا لیا گیا۔ اور فلاں مرض سے رہائی نصیب ہوئی۔ اس لیے کہ مصیبتیں لاانتہا ہیں اور بڑی سے بڑی مصیبتیں ہیں۔ جب بڑی بڑی مصیبتوں پر غور کرے گا تو اپنی مصیبت ہلکی معلوم ہوگی۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا واقعہ

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ قدس سرہٗ کا واقعہ ہے۔ حضرت تھانویؒ نے بیان فرمایا۔ حضرت حکیم الاسلام خود اس مجلس میں شریک تھے جس میں یہ واقعہ پیش آیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ یہ بیان فرما رہے تھے کہ دنیا میں کوئی چیز مصیبت نہیں ہے بلکہ ہر چیز نعمت ہے۔ مصیبت بھی ایک نعمت ہے اس لیئے کہ اس سے بندہ کو اجر ملتا ہے۔ ترقی مدارج ہوتی ہے آدمی کو چاہیئے کہ مصیبت پر نگاہ نہ کرے۔ بلکہ ترقیٔ مدارج اور کفارۂ سیئات پر نگاہ کرے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مصیبت آتی ہے وہ مصیبت نہیں بلکہ نعمت ہوتی ہے ہم اپنی تنگ دلی سے اس کو مصیبت سمجھ جاتے ہیں۔

حضرت حاجی صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً جس وقت یہ مضمون بیان فرما رہے تھے اس وقت ایک شخص آیا جس کے بازو میں ایک بہت بڑا دنبل نکل رہا تھا وہ ہائے ہائے کرتے ہوئے حضرتؒ سے درخواست کی کہ ہمارے لئے دعا فرمائیں بڑی سخت تکلیف ہے ایک ہفتہ ہوگیا مگر ایک دانہ میرے منہ میں نہیں گیا۔ ہر وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں بچھو ڈنک مار رہے ہیں کسی کروٹ مجھے چین نہیں ہے

— دعا کیجئے کہ یہ مصیبت دُور ہو جائے۔

حضرت تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً فرماتے تھے کہ میں سوچنے لگا کہ اب حضرتؒ کیا جواب دیتے ہیں کیوں کہ حضرتؒ ابھی مصیبت کو نعمت فرما رہے تھے اگر یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اس کی تکلیف اور بڑھا دے تو یہ کونسی شفقت کی دعا ہوئی۔ اور اگر یہ کہتے ہیں کہ اس مصیبت کو زائل کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نعمت آئی تھی اس کو چھین لیجئے۔ گویا یہ زوالِ نعمت کی دعا ہو جائے گی۔ بظاہر اب حضرتؒ کے لئے کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اِدھر میرے دل میں یہ خطرہ آیا اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلب پر یہ خطرہ منکشف ہو گیا۔ چناں چہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھایا اور زور زور سے دُعاء مانگنی شروع کی تاکہ جواب بھی ہو جائے اور مصیبت کا بھی ازالہ ہو جائے۔

فرمایا کہ اے اللہ! یہ تیری بہت بڑی نعمت ہے بندہ کی یہ قسمت کہاں کہ دُنبل نکلے اور یہ تکلیفیں ہوں یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کا نعمت ہونا گویا پوری قوت سے بیان کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اے اللہ! یہ بندہ ضعیف ہے اس نعمت کے تحمل کی اس میں طاقت نہیں اس لئے مرض کی اس نعمت کو صحت کی نعمت سے بدل دیجئے۔ اس کے اندر اسی کی طاقت ہے۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ میں مُنہ دیکھتا رہ گیا کہ نعمت ہونا بھی ثابت کر دیا اور اس کے زوال کی دُعا بھی فرما دی تو واقعہ یہی ہے کہ کوئی مصیبت مصیبت نہیں ہے بلکہ وہ بھی نعمت ہے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ بعضے نعمتوں کی صورت بھی نعمت ہی ہوتی ہے اور حقیقت میں بھی نعمت ہوتی ہے اور بعض نعمتوں کی صورت مصیبت کی ہوتی ہے

مگر اس کی حقیقت نعمت ہوتی ہے، مگر ہیں دونوں نعمت ہی۔ صرف صورت میں فرق ہے۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا واقعہ

ہمارے والد صاحب مرحوم نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ بیان فرمایا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بیٹا کہا کرتے تھے۔ قرابت داری کا بھی تعلق تھا۔ اور محبت بھی فرماتے تھے۔ فرمایا کہ بیٹا! جب میں ہندوستان سے ہجرت کی نیت سے حجازِ مقدس کے لئے چلا اور جہاز میں بیٹھا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا کہ آپ کے گھر جا رہا ہوں نہ کسی سے سوال کروں گا نہ مانگوں گا نہ کسی کی چیز پر نگاہ... کروں گا۔ آپ دیں گے تو کھا پی لوں گا۔ اگر نہیں دیں گے تو زیادہ سے زیادہ آپ موت دیں گے تو وہ بھی آپ ہی دینے والے ہیں وہ بھی نعمت ہے لیکن میں کسی سے مانگوں گا نہیں۔

کریم کے دروازے پر جا کر آدمی دوسروں کے دروازوں کو تاکے۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ جہاز میں بیٹھ کر خدا سے پکا عہد کیا۔ جب مکہ معظمہ پہنچے اس وقت حضرت کوئی رئیس تو تھے نہیں کہ زیادہ ساز وسامان ہوتا۔ معمولی قسم کی پونجی ساتھ تھی وہ دو چار دنوں میں ختم ہوگئی۔ وہاں آپ کا کوئی جاننے والا نہیں تھا جو آپ کی امداد یا اعانت کرتا۔ اس کے بعد فاقے شروع ہوگئے۔ دو تین فاقے ہو گئے مگر کوئی انتظام نظر نہیں آیا۔ ضعف بڑھنا شروع ہوا۔ مگر بایں ہمہ حرم شریف میں آتے رہے۔ یہاں تک کہ سات وقت کا فاقہ ہوگیا۔ اب کمزوری بھی شروع ہوگئی مگر پھر بھی تکلف کے ساتھ حرم شریف میں حاضر ہوتے رہے۔

اسی زمانہ میں ایک مصیبت پیش آئی۔ آپ طواف کر رہے تھے بڑھاپے

کا زمانہ اور سات وقت کے فاقے ، ضعف و نقاہت کا جو حال ہوگا ظاہر ہے۔ اتفاق سے کسی بدوی کی لنگی پر پیر پڑ گیا۔ اس نے جوش میں آکر زور سے ایک دھونس مارا۔ حضرت حاجی صاحبؒ دھول لگتے ہی گر پڑے۔ دوسرے لوگ طواف میں مصروف رہے۔ اسی حالت میں حضرتؒ نے دیکھا کہ بیت اللہ کی ایک جانب حضرت جبرئیل علیہ السلام کھڑے ہیں اور ایک جانب حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت میکائیل سے کہتے ہیں کہ بندہ بڑا صابر ہے اور میکائیل کہتے ہیں کہ ابھی تھوڑی سی کسر اور ہے۔

حضرت فرماتے تھے کہ جب مجھ کو ہوش آیا تو پھر ہم نے عہد کی تجدید کی اور کہا کہ اے اللہ! میں اس عہد پر قائم ہوں کہ کسی اور سے نہیں مانگوں گا اگر آپ موت دیں گے تو وہ بھی آپ کی نعمت ہے۔ عہد کو پورا کیا یہاں تک کہ گیارہ وقت کا فاقہ ہو گیا۔ اب حرم شریف میں آنا مشکل ہو گیا۔ گھر کے قریب ایک مسجد تھی وہیں نماز پڑھنے لگے۔ جب گیارہ وقت کا فاقہ ہو گیا اور بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا تو پھر عہد کی تجدید کی کہ میں کسی اور سے نہیں مانگوں گا۔ آپ ہی اگر کھلائیں گے تو کھاؤں گا۔

والد صاحب کا بیان ہے کہ مجھے خطاب کر کے فرمایا۔ بیٹا جب گیارہ وقت کا فاقہ ہو گیا تو میں بالکل نڈھال ہو گیا۔ اسی حال میں ایک شخص نے دروازے پر آواز دی، میں نے کہا کہ بھائی آجاؤ۔ اس کے ہاتھ میں چینی کا ایک رقاب تھا اوپر سے کپڑا ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے کھولا تو پکا ہوا پلاؤ نکلا۔ ہم نے سوچا کہ جو چیز بغیر اشراف نفس اور بلا طلب کے آئی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی کھاؤ چونکہ نہایت عمدہ پلاؤ تھا اور بھوک بھی شدت کی تھی۔ اس لیے خوب سیر ہو کر کھایا کچھ بچ گیا تو خیال آیا کہ رات کے لئے رکھ دوں۔ پھر خیال آیا کہ جس نے مجھے گیارہ وقت

کے بعد یاد کیا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ رات کو یاد نہ کرے، تو میں نے برتن ڈھنک دیا۔ اس نے رقاب اٹھالی اور کہا کہ بہت اچھا ہوا کہ رات کے لئے نہیں رکھا ورنہ زندگی بھر فاقے سے مارا جاتا۔ یہ کہہ کر چلا گیا۔ حضرت یہ فرماتے تھے کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کون تھا۔ پھر میں نے اس کو نہیں دیکھا۔

اُس کے بعد فرمایا بیٹا آج وہ دن ہے کہ کثرت سے دُنیا میرے پاس آرہی ہے۔ نقد پر نقد۔ کپڑوں پر کپڑا۔ غذا پر غذا۔ میں رکھتا رکھتا اور بانٹتا بانٹتا تنگ آگیا۔ مگر دُنیا آتے آتے نہیں تھک رہی ہے۔ دروازہ کُھل گیا فتوحات کا۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو آگے کا واقعہ بیان فرمایا وہ یہ تھا کہ جب حضرت حاجی صاحب کے یہاں سامان بہت ہوگیا تو چوروں نے تاک لیا کہ حضرت کے گھر میں بڑی نقدی بڑا سامان ہے۔ رات میں آئے اور اس وقت حضرت تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے۔ مگر چوروں کو یہ خبر نہیں ہوئی کہ آپ جاگ رہے ہیں۔ مگر چوروں کی سب حرکتیں دیکھ رہے تھے کہ وہ سامان جمع کر رہے ہیں اور گٹھریاں بنا رہے ہیں۔ جب وہ جانے لگے تو آپ نے کہا کہ کم بختو! تم کو چوری کرنی بھی نہیں آتی جو لینے کی چیز تھی وہ لی نہیں۔ نقد تو وہاں رکھا ہوا ہے۔ کئی ہزار روپے ہیں وہ چور شرمندہ تو ہوئے مگر چونکہ چور تھے اسلئے نقدی بھی لے لی۔ جب سب لے کر چلے گئے تو میں اُٹھ کر مصلّٰی پر آیا اور کہا کہ اے اللہ تیرا شکر ہے کہ یہ وبال تو نے میرے سر سے ختم کر دیا، اب میں تیرے لئے فارغ ہُوں بہت شکر ادا کیا۔ چونکہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ معروف ہو چکے تھے۔ حکومت اور پولیس والے جانتے تھے۔ صبح کو یہ خبر مشہور ہوئی کہ حضرت کے گھر چوری ہوگئی ہے۔

فوراً پولیس نے شہر کی ناکہ بندی کر کے چوروں کو پکڑ لیا۔ سارا سامان مل گیا مع نقد کے، پولیس نے سارا سامان لاکر رکھ دیا کہ حضرت یہ آپ کا سامان ہے

فرمایا۔ الحمدللہ آ گیا۔ اب اسے اپنی اپنی جگہ لگا رہے ہیں۔ جیسے اس کے انتظار میں تھے۔ سب سامان کو اپنی جگہ لگا کر پھر دو رکعت نماز نفل پڑھی کہ اللہ! تیرا شکر ہے کہ میری چیز تو نے پھر مجھے دیدی۔ تو گیا جب بھی شکر کیا، اور آیا جب بھی شکر کیا۔ اس لئے کہ ان کی نگاہ مصیبت پر نہیں تھی۔ بلکہ مصیبت بھیجنے والے پر تھی۔ کہ اس نے میری مصلحت سے بھیجی ہے اس پر فرماتے تھے کہ ہر مصیبت پر اللہ نے شکر کا موقع رکھا ہے، ہم اپنی تنگ ذہنی سے مصیبت بناتے ہیں ورنہ وہ درحقیقت نعمت ہوتی ہے۔

پھر دوسری مصلحت یہ ہے کہ ایک چیز گئی دین تو باقی ہے دنیا ہی تو گئی تو پھر صبر آجائے گا۔ اور دنیا گئی تو وہ کفارۂ سیئات ہے اس پر بھی صبر آجائے گا کسی مصیبت میں اللہ تعالیٰ نے ایسی بات نہیں رکھی کہ شکر کا موقع نہ رہے۔

ہر مصیبت سے بڑھ کر مصیبت ہے

اس پر میرے والد صاحب مرحوم نے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شخص کے دو جوڑواں بچے پیدا ہوئے اور ان کی کمر اوپر سے نیچے تک جڑی بالکل چپکی تھی۔ ڈاکٹروں کو جمع کیا گیا کہ یہ دو بچے ہیں اور جڑے ہوئے ہیں۔ اس کو حل کر وان کو آپریشن کر کے الگ کر دو۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اگر آپریشن کیا گیا تو دونوں مر جائیں گے۔ اس لئے کہ جو شہ رگ ہیں وہ دونوں کی جڑی ہوئی ہیں۔ دونوں کی پرورش کی گئی اب ماں بیچاری ایک کو دودھ پلاتی تو دوسرا اُلٹا پڑا ہوا اور جب دوسرے کو پلاتی ہے تو وہ اُلٹا پڑا ہوا ہے۔

غرض وہ اسی طرح سے پالتی رہی یہاں تک کہ بچے پانچ چھ برس کے ہو گئے ان کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ خدا کی قدرت کہ ایک کے دل میں جذبہ پیدا ہوا۔

علوم دین حاصل کرنے کا۔ اور ایک کے دل میں جذبہ پیدا ہوا علوم معاش حاصل کرنے کا۔ دونوں کے لئے عالم متعین کیے گئے ایک اچھا عالم بن گیا اور ایک بڑا گریجویٹ بن گیا۔ دونوں بھائی آپس میں باتیں کیا کرتے۔ جو بھائی دنیا طلب تھا وہ کہتا کہ ہم سے زیادہ کوئی مصیبت میں نہیں ہے ہر وقت کی مصیبت میرا جی کھیلنے کو چاہتا ہے اور تیرا دل نہیں چاہتا۔ مگر مجبوراً تجھ کو جانا پڑتا ہے۔

اور اگر میں استنجا کے لئے جانا چاہوں اور تیرا جی نہیں چاہتا تو بھی تجھ کو جانا پڑتا ہے تو کوئی اپنے دل کی بات نہیں کر سکتا ہے لہٰذا ہم سے زیادہ کوئی مصیبت میں نہیں ہے۔ یہ سن کر دیندار بھائی کہتا کہ بھائی صبر کرو اس سے بڑھ کر بھی تو مصیبت آنی ممکن ہے اس نے کہا کہ اس سے بڑھ کر مصیبت ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ نصیحت کرتا کہ یہ مت کہو اللہ کے یہاں مصیبتوں کے خزانے بھی بہت ہیں خدا کی قدرت کہ دیندار بھائی کا انتقال ہو گیا۔ تو پھر ڈاکٹروں کو جمع کیا کہ اس لاش کو کاٹو تو انہوں نے کہا کہ اگر لاش کاٹی گئی تو یہ بھی مر جائے گا۔

اب لاش دُنیا دار بھائی کے کمر پر ہے۔ سوتا ہے تو مردہ کمر کے اوپر۔ بیٹھتا ہے تو مُردہ کمر کے اوپر۔ کھانا کھاتا ہے تو مردہ کمر پر۔ استنجا کو جاتا ہے تو مردہ کمر پر۔ اس وقت چھوٹے بھائی نے کہا کہ میرا بھائی صحیح کہتا تھا۔ تو وہ مصیبت لاکھ درجہ بہتر تھی جب کہ بھائی زندہ تھا تو اس نے توجہ کیا اور صبر کیا اور کہا کہ اے اللہ بس کرو اگر اس سے بڑی مصیبت آگئی تو کیا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ ہر مصیبت سے بڑھ کر مصیبت ہے۔

صبر کی ایک صورت یہ ہے کہ اہلِ مصائب کو سامنے رکھے۔ بالخصوص ان کو جن پر زیادہ مصیبت آئی ہے تو خود بخود وہ شکر کریگا کہ ہم سے زیادہ مصیبت فلاں پر آئی ہے۔

نعمت اور مصیبت اضافی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ مکے کی تیرہ سالہ زندگی مصائب سے بھری ہوئی ہیں۔ بعض حضراتِ صحابہ نے شکایت کی یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بہت مصیبت میں ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اُممِ سابقہ کو سامنے رکھ کر دیکھو۔ ان پر اتنی بڑی بڑی مصیبتیں آئی ہیں کہ ان کو آروں سے چیرا گیا اور جلتے ہوئے تیل میں ڈال ڈال کر اہلِ حق کو بھُونا گیا ہے۔ تم پر اس طرح کے مصائب تو نہیں آئے اور فرمایا کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب اس قدر امن اور اتنی رفاہیت ہو گی۔ کہ ایک بوڑھی عورت مکے سے مدینہ رات کو جائے گی اور سونا اُچھالتی ہوئی جائے گی۔ مگر کوئی پوچھنے والا کوئی نہیں ہو گا۔

یہ قانونِ قدرت ہے کہ مصائب کے بعد عموماً نعمتوں کا دروازہ کھُلتا ہے ابتداء میں جو آزمائش ہوتی ہے۔ اس کو آدمی سہہ لے پھر فتوحات کے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ اور اگر اسی میں بھاگ نکلا تو پھر مصیبت ہی مصیبت ہے۔ باقی حکم یہی ہے کہ مصیبت مت مانگو۔ عافیت مانگو۔ اور اسی کی دُعا کرو لیکن اگر مُصیبت آجائے تو صبر کرو۔

حضرتِ ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ کے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بخار کے فضائل بیان فرمائے کہ یہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ ہر مرض کسی خاص محل یا عضو پر پڑتا ہے لیکن بخار ایسا مرض ہے کہ اندر سے لے کر باہر تک ناخن تک پر اس کا اثر ہوتا ہے تو پورے بدن کا کفارہ ہوتا ہے۔

اسی لیے فرمایا گیا کہ بخار مثل خبث الحدید کے ہے جیسے بھٹی کہ اگر بھٹی میں سونا ڈال دیا جائے تو اس کا سب مَیل کچیل جل جاتا ہے لَا تَسُبُّ الْحُمّٰی یعنی بخار کو بُرا بھلا مت کہو۔ فَاِنَّهَا حَظٌّ مِّنَ النَّارِ یہ جہنم کی آگ کا بدل ہے اس سے وہاں بچاؤ رہے گا۔

ابوہریرہؓ کا بخار کی دعا مانگنا

جب ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہ نے سنا تو جاکر دعا کی کہ اے اللہ بخار ٹھہر جائے کسی وقت نہ اُترے۔ مگر میں جمعہ اور نماز میں جاتا رہوں۔ معذور ہو کر نہ جاؤں۔ مگر بخار ہر وقت رہے۔ بخار ٹھہر گیا۔ بہر حال صحابہ ولی ہیں مستجاب الدعوات ہیں۔ مساجد میں تو حاضر ہوتے رہے مگر بخار تو بخار ہی ہے رنگ جلنا شروع ہوا۔ سوکھنے شروع ہوئے یہ حالت دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ... ابوھریرہؓ تمہارا کیا حال ہے۔ عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ آپ نے بخار کے فضائل بیان فرمائے تھے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ بارہ۱۲ مہینہ بخار مجھے رہا کرے فرمایا بندۂ خدا! یہ مطلب تھوڑے ہی تھا کہ بخار کو خود مانگا کرو۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ آجائے تو صبر کرو۔ یہ مطلب نہیں کہ مانگ مانگ کر مصیبتیں مول لو۔

چنانچہ آپ نے پھر دعا کی تو بخار زائل ہوگیا۔ اور فرمایا اَسْئَلُ اللّٰہَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی عافیت مانگا کرو۔

حکیم الاسلام نے فرمایا کہ دوسروں پر فرض ہے کہ وہ مصیبت زدوں کی مصیبت دُور کرنے کی کوشش کریں جب علم میں آجائے کہ کوئی مفلس ہوگیا ہے تو اس کی مفلسی دُور کرو اسے صدقات دو اُسے پریشان نہ ہونے دو اور اگر کسی کو اطلاع ہی نہ ہو اور وہ صابر ہے تو اس کے لئے آخرت میں ثمرات مرتب ہوں گے حدیث شریف میں ہے کہ میدانِ محشر میں جب اہلِ مصیبت آئیں گے تو ان پر ایک حسرت ہوگی اور حسرت یہ ہوگی کہ اتنی ہی مصیبت کیوں آئی جب اتنی... مصیبت پر یہ اجر و ثواب کے ڈھیر ہیں تو اگر بڑی مصیبت آتی تو اور زیادہ ملتا۔ اور تمنا کریں گے کہ کاش! کہ دنیا میں ہماری کھالوں کو قینچی سے کیوں نہ کاٹا

گیا۔ تاکہ یہاں زیادہ نعمتیں ملتیں۔

یہ حال وہاں جاکر منکشف ہوگا کہ وہ مصیبت مصیبت نہیں تھی۔ بلکہ دراصل نعمت تھی۔ اور یہ اس کے اجر ہیں۔ باقی دنیا تو یہ گھر ہی مصیبت کا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی کَبَدٍ۔ انسان پیدا ہی کیا گیا ہے مصیبتوں میں۔ پیدائش سے ہی مصیبتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں کبھی بیماری ہے اور کبھی غم والم زندگی اسی میں کٹ جاتی ہے، تو نعمت درحقیقت آخرت ہی کی ہے اگر دنیا کی نعمت بھی ہو تو اس میں بھی مصائب ملے ہوئے ہیں کوئی نعمت ایسی نہیں ہے کہ جسمیں مصیبت کا دروازہ کھلا ہوا نہ ہو اور کوئی مصیبت ایسی نہیں کہ جسمیں نعمت کا راستہ نہ نکلتا ہو۔ تو یہاں کی نعمت محدود ہے اور مصیبت بھی یہاں کی لازوال نہیں ہے اکبر نے ایک قطعہ لکھا ہے وہ لسان العصر ہیں اور مانے ہوئے شاعر ہیں۔ انھوں نے بڑے ہی کام کی بات کہی ہے۔ شعر

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ؎ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج وراحت کی ؎ وہ فقط وقت کا گذرنا ہے

نہ یہ ٹھہرنے والی نہ وہ ٹھہرنے والی۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے بڑے کام کی بات بتائی ہے کہ مصیبتوں کا خیال مت کرو اور منزل کی طرف متوجہ رہو مگر منزل کا پتہ نہیں دیا۔

مطلب یہ کہ مصیبت آئے تو صبر کرو اور خیال کرلو کہ یہ تو وقت کا گزرنا ہے لیکن جاؤ کہاں اس قطعہ میں منزل مقصود کا پتہ نہیں دیا تو میں نے اس میں اپنے تین شعر بڑھا دیئے۔ تاکہ منزل کا پتہ بھی چل جائے۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ؎ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج وراحت کی ؎ وہ فقط وقت کا گذرنا ہے

رہ گیا عزّ و جاہ کا جھگڑا۔ ٭ یہ تخیّل کا پیٹ بھرنا ہے
اور قابلِ ذکر بھی نہیں خورد و نوش ٭ یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے
مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق ٭ نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

اگر اس مقصد کو پیشِ نظر رکھو تو ہر مصیبت ہلکی ہو جائے گی۔ یعنی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں گذر جائے یہ مقصد نہیں ہے کہ دُنیا کی فکروں میں پڑ کر اصل حقیقت کو بھول جائے۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی نے اپنے چند اشعار شامل کر کے مقصدِ حیات کو بالکل واضح فرما دیا۔ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ اگر اکبر مرحوم زندہ ہوتے تو ہمارے ان اشعار کو سُنکر بہت ... خوش ہوتے۔

مجلس ۴

۶ ر رمضان شریف ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۳ ر ستمبر ۱۹۷۴ء

خلاصۂ مجلس یہ ہے کہ عالم میں کوئی حادثہ ایسا نہیں کہ اس میں کوئی حکمت پوشیدہ نہ ہو۔ مجلس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ کتاب اللہ وسنت کا دامن بھی ہاتھ میں رہے اور اہل اللہ کا احترام بھی قلب میں رہے۔ یہی اعتدال کا راستہ ہے۔ سُوال سے سے پہلے چٹائی میں سے سپولیا ایک جانور نکلا اس کے مارنے کے بعد حضرت نے خود بیان شروع فرما دیا۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ ایک بزرگ کہیں جا رہے تھے دیکھا کہ ایک بچھو بڑی تیزی سے کہیں جا رہا ہے یہ بھی اُس کے پیچھے لگ گئے ان کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ بچھو کسی کام پر من جانب اللہ مامور ہے۔ راستے میں ایک نالہ آیا۔ بچھو بڑی تیزی سے اس کو بھی عبور کر گیا۔ دیکھا کہ سامنے ایک باغ ہے اس میں جا رہا ہے پھر دیکھا کہ ایک بزرگ باغ میں سو رہے ہیں۔ اُدھر سے ایک سانپ کاٹنے کے لئے بھی تیزی سے آ رہا ہے جب سانپ اس شخص کے پاس پہنچا تو اُس نے سر کاٹنے کے لئے اٹھایا۔ فوراً بچھو نے سانپ کو ایک ڈنک مارا۔ سانپ پانی پانی ہوگیا، اُنھوں نے اُن کو اُٹھایا۔ معلوم ہوا کہ کوئی اونچے لوگوں میں سے ہیں انھوں نے کہا کہ آپ کہاں تو اُس بزرگ نے واقعہ سُنایا تو حق تعالیٰ شانہ، نے سانپ کی موت مقدر کی تھی اور بچھو کو مقرر کیا تھا۔ اُن کو بچانے کے لئے اور یہ بزرگ جو پیچھے گئے تھے اُن کو دکھانا تھا کہ ایک ہی واقعہ میں ہماری کتنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ کسی کی موت مقدر

کسی کی حیات مقدر اور کسی کے لئے علم و حکمت مقدر، واقعہ ایک مگر پہلو اتنے۔

عبرت کا ایک دوسرا واقعہ

ایک واقعہ ادب کی کتابوں میں دیکھا تھا کہ ایک بوڑھا آدمی ایک ٹٹو پر سوار اور اس کے دونوں طرف کھرجیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ وہ آدمی ایک سرائے میں آکر ٹھہرا وہ بہت ہی کمزور اور ضعیف تھا اس نے بمشکل تمام دونوں کھرجیاں اتاریں اس نے یہ سامان رکھ کر اپنا کمبل وغیرہ آرام کرنے کے لئے بچھایا۔ گرمی کا زمانہ تھا سو گیا۔

ایک نوجوان آدمی نے دیکھا کہ کھرجیوں میں بڑا قیمتی سامان ہے لاکھوں روپیہ کے جواہرات ہیں۔ اس نے اس بوڑھے کو قتل کر دیا اور سامان مع ٹٹو لے کر روانہ ہو گیا۔ ایک بزرگ بھی اس سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے اور سارا واقعہ دیکھ رہے تھے۔ یہ واقعہ دیکھ کر جناب باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ اس فعل میں کوئی حکمت ضرور ہوگی۔ گو مجھ کو معلوم نہیں۔ مگر یہ کیا راز ہے کہ ایک بوڑھا آدمی لاکھوں روپیہ کا سامان لے کر یہاں آکر لیٹ جائے اور ایک نوجوان آئے اور اس کو قتل کر کے سارا سامان لے جائے تو نے بڈھے کو تو... محروم کر دیا۔ اور نوجوان جس کو کمانے کی طاقت تھی اس کو اس مالیت کا مالک بنا دیا۔ اسمیں حکمت ضرور ہے مگر وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اس پر ادھر سے ان کے قلب پر القا کیا گیا کہ یہ مال اس نوجوان کے باپ کا ہے اس بوڑھے نے جا کر اس کے باپ کو قتل کیا۔ اور قتل کر کے یہ مال لا رہا تھا۔ مگر... نوجوان کو اس کا بالکل علم نہیں تھا کہ یہ بوڑھا اس کے باپ کا قاتل ہے۔ اس کے دل میں یہ بات ڈال دی۔ وہ قتل کر کے مال لے کر چلا گیا۔ ورنہ نوجوان کو خبر بھی نہیں تھی۔ کہ یہ میرے باپ کا قاتل ہے تو ہم نے تو اس سے قصاص لیا کیونکہ

وہ اس کے باپ کا قاتل تھا۔ اور حق دار کو پہنچایا کہ وہ مال اسی کا تھا خواہ اُسے خبر بھی نہ ہو۔ پھر ان کے سمجھ میں یہ بات آئی کہ واقعی کوئی حادثہ ایسا نہیں کہ جس میں حکمت نہ ہو مگر یہ حق تعالیٰ ہی اس کو سمجھتے ہیں کہ عالم کا نظام کس طرح چل رہا ہے۔ اور ان کی حکمتیں کیا ہیں۔ اور کس نظام کے ماتحت چل رہا ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جتنے حوادث ہیں وہ ایک نظام کے ماتحت پیش آتے ہیں یہ نہیں کہ جزئیات علی الٹپ ہیں کہ کسی نے قتل کیا کسی نے کچھ کیا۔ بلکہ ان تمام کے اندر ایک نظم ہے۔ اس نظم کے ماتحت کسی کو سنوارنا کسی کو بگاڑنا کسی کو دینا۔ کسی سے چھین لینا۔ کسی سے قصاص لینا۔ سطح واقعہ کی ایسی ہے کہ ظاہر میں ظلم ہوا کہ بڈھا قتل ہوا اور جوان رہ گیا۔ مگر اس میں حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

بعض لوگ اس زمانے میں کہا کرتے تھے کہ ایک انقلاب آیا اور قتل عام ہوا اِدھر بھی مارے گئے اُدھر بھی مارے گئے اور لاشیں بے گور و کفن، بظاہر بہت سے بے گناہ بھی تھے کہ انھوں نے ظلم نہیں کئے تھے۔ مگر وہ بھی قتل کیے گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ تو ظلم ہے کہ کردہ ناکردہ سب مارے گئے۔ میں نے کہا کہ ظاہر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بڑی زیادتی ہوئی۔ لیکن یہ حق تعالیٰ کا فعل ہے اس میں لاکھوں حکمتیں ہیں۔ مَیں اور تم کیا سمجھ سکتے ہیں۔ حق اس لئے ہے کہ بہت سے لوگ گنہگار تھے اور انھیں مقام کریم دینا تھا تو انھیں شہادت دی گئی۔ شہید تو وہی ہیں جو بے گناہ قتل کئے جائیں اور پھر بہت سے وہ ہوں گے کہ ان کے بہت سے حقوق چڑھے ہوں گے بازار کے بازار لٹ گئے تو ان میں بہت سے وہ ہوں گے جنھوں نے زکوٰۃ تک ادا نہیں کی ہو گی۔ تو قتل سے ان کے حق میں بھلائی مقصود تھی کہ: اَلسَّیْفُ مَحَّاءُ الذُّنُوبِ کہ مقتول ہو کر جو شہید ہو جائے

تو وہ شہید ہی ہے۔ اور تلوار ان کے سارے گناہوں کو مٹا دیتی ہے ان کے تو گناہ مٹے وہ قتل ہو گئے اور قاتلوں کے اوپر حجت تمام کرنی تھی۔ جنہوں نے قتل کیا۔ ان کے اوپر اتنی حجت تمام ہوئی کہ آخرت میں ان کے لئے عذاب مقرر ہوا تو عذاب طے شدہ تھا۔ لیکن اس کے لئے یہ سامان بنایا تاکہ ظلم میں اور زیادتی ہو۔ اور ظلم کمال کو پہنچ جائے تاکہ حجت تمام ہو جائے تو اس واقعہ سے کسی کا تو گناہ مٹانا تھا۔ اور کسی کے گناہ کی تکمیل کرنی تھی۔ تاکہ آخرت میں وہ عذاب پائے اور دوسروں کو عبرت دلانی تھی کہ جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور حقوق تلف کرتے ہیں۔ ان کا انجام یہ ہوتا ہے۔ ظاہر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑی زیادتی ہوئی مگر حقیقت میں سیکڑوں حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ آدمی غور کرے تو حکمتیں نکلتی ہیں فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ۔

تو یہاں جو سانپ مارا گیا۔ اس کی موت مقدر تھی اور ہم کو عبرت دلائی گئی کہ جو سامان لاؤ اسے جھاڑ کر لاؤ۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب رات کو سوؤ تو کپڑوں کو اِدھر اُدھر مت ڈال دو۔ بلکہ تہہ کر کے رکھو یا اوپر لٹکا دو۔ اس لیے کہ اگر زمین میں ڈال دے تو ممکن ہے کہ اس پر کوئی کیڑا مکوڑا چڑھ جائے اور اسے بے محابا پہنے تو وہ اسے اذیت پہنچائے۔ اور جب پہنو تو جھاڑ کر پہنو۔ اسی طرح حکم ہے کہ جب بستر پر لیٹو تو اسے جھاڑ دیا کرو۔ بعض دفعہ کچھ چیونٹیاں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب آدمی جھاڑے گا تو تکلیف سے بچ جائیگا سارے احکام اسی لیے دیے گئے ہیں کہ بنی آدم کی خیر خواہی مقصود ہے تاکہ احتیاط سے کام کیا جائے۔

حُسن اور جمال میں فرق یہ سارے احکام مقتضی ہیں حق تعالیٰ کی صفت جمیل کو اَللّٰہُ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ۔ جمال

جمال کے معنیٰ خوب صورتی کے نہیں ہیں۔ بلکہ توازن کے ہیں۔ چہرہ ہو تو اسمیں توازن ہو بدن ہو تو اسمیں توازن ہو جبھی خوبصورتی بھی ہو گی۔ اگر ہاتھ لمبے ہو گئے یا چھوٹے ہو گئے یا کوئی جزء بے جوڑ ہو تو خوب صورتی نہیں ہو گی۔ اس لیے خوب صورتی کے لئے توازن ضروری ہے۔ حُسن کے معنیٰ تناسب کے ہیں۔ اور جمال کے معنیٰ ہیں توازن کے سارے اعضاء اتنے مکمل ہوں کہ آدمی دیکھ کر حیران رہ جائے کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے یعنی ہر ہر چیز اپنے محل پر چسپاں ہوں تو صفت جمیل کا تقاضا یہ ہے کہ ہر چیز اپنے اپنے محل پر صفائی اور ستھرائی سے رہے، جیسے کہ فرمایا گیا کہ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا۔

یعنی گھروں میں داخل ہو تو دروازوں سے داخل ہو۔ یہ نہیں کہ دیوار پھلانگ کر ادھر اُدھر سے داخل ہو۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ہر کام ڈھنگ سے کرو اور ڈھنگ سے کرنا صفت جمال کا تقاضا ہے تو ہر حکم کا تعلق اللہ کی کسی نہ کسی صفت سے ہے۔ اور صفت کا تقاضا ہے کہ ان احکام پر عمل کیا جائے جیسے صفت ہادی کا تقاضا ہے کہ ہدایت پر چلے۔ اور حافظ کا تقاضا یہ ہے کہ تم میں حفظ و امانت پیدا کرے، اور صفت جمیل کا تقاضا یہ ہے کہ ہر کام ڈھنگ سے کیا جائے بے فکری سے نہ کیا جائے۔ اصل میں علم نام اسی چیز کا ہے کہ آدمی احکام جان لے۔

علم اسے کہتے ہیں کہ مسند اور مسند الیہ کی درمیانی نسبت پر مطلع ہو حاکم اور محکوم کے درمیان جو نسبت ہے اس پر مطلع ہو جائے کہ یہ حکم کہاں سے چلا اور اس کی علت کیا ہے۔ یہ فہم اللہ تعالیٰ نے فقہاء کو عطا فرمایا کہ ہر حکم کی علت معلوم کیا۔ اور علت کا رابطہ معلوم کیا کہ کسی نہ کسی صفت ربانی سے ہے۔ ان سب کے جاننے کے بعد پھر احکام کے اندر جواز و عدمِ جواز، استحباب و کراہت قائم کیا

تو نسبت علمی کے علم کا نام علم ہے۔
ورنہ مطلقاً احکام کا جان لینا وہ حفظ ہے۔ اسے مجازاً تو علم کہہ سکتے ہیں ورنہ وہ حقیقتاً حفظ ہے۔

تواضع کی حقیقت

یہاں سے مجلس کا موضوع بدل گیا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بلندی کا تعلق پستی سے ہے اس لئے آدمی جتنا ہی بلند ہو گا اتنا ہی اس کے اندر تواضع ہو گی اس لیئے جتنا ہی اللہ کے سامنے پست ہو گا اتنا ہی بلند ہو گا۔ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ
تواضع کا خاصہ ہے رفعت اور عظمت، تو جو جتنا رفیع المرتبہ ہو گا اتنی ہی اس کے اندر تواضع ہو گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سید البشر ہیں اور اکمل الخلائق ہیں۔ اس لیئے جتنی بھی آپ کی عظمت اور آپ کا احترام ہو وہ کم ہے لیکن تواضع کا غلبہ یہ ہے کہ مجلس میں بیٹھ کر آپ کسی اونچی جگہ کو خود منتخب نہیں کرتے تھے۔ صحابہ اِدھر اُدھر بیٹھے ہیں بیچ میں آپ بھی بیٹھے ہیں یہ اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی۔ کہ جس مجلس میں آپ ہوتے تھے سب سے بلند آپ ہی نظر آتے تھے۔ آپ چلتے تھے تو یہ نہیں کہ مجمع آپ کے پیچھے پیچھے ہے بلکہ کچھ آگے ہیں کچھ پیچھے کچھ دائیں کچھ بائیں اس طرح چل رہے ہیں۔

صحابہ میں بڑی بڑی قدوقامت کے لوگ بھی تھے جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بڑے بڑے دو آدمی اوپر نیچے کھڑے ہوں تو ان کے قد کے برابر ہوتے تھے آواز اتنی بلند تھی کہ ایک میل تک ان کی آواز جاتی تھی، تو بلند سے بلند قامت کے صحابہؓ آپ کے ساتھ ہوتے تھے مگر نظر آپ ہی آتے تھے اور آپ ہی بلند معلوم ہوتے تھے۔ لیکن آپ کا جذبہ یہ تھا کہ اَنَا کَاَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ رل کے چلتے تھے۔ اور جہاں آپ نے دعویٰ فرمایا اَنَا سَیِّدُ الْبَشَرِ وَ اَنَا قَائِدُ

وَاَنَا خَطِیْبٌ وہ امر ہے کہ لوگوں کو مطلع کردو تاکہ نبوت کی عظمت سے لوگ واقف ہوجائیں۔ معاذ اللہ معاذ اللہ یہ کبر نہیں ہے، اسی لئے جہاں بھی ایسا فرمایا کہ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ تو وہاں یہ بھی فرمایا وَ لَا فَخْرَ یعنی میں ابن آدم کا سردار ہوں لیکن فخر نہیں ہے۔

اَنَا اَوَّلُ تَنْشَقُّ مِنْهُ الْقَبْرُ وَلَا فَخْرَ یعنی سب سے پہلے میں قبر سے اُٹھوں گا مگر یہ فخر یہ نہیں کہتا۔ وَبِیَدِیْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَمَنْ دُوْنَهٗ تَحْتَ لِوَائِیْ وَلَا فَخْرَ۔ میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور بقیہ سارا عالم میرے جھنڈے کے نیچے ہوگا۔ لیکن میں یہ فخر یہ نہیں کہتا۔ تو جو اپنی عظمت آپ نے خود بیان فرمائی ہے وہ مامور من اللہ ہوکر بیان فرمائی ہے۔

اس کا حاصل یہ تھا کہ یہ عظمت ہے نبوت کی اور نبوت نبی کے لئے بھی واجب العظمت والامانت ہے جس طرح اُمت کے لئے ہے اسی لئے آپ نے خود بھی اپنی نبوت کی شہادت دی۔ یہی نہیں کہ دوسروں کو مامور فرمایا کہ نبوت کی شہادت دو۔ فرمایا اَشْهَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو نبوت ایک ایسی امانت ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی اس کی عظمت کرتے ہیں اور انعامِ خداوندی جانتے ہیں تو جہاں بھی آپ نے ایسی باتیں بیان فرمائی وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر یا مامور من اللہ ہوکر بیان فرمائی۔ اس میں کبر یا شیخی کا ذرہ برابر بھی دخل نہیں تھا جیسے آپ فرماتے ہیں اَنَا اٰکُلُ کَمَا یَاْکُلُ الْعَبْدُ۔ میں ایسا ہی کھایا کرتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتا ہے۔ زمین پر بیٹھ کر آپ کھانا کھاتے تھے حالانکہ آپ سید ولد آدم ہیں تو جتنی بڑی شخصیت ہوگی۔ اتنی ہی بڑی اس میں تواضع ہوگی۔ اور اس تواضع ہی سے زینہ کھلتا ہے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا۔

ایسا نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے افعال پر اُن کے درجات مرتب ہوتے ہیں اور یہ نبوت کسبی نہیں ہے بلکہ درجات طے شدہ ہیں البتہ ان کا ظہور اسی طرح ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں اُسوہ بیان کرنا ہے امت کے سامنے کہ اگر کوئی بڑا ہو تو کبر نہ کرے اس کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ چھوٹا بن کر رہے۔ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ۔ انبیاء علیہم السلام نے تواضع کے کلمات کہے ہیں: لَا تَنْسَانَا یَا اُخَیَّ مِنْ دُعَائِکَ یَا اُخَیَّ۔ میرے بھائی اپنی دعا میں ہم کو مت بھولنا تو اسمیں امت کے لئے تلقین ہے کہ بڑا اپنے چھوٹے سے کہے کہ بھائی اپنی دعا میں مت بھولنا اس لیے کہ ہر ایک محتاج ہے دوسرے کی دعا کا، تو یہ کمال تواضع ہے اور کمالِ تواضع دلیل ہے کمالِ نبوت کی نبوت کا بھی تقاضا ہے انتہائی تواضع ہو۔

حضرت نانوتویؒ کے بارے میں سُنا کہ تواضع انتہائی تھی راستے میں جا رہے ہیں سلام عرض کیا اور تواضع کی۔ پھر اندیشہ ہوا کہ قلب میں کوئی غرور پیدا ہوا اسلیے کوئی بچہ اگر جا رہا ہے تو اس کی ٹوپی اتار کر چلی ری فرماتے تھے تاکہ دل میں کبر پیدا نہ ہو اور لوگوں کے اندر تملق پیدا نہ ہو یہ جو حدیث میں ہے فاحثوا التراب فِی وجوہ المدّاحین۔ یعنی جو منہ پر تعریف کرے اس کے منہ پر مٹی ڈالدو تو اسمیں گویا دو علاج ہیں۔ مادح کو تملق (چاپلوسی) سے بچانا ہے کیونکہ جب منہ میں مٹی ڈالدیں گے تو وہ خفیف ہو جائے گا اور خوشامد تملق کا جذبہ ہوتا ہے وہ نہیں آئے گا۔ اور ممدوح کو کبر سے بچانا ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کردو۔ جس سے ان کے اپنے اندر کبر نہ آئے مٹی ڈالنے سے خود اپنا کبر نکل گیا کہ آپ کی تعریف کا کوئی اثر مجھ پر نہیں ہے اور مادح کے دل سے خوشامد

پرستی نکل گئی۔ یہ حدیث کا حکم ہے۔

مدّاحین کے منہ میں مٹّی ڈالنے کا عمل اکابرین میں مختلف ہیں؟

اس پر عمل کرنے کے ڈھنگ اکابرین کے مختلف رہے ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ کا عمل یہ تھا کہ حکیم اسماعیل صاحب جو عالم بھی تھے اور اچھے اطباء میں تھے۔ اُنھوں نے حضرت کی شان میں فارسی میں قصیدہ لکھا اور پڑھنے کی اجازت چاہی حضرت نے اجازت دے دی۔ جب وہ قصیدہ پڑھ چکے تو حضرت نے فرمایا کہ اسماعیل ہمارے پاس آؤ۔ جب وہ آئے تو ایک چٹکی میں مٹّی لے کر ان کے منہ میں جھونک دیا، اور فرمایا کہ یہ ظاہر حدیث پر عمل ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ باطنی حدیث پر عمل کرتے تھے جو کوئی تعریف کرتا تو اس کو سُن لیتے۔ پھر بعد میں فرماتے کہ آپ کو کچھ بھی رحم نہ آیا۔ اپنے ایک ضعیف بھائی کو اُلٹی چھری سے ذبح کر دیا، کہ جس کے اندر یہ عیب ہے یہ نقصان ہے یہ کمی ہے۔ بہت سے عیوب بیان کر دیتے۔ یہ سنکر تعریف کرنے والا خود شرمندہ ہو جاتا اس کے دل سے تملق نکل گیا۔ اور ان کے دل میں کوئی کبر نہیں آیا۔ یہ باطنی حدیث پر عمل تھا۔ ظاہری طور پر مٹّی تو نہیں ڈالی۔ لیکن جو مقصد حدیث ہے اس کو پورا کر دیا۔ اپنے بزرگوں سے مولانا شہید اسمٰعیلؒ کا عمل یہ سُنا ہے کہ میرٹھ میں تشریف لائے اور شیخ الٰہی بخش جو کہ لکھ پتی تھے۔ وعظ کے بعد اُنھوں نے بڑی عقیدت سے جُھک کر مصافحہ کیا۔ تو مولانا شہیدؒ نے انگوٹھا دکھا دیا۔ شیخ الٰہی بخش کہنے لگے کہ حضرت آپ ہماری عقیدت کا امتحان لینا چاہتے ہیں اگر بازار میں ہم کو جوتیاں بھی ماریں گے تو ہماری عقیدت میں فرق نہیں آئے گا۔ یہ بھی حدیث پر عمل تھا۔ کہ مٹّی تو نہیں ڈالی لیکن مٹی سے زیادہ مٹّی ڈالدی اور خود

شرمندہ ہوگئے۔ مطلب یہ تھا کہ منہ پر ایسی تعریفیں مت کرو۔

اور اس میں حضرت نانوتویؒ کا طریق یہ تھا کہ جب اُنھوں نے دیکھا کہ ایک شخص اب میری تعریف کریگا تو بات کاٹ کر ادھر اُدھر چلے گئے اور دوسرا مسئلہ چھیڑ دیا پھر دیکھا کہ کوئی تعریف کرنا چاہتا ہے تو ادھر ادھر پھر گئے وہ تعریف کی نوبت ہی نہیں آنے دیتے تھے۔ ان حضرات کے یہاں دفع تھا۔ اور حضرت نانوتویؒ کے یہاں رفع تھا کہ تعریف کو آنے ہی نہ دوسرے سے۔ کہ دفع کرنے کی ضرورت پڑے۔ یہ اسی کی شاخ ہے کہ جتنا ہی کوئی بڑا ہوگا۔ اتنا ہی اپنی تعریف سے بچے گا۔ وہ نوبت ہی نہ آنے دیگا۔ لیکن اگر نوبت آجائے تو ایسی تدبیر کرے گا کہ دوسرے کے دل سے وہ جذبہ نکل جائے۔ اور اپنے دل میں کبر کا جذبہ نہ آنے پائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض مقصد پر عمل کرتے تھے۔ اور بعض ظاہری حدیث پر۔ محدثین کا طریقہ یہ ہے کہ ظاہر حدیث پر عمل ہو۔

اور فقیہہ النفس کا طریقہ یہ ہے کہ باطن حدیث پر عمل ہو۔ فقہاء بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ محض الفاظ پر نہیں چلتے۔ بلکہ الفاظ کے تحت جو مقصدِ شریعت ہے اس کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ لیکن ظاہر پر عمل کر لیا کہیں باطن پر وہ دیکھتے ہیں علت کیا ہے اس علت کو سامنے رکھتے ہیں جب تک اُسوہائے اکابر سامنے نہ ہوں اس وقت تک عمل کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ اکابر اہل اللہ کے اُسوہائے عمل اور نمونہ ہائے عمل جب تک سامنے نہ ہوں عمل کرنا مشکل ہے۔ اس سے اوامرِ شریعت کے حقائق کھلتے ہیں، اور عمل کا ڈھنگ بھی پیدا ہوتا ہے۔

حکیم الاسلام کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کا عمل

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عام عادت تھی کہ تھوڑی سی تکلیف پر ہائے ہائے کرتے تھے۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوتا

تھا کہ کوئی بڑی تکلیف ہو تو ٹھیک مثلاً نزکام ہوگیا اور ہائے ہائے شروع کر دیتے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بڑی تکلیف ہو اور بعض مرتبہ بڑی بڑی تکلیف پر بھی ساکت وصامت رہتے تھے۔ مگر عام حالت یہ تھی کہ ہائے ہائے کرتے تھے۔

مجھ سے ایک مرتبہ صبر نہ ہو سکا معمولی نزکام تھا اور کچھ حرارت تھی ہم لوگ پیر دبا رہے تھے۔ اور ان کے یہاں ہائے ہائے ہو رہی تھی۔ اُن کا رعب بہت غالب تھا اور ہم لوگ بہت ڈرتے تھے۔ مگر میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ ابا جی! یہ تو تسلیم و رضا کے خلاف معلوم ہو رہا ہے کہ ذرا سی تکلیف آئی اور آپ نے بہت زیادہ شور مچا دیا۔ ہنس کر کہنے لگے کہ نالائق ہم کو نصیحت کرنے آئے ہو، بیٹھ جاؤ میں بیٹھ گیا۔ فرمایا کہ میں نے بہت سے بزرگوں کو دیکھا ہے لیکن تین ایسے بزرگ ہمارے سامنے تھے کہ ان کو صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی میرے سامنے ہے۔

حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا اظہارِ عبدیت

ایک تو حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ ان کے یہاں یہ معمول تھا کہ تھوڑی سی تکلیف آئی تو کراہنا کراہنا، اور ہائے ہائے بہت زیادہ کرتے تھے تو کسی نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو بظاہر تسلیم و رضا کے خلاف ہے اور بے صبری کا اظہار ہے۔ تقدیراتِ الٰہیہ پر صبر ہونا چاہیئے۔ یہ تو خلاف معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے اللہ کے سامنے بہادر بنوں اور باور کراؤں کہ میں بڑا طاقت ور ہوں۔ مجھے آپ جس ابتلاء میں ڈالیں گے اس کو اٹھا لوں گا بلکہ میں اپنے ضعف کا اظہار کرتا ہوں کہ اے اللہ! میں ابتلاء کے قابل نہیں ہوں۔ میرے اندر طاقت ہے ہی نہیں آپ تو مجھے بلا ابتلاء اور آزمائش ہی کے بخش دیں تو میں اپنی فروتنی اور عجز و نیاز پیش کرتا ہوں۔ اور فرمایا کہ اپنی فروتنی

اور عجز و نیاز کا اظہار کرنا، یہی ہے عبدیت، تو عبدیت یہی ہے کہ آدمی اپنی عجز اور بیچارگی کو ظاہر کرے کہ میرے اندر کوئی طاقت نہیں ہے۔

حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کا اظہار عبدیت

اور فرمایا کہ دوسرے بزرگ میرے والد ماجد یعنی حضرت نانوتویؒ ان کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ بلکہ ان کی زندگی میرے سامنے ہے۔ ان کے یہاں معمول یہ تھا کہ بڑی سے بڑی تکلیف آتی مگر پتہ ہی نہیں دیتے تھے کہ کوئی تکلیف آئی تھی آپ تحمل کرتے تھے۔ مہینوں کے بعد کبھی فرماتے کہ فلاں تکلیف آئی تھی تو معلوم ہوتا کہ بڑی شدید تکلیف تھی ظاہر نہیں کرتے تھے اور فرمایا کہ ہر چہ از دوست می رسد نیکو است، یعنی اللہ کی طرف جو کچھ آئے آدمی صبر رضا سے کام لے۔ بیماری آئے تو صبر کرے کوئی دوسری مصیبت آئے تو صبر کرے اور فرمایا کہ یہی ہے عبدیت۔ ان کے یہاں اظہار عبدیت کا یہ طریقہ تھا۔ یعنی تسلیم کہ جو کچھ اُدھر سے آئے وہی میرے لیے حکمت ہے تو یہاں ہائے ہائے نہیں تھی بلکہ رضا و تسلیم سے گردن جُھکا دیتے تھے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کا اظہار عبدیت

اورؒ فرمایا کہ تیسرے مولانا گنگوہیؒ ہیں جو میرے مربی بھی ہیں اور اُستاذ بھی، وہاں یہ تھا کہ تھوڑی سی تکلیف آتی تو ہائے وائے کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ دوا کا اہتمام ہوتا۔ طبیب کو بُلاؤ۔ ڈاکٹر کو بلاؤ دوا دو۔ پھر غذا کیا ہوگی۔ پرہیز کیا ہوگا۔ ڈاکٹر آرہے ہیں۔ اطبا آرہے ہیں تو لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو بظاہر توکل کے خلاف ہے کہ تھوڑی سی بیماری آئی اور اس کے دفعیہ کے لئے آدمی اتنا اہتمام کرے کہ انتہا کر دے۔ اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَتَوَكَّلُوْا عَلَیْہِ۔ یہ تو توکل کی شان کے خلاف ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ بدن سرکاری مشین ہے اس کے

مالک ہم نہیں ہیں بلکہ مالک حق تعالیٰ شانہٗ ہیں البتہ اس کی حفاظت ہمارے اوپر فرض ہے یہ امانت ہے اس کی حفاظت کرو تاکہ خیانت نہ ثابت ہو۔ بندہ جب بیمار ہو تو طریقہ سنت یہ ہے کہ علاج کرو تاکہ سرکاری مشین کی حفاظت ہو سو اور ہمارے ذمہ حفاظت ہی کرنا فرض ہے اور فرمایا اتباع سنت ہی اصل عبدیت ہے۔ تو عبدیت کے ان کے یہاں یہ معنیٰ تھے پھر والد صاحب فرمانے لگے کہ میں نے ان تین بزرگوں کو دیکھا ہے۔

بعض ہائے ہائے کرتے جیسے حاجی صاحبؒ اور بعض سکوت کرتے، جیسے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور بعضے دفعیہ کے لئے تدارک کرتے تاکہ اتباع سنت ظاہر ہو۔ تو ایک جگہ اظہار عجز ہے اور ایک جگہ تفویض ہے اور ایک جگہ اتباع سنت ہے۔ یہ ساری چیزیں عبدیت ہیں تو فرمایا کہ میں بیماری میں کبھی اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحبؒ کی اتباع کرتا ہوں تھوڑی بیماری میں ہائے ہائے کرتا ہوں تاکہ میرا عجز ظاہر ہو جائے۔ اور بعض مرتبہ اپنے والد بزرگوار کے نمونہ پر عمل کرتا ہوں کہ بڑی سے بڑی بیماری میں پتہ تک نہیں دیتا تاکہ تفویض واضح ہو جائے۔

اور بعض مرتبہ علاج کے اندر تھوڑا سا غلو کرتا ہوں اور اہتمام کرتا ہوں تاکہ اپنے اُستاذ حضرت گنگوہیؒ کے اُسوہ پر عمل ہو اس کے بعد ہم کو معلوم ہوا اور بات کھلی کہ یہ ہے قصہ بہرحال عبدیت کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک تو ظواہر سنت کا اتباع کرنا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ اس کی علت کیا ہے حکم ہے کرنے کا اس لیے کرتے ہیں اور یہی عبدیت ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی سر اور علت اور راز معلوم کر کے اس پر چلو اور یہ فقہ باطن ہے یہ بھی اتباع سنت ہے اور بعض دفعہ اظہار عجز ہے یہ بھی اتباع سُنّت ہے

فرمایا کہ مختلف بزرگوں کے مختلف نمونوں پر، مختلف اوقات میں عمل کرتا ہوں۔
ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرتؒ کو سخت دورہ پڑا۔ سردی کا زمانہ تھا مگر کسی کو اطلاع نہیں دی۔ ہمارا بچپن تھا۔ والدہ مرحومہ کے سامنے جب اس واقعہ کا ذکر آیا تو کہا کہ آپ نے مجھے کیوں نہ اٹھالیا۔ بس بگڑ گئے اور فرمایا کہ یہ تمہارے ساتھ مشغول ہونے کا وقت تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ہمارا آخری وقت ہے تو ایسے وقت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا۔ یا تمہاری طرف متوجہ ہوتا۔ میں نے توجہ الی اللہ کی اور ذکر شروع کردیا کہ شاید یہ وقت اخیر ہو۔

چنانچہ حیدر آباد میں یہی ہوا کہ جب لوگ مایوس ہوگئے اور حالت آخری ہوئی۔ تو بعض لوگوں نے کہا کہ کیا طیب اور طاہر کو تار دے کر بلالیں۔ فرمایا... ہرگز نہیں۔ کیا یہ طیب و طاہر میں مشغول ہونے کا وقت ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کا وقت ہے۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ ان بزرگوں کے عمل کے رنگ مختلف ہیں۔ لیکن مقصد ایک ہی ہے۔ اکابر اہل اللہ کے عمل کے ڈھنگ الگ ہیں۔ مگر سب میں اخیر میں آکر یہی اتباع سنت اور اتباع شریعت نکلتی ہے۔ ظاہر میں عمل کے نمونے مختلف ہیں۔ واقعی اندازہ یہ ہوا کہ جب تک اہل اللہ کا طرز عمل سامنے نہ ہو کہ مختلف اوقات میں کیا ڈھنگ اختیار کرتے تھے۔ محض اپنے عقلی گھوڑے دوڑانے اور محض اپنی رائے سے اصل بات کھلتی نہیں نمونہ سامنے آنے سے کھلتی ہے۔

علماء دین انتظام شریعت کے ذمہ دار ہیں

یہاں تک بیان فرمانے کے بعد ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے متعلق سنا گیا کہ آپ نے حضرت حاجی

امداد اللہ صاحبؒ کی شان میں بعض سخت الفاظ کہے تھے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟
حضرت نے فرمایا کہ آپ نے کوئی گالی نہیں دی۔ واقعہ یہ تھا کہ کوئی حق مسئلہ آیا تو حضرت حاجی صاحبؒ کے یہاں توسّع تھا کیونکہ مشیخت کا غلبہ تھا فقہ تو تھا نہیں، اگر کوئی میلاد کے بارے میں معلوم کرتا تو فرماتے کہ پڑھ لو اگر کسی نے قیام کر لیا تو فرمایا کرنے دو تعظیماً کر رہا ہے۔ تو ان کے یہاں توسّع تھا اور فقہاء کے یہاں تضییق ہے اگر وہ بدعت ہے تو اس کو روکو۔

حضرت گنگوہیؒ کے اوپر فقاہت کا غلبہ تھا۔ اس لیے جب حضرت حاجی صاحبؒ کا رسالہ آیا تو فرمایا کہ اسے حمّام میں جھونک دو۔ کسی نے کہا کہ اپنے شیخ کا رسالہ حمّام میں جھونک رہے ہیں۔ فرمایا کہ شیخ کے ہاتھ پر ہم نے جو بیعت کی ہے وہ تصوّف میں کی ہے۔ فقہ میں نہیں کی ہے فقہ میں وہ ہمارے تابع ہیں۔ یہ واقعہ ہے جس کو لوگ سخت بات کہتے ہیں مگر یہ اصول کی بات ہے کوئی گالی تو تھی نہیں۔

جب فقہ کا مسئلہ آئے تو "دریں جا محمد ابن شیبانی می باید" اور جب تصوّف کا مسئلہ آئے تو "دریں جا شبلی و بایزید می باید" یہ تو حدود ہیں لہٰذا ہر حد میں جو اس فن کا ماہر ہوگا اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

فقہ میں حضرت گنگوہیؒ کا بڑا اونچا مقام ہے۔ سنت و بدعت کے امتیاز میں وہ سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی لئے فرمایا کہ اس کو حمّام میں جھونک دو۔ مطلب یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے یہ نہ آئے ورنہ اس سے لوگ حجت پکڑ کر سیکڑوں بدعات کریں گے۔ اگر بادشاہ سپاہی کو انڈے کی اجازت دیدے تو لوگوں کے مُرغے بھون بھون کر کھاجائیں گے۔ اس لئے یہیں سے روکنا چاہیئے۔ یہ ہے نظمِ شریعت۔ لہٰذا نظام شریعت کی برقراری کی ذمہ داری

علماء اور فقہاء کے ذمہ عائد ہوتی ہے۔ لیکن حضرت حاجی صاحبؒ نے جو فرمایا وہ اپنے حالات کے مطابق فرمایا۔ اور کسی کا حال کسی کے لئے حجت نہیں ہوتا... سب کے لیے جو یکساں حجت ہے وہ شریعت ہے ہر شخص کے لئے یکساں پیغام ہے۔

شریعت اور طریقت میں فرق

تو شریعت اور طریقت میں فرق یہی ہے کہ شریعت نام ہے قانون کُلّی کا جو ہر شخص کے لیے یکساں پیغام ہے۔ مگر حال صرف صاحبِ حال ہی کیلئے حجت ہے وہ مستغرق رہے اپنے حال میں۔ لیکن دوسروں کے لئے حجت نہیں ہے اور طریقت نام ہے شخصی احوال کا۔

بعض دفعہ ان حضرات صوفیاء سے غلبۂ حال میں ایسی چیزیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ جو جواہر شریعت کے خلاف ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان پر نکیر کی جائے یہ غلط ہے وہ اپنے حال میں ہیں اور ان کا حال محمود ہے۔ البتہ لوگوں کو بچایا جائے کہ تم صاحبِ حال نہیں ہو تم قانون پر چلو یہ شخصی حال ہے یہ تمہارے لیے حجت نہیں ہے ان کی عظمت باقی رکھو قلب کے اندر، مگر تم قانون پر چلو۔ جب تم بھی صاحبِ حال بن جاؤ گے تو مستثنیٰ ہو جاؤ گے، حال غالب نہ ہو اور نقالی کرے اہلِ حال کی وہ انجام کار ہلاک میں پڑے گا۔

مثلاً کوئی بزرگ بیمار ہیں۔ بیماری میں نماز بیٹھ کر پڑھیں۔ اور مریدین بھی بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیں کہ شیخ بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں تو یہ ہلاکت ہے پہلے وہ بیماری کا حال اپنے اندر پیدا کر د پھر تمہیں اجازت ہو گی بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اگر نقالی کرو گے تو رسول پیغمبرؐ کی نقالی کی جائے گی۔ جو قانون شریعت ہے۔ اگر حال غالب ہو تو تم جانو اور تمہارا اعمال جانے ہم تم پر ملامت نہیں کرتے

تو بعض دفعہ غلبۂ حال میں کچھ وجدی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں ان پر نکیر نہیں کرنا چاہیئے۔ انھیں معذور سمجھنا چاہیئے۔ اور لوگوں کو بچانا چاہیئے۔ کہ تم صاحبِ حال نہیں ہو اور جب تک صاحب حال نہ بنو تمہارے لیے جائز نہیں ہے ان کا حال الگ ہے۔

مولانا فخر نظامیؒ کی حکایت

مولانا فخر نظامیؒ بہت بڑے اولیاء میں گزرے ہیں پندرہ ۱۵ برس کی عمر میں وہ مقامِ ولایت پر پہنچ گئے تھے۔ ڈاڑھی بھی نہیں آئی تھی۔ بڑے حسین وجمیل تھے۔ حتیٰ کہ کرامت اور خوارق کا ظہور بھی ہونے لگا۔ وہ دہلی کی جامع مسجد میں جب نماز کو جاتے تو سیکڑوں شہدے ان کو دیکھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ ادھر بھی کھڑے اُدھر بھی کھڑے۔ مولانا فخر نظامیؒ نے جب ادھر نگاہ ڈالی تو لوگ گرتے چلے گئے اور اُدھر نگاہ ڈالی تو لوگ گرتے چلے گئے، فرماتے کہ اور مجھے گھورو کم بختو تو بچپن ہی میں ان کو ولایت نصیب ہو گئی تھی اور صاحبِ حال لوگوں میں سے تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص ان کے متوسلین میں سے آیا اور عرض کیا کہ حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھوں، ترکیب بتا دیں فرمایا کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ وہ بیچارہ حیران ہو گیا کہ فرض نماز چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ اس سے تو قرب مع اللہ نصیب نہیں ہوتا ہے یہ تو قانونِ شریعت کے خلاف ہے کہ فرض ترک کیا جائے اس نے عمل نہیں کیا اس کی جرأت نہیں ہوئی۔ مگر جو دل میں بات ہوتی ہے وہ نکلتی نہیں۔ چند دن کے بعد پھر سوال کیا۔ حضرت فخر نظامیؒ نے یہی فرمایا کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی لیکن ایک رات ایسا کیا کہ صرف اوراد ماثورہ پڑھ پڑھا کر سو گیا نماز فرض تو پڑھا مگر سنتیں

چھوڑ دیں۔ اور نیت یہ کہ اخیر شب میں اُٹھ کر وغیرہ وتر وغیرہ پڑھ لوں گا تو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی میں نے کیا قصور کیا تھا کہ ہماری سنتیں چھوڑ دیں وہ جلدی سے گھبرا کر اُٹھے اور وضو کیا اور سُنتیں پڑھیں اور توبہ واستغفار کیا۔ پھر صبح کو حضرت فخر نظامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا فخر نظامیؒ نے پوچھا کہ کیا بات ہے کہا کہ حضرت! میں نے فرض نماز چھوڑنے کی جرأت نہیں کی صرف سنتیں چھوڑ دی تھیں اور یہ خواب دیکھا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر فرض نماز چھوڑتا تو حق تعالیٰ خواب میں آتے اور کہتے کہ پڑھ پڑھ۔

اب ایک مشکل مسئلہ سامنے آگیا کہ اگر مولانا فخر نظامیؒ کے قول پہ عمل کیا جائے تو شریعت چھوٹتی ہے اور اگر شریعت پر عمل کیا جائے تو شیخ کا حکم چھوٹتا ہے تو یہاں سے دو راستے پیدا ہوتے ہیں اور دونوں ہلاکتوں کے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آدمی شیخ کا حکم سُن کر شیخ پہ نکیر کرے کہ اصل چیز قانونِ شریعت ہے ہم نہیں جانتے کون ہیں فخر نظامی! ہم ان کے قول پر عمل نہیں کر سکتے۔ غلط کہا انھوں نے۔ یہ راستہ ہلاکت کا ہے کہ اہل اللہ کی شان میں گستاخی کی جائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان کے اعتقاد میں ڈوب کر یہ کہے کہ ہم نہیں جانتے شریعت کیا ہے۔ ہمارے شیخ یہی قرآن ناطق ہیں جو اُنھوں نے کہہ دیا وہی حق ہے ہم اس پر عمل کریں گے، سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید، غرض شیخ نے کہدیا ہم وہی کریں گے ہم نہیں جانتے۔ قرآن وحدیث میں کیا ہے اصل قرآن وحدیث یہی ہیں۔ یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے۔ بزرگوں کی عظمت میں آدمی کتاب و سنت کو چھوڑ دے۔ اور معاذ اللہ لایعنی قرار دیدے یہ بیچ کا راستہ

اعتدال کا ہے وہی حق ہے اور اسمیں ہدایت ہے یہ بیان کیا حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے اور اس کے راوی حضرت تھانویؒ ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہی مضمون فرمار ہے تھے حضرت حاجی صاحبؒ کہ ہلاکت کے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ اہل اللہ کی محبت میں غرق ہو کر کتاب و سنت کو چھوڑ دے۔ ایک یہ کہ کتاب و سنت کا نام لے کر اہل اللہ کی توہین و استخفاف کرے یہ دونوں تباہی کے راستے ہیں۔ حق راستہ یہی ہے کہ قرآن و سنت کا دامن ہاتھ میں رہے۔ اور اہل اللہ کا دامن بھی ہاتھ میں رہے۔

اسی پر یہ واقعہ حضرت حاجی صاحب نے سُنایا اور فرمایا کہ وہ بیچ کا راستہ کون سا راستہ ہے وہ یہ ہے کہ شیخ پر ملامت بھی نہ ہو اور کتاب و سنت کا دامن بھی نہ چھوٹے۔

پہلے اس کی ایک تمہید ارشاد فرمائی کہ اہل اللہ اور سالکین دو طریقے کے ہوتے ہیں۔ بعض تو وہ ہیں کہ اپنی محنت سے اور ریاضت کر کے درجات طے کرتے ہیں اور مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور بعض وہ ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی طرف سے منتخب کر لیا جاتا ہے کہ فلاں مقام پر پہنچانا ہے اگر وہ عمل نہیں کرتے ہیں تو اتالیق مقرر کیئے جاتے ہیں کہ زبردستی عمل کرائیں اور اس مقام پر پہنچائیں تو بعض منتخب شدہ ہیں جن سے عمل کرایا جاتا ہے تاکہ اس مقام پر پہنچ جائیں۔ اور بعض اپنی محنت سے پہنچتے ہیں۔ اور فرمایا کہ اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک سپاہی دیانت داری سے کام کرے۔ افسروں نے دیکھا کہ بڑا دیانت دار ہے اسے ہیڈ بنا دیا، اس نے پھر دیانت داری سے کام شروع کیا تو اس کو انسپکٹر بنا دیا۔ اس نے پھر پوری دیانت سے کام کیا، تو سپرنٹنڈنٹ پولیس بن گیا، اس نے اور زیادہ دیانت داری میں محنت کی تو کپتان پولیس بن گیا

پھر دیانتداری سے کام کیا تو وزیر پولیس بن گیا جو پولیس کا انتہائی مقام ہے۔ اور یہ اپنی محنت سے چلا، اور انتہائی مقام پہ پہنچ گیا۔

ایک وہ ہے جو شاہی خاندان سے ہے اور بادشاہ خود منتخب کرے کہ اس کو ولی عہد بنانا ہے۔ اب وہ بھاگتا ہے، تو اس کے پیچھے استاذ لگا دیتا ہے کہ اس کو پڑھاؤ کسی طرح چلاؤ، وہ چلنا نہیں چاہتا مگر اس کو زبردستی چلا رہے ہیں۔ یہاں تک ولی عہد کے مقام پر پہنچ گیا۔ اور گدی نشینی کی رسم ادا ہوگئی۔ تو دو قسم کے لوگ ہوئے جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے۔ ایک دم آپ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کس چیز نے آپ کو ہنسایا فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ بعضے لوگ جنت میں جانا نہیں چاہتے مگر ان کے پیروں میں زنجیر باندھ کر کھینچا جا رہا ہے کہ چلو جنت میں۔ وہ اسی مقام کی طرف اشارہ تھا کہ وہ منتخب پہلے سے ہو گئے ہیں مگر محنت نہیں کرتے اس لیے محنت کرا کے ان کو پہنچایا جا رہا ہے۔

فرمایا کہ یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاح میں جو لوگ اپنی محنت سے آگے بڑھتے ہیں ان کو مرید کہا جاتا ہے۔ اور جو پہلے منتخب کر لیے جاتے ہیں ان کا لقب ہے مراد، اور قرآن کریم کی یہاں دوسری اصطلاح ہے جو مریدین ہیں یعنی محنت سے پہنچتے ہیں ان کا لقب ہے مُنیب۔ یعنی انابت الی اللہ کرتے کرتے مقام پر پہنچ گئے۔ اور جو اُدھر سے منتخب کر لیے جاتے ہیں اُن کا لقب ہے مُجتبیٰ۔ جیسے کہ فرمایا گیا ہے۔ اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ ۝ جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے اور جو محنت اور کوشش کرتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے وہ پہنچ جاتا ہے۔

بس یہ واقعہ سنا کر فرمایا کہ یہ جو مرید آیا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے حق تعالیٰ کی

زیارت ہو جائے تو مولانا فخر نظامیؒ سمجھ گئے کہ یہ مرید نہیں۔ بلکہ مُراد ہے یہ منجانب اللہ ہے منتخب ہے، یہ شریعت سے نکل نہیں سکتا۔ اس لیے فرمایا کہ فرض نماز چھوڑ دے۔ اگر یہ چھوڑے گا تو اُدھر سے مدد ہوگی اور پڑھوائیں گے۔

یہ معاذ اللہ! شریعت کا معارضہ مقصد نہیں تھا کیونکہ ترک صلوٰۃ سے دیدار نہیں ہوتا۔ بلکہ بُعد ہوتا ہے۔ وہ اس شخص کی حالت سے جان گئے تھے کہ وہ مُرید نہیں بلکہ مراد ہے۔ اسلیے یہ ترکیب بتلائی جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو مولانا فخر نظامیؒ کے اوپر سے ملامت ختم ہوگئی اور کتاب و سنّت کا دامن ہاتھ میں رہا۔ تو اعتدال کا راستہ یہی ہے کہ کتاب و سنت پر چل کر اہل اللہ سے کوئی بدگمانی نہ ہو۔ اگرچہ بظاہر کوئی وجدی حرکت خلافِ شریعت معلوم ہو۔ اس کے اندر کوئی راز ہوگا۔ اور ان کی عظمت میں غرق ہو کر کتاب سنت کو نہ چھوڑے کیونکہ وہ حال ہے اور حال میں بعضے چیزیں خلاف شرع ہوتی ہیں۔ مگر آدمی ان کو سمجھ نہیں سکتا۔

جیسے مبتدع کہتے ہیں کہ عاشق رسول بن جاؤ اور جو کچھ چاہو کرتے جاؤ یہ بھی تباہی کا راستہ ہے اور ایک خشک قسم کا مولوی ہے وہ سنت پر جما ہوا ہے ذرا سی کوئی چیز خلاف معلوم ہوئی۔ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے، ہوگا کوئی بزرگ اپنے گھر کا میرے دل میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ بھی تباہی کا راستہ ہے تو نہ خشک قسم کا مولوی بنے اور نہ تر قسم کا صوفی بنے کہ بہہ جائے بلکہ اعتدال کا راستہ اختیار کرے۔ وہی ہے امرِ حق اور وہی ہے ہدایت کا راستہ۔

حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ نرا نجدی آدمی نہ بنے بلکہ وجدی بھی بنے اور محض وجدی ہونا کافی نہیں تھوڑا سا نجدی بھی بنے۔ اشارہ اس طرف تھا کہ کتاب و سنت نہ چھوٹیں قواعد شریعت ہاتھ میں رہیں عمل انھیں کے حکم پر چلے اگر وجدی ہوگا تو اہل اللہ کا احترام بھی کرے گا۔ اگر اہل اللہ کا ادب اور احترام

کرے گا تو ان کو معذور سمجھے گا کہ کوئی راز ہے۔ جو مجھ پر نہیں کھلا۔ پھر وہ توہین کے درپے نہ ہوگا اور کہے گا کہ ان کا حال ہے وہ جانے اور اللہ جانے۔ معلوم ہوا کہ ہدایت کا راستہ بھی درمیانی ہے۔

اور جب اہل اللہ کے اُسوے اور نمونے سامنے نہ ہوں تو اسی خرابطے میں آدمی رہتا ہے کہ ذرا خلاف دیکھا تو گردن پر لے لیا، یا کافر یا فاسق کہنا شروع کر دیا یہ تباہی کا راستہ ہے اور بزرگوں کی محبت میں غرق ہو کر عمل کرنا یہ شخصیت پرستی ہے۔ یہ بھی تباہی کا راستہ ہے، راستہ اعتدال کا بہتر ہے ان کے عمل کے بارے میں معذور سمجھے گا۔ جب کتاب وسنت کے احکام بھی اُس کے سامنے ہوں گے، اور اُن کے حالات بھی سامنے ہوں گے تو کتاب و سنت پر محض نجدی ہو کر نہیں چلے گا۔ بلکہ اپنے اندر وجدی شان بھی رکھے گا۔ اور جب یہ شان پیدا ہو جائے گی۔ تو اعتدال پیدا ہو جائے گا۔ موسیا آداب جاناں دیگر اند،

ایک تو وہ حضرات ہیں جو سوختہ جاں ہیں۔ وہ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں یہ دونوں راستے شریعت ہی کے ہیں۔ ایک جماعت باطن پر چل رہی ہے اور ظاہری شریعت بھی ہاتھ میں ہے۔ اور ایک جماعت ظاہری شریعت پر چل رہی ہے مگر بزرگوں کا ادب واحترام بھی ہاتھ میں ہے۔ دونوں کو جوڑنے کی ضرورت ہے توڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ یہ راستہ الگ ہے اور وہ راستہ الگ ہے بہت بڑی غلطی ہے۔ اسی لیے جو حضرات مغلوب الاحوال ہیں اور باطن پر چل رہے ہیں ان کو معذور سمجھنا چاہیئے۔

مجلس نمبر ۵

۳ رمضان شریف ۹۴ھ مطابق ۲۰ ستمبر ۱۹۷۴ء

★ اللہ تعالیٰ کی مغفرت تامہ پر ایک شبہ کا خطرہ ★

سوال :- یہ ہے کہ قارون کے بارے میں فرمایا گیا کہ اے موسیٰ! اگر ایک مرتبہ بھی قارون مجھ سے فریاد کرتا تو میں اس کی فریاد سن لیتا اور اس کو بچا لیتا یعنی عین عذاب کے وقت مغفرت کا وعدہ ہے۔ اور قوم یونس علیہ السلام کے ایمان کو عذاب کے وقت قبول کر لیا گیا اور عذاب ہٹا لیا گیا مگر فرعون کے ایمان کو عذاب کے وقت قبول نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ کیا ہے اللہ تعالیٰ کی مغفرت تامہ کا ظہور ظاہر اسی وقت معلوم ہوتا کہ فرعون جیسے گنہگار کے ایمان کو قبول کر لیا جاتا۔ اگر فرعون کے ایمان کو اس لیے قبول نہیں کیا گیا کہ اس نے عین عذاب کے وقت ایمان قبول کیا تھا تو قارون کو عذاب کے وقت بچانے کا وعدہ اور قوم یونسؑ کو عذاب کے وقت بچانا اور ان کے ایمان کو قبول کرنا اس کا مطلب کیا ہوگا۔؟

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ قانون شریعت یہ ہے کہ فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا یعنی اس وقت کا ایمان قبول نہیں ہے کہ جب ہمارا عذاب سامنے آجائے، اور عالم غیب منکشف ہو جائے اس لیے کہ ایمان بالغیب مقبول ہے ایمان بالمشاہد مقبول نہیں ہے۔ یعنی جب آنکھ سے آدمی کوئی چیز دیکھ لے تو اُسے ایمان نہیں کہتے مثلاً اٰمَنْتُ بِاَنَّ الشَّمْسَ طَالِعَةٌ۔ یعنی میں ایمان لایا کہ سورج طلوع ہو رہا ہے اس کو ایمان نہیں

کہتے۔ یا آنکھ سے دیکھ کر یا کان سے سُنکر ایمان لائے یہ محسوسات ہیں ان کو ایمان نہیں کہتے بلکہ ایمان بالغیب معتبر ہے وہ یہ ہے کہ نہ یہ چیزیں آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہیں نہ کان سے سُنی جا سکتی ہیں۔ نہ عقل سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ یہ چیزیں حسّی ہیں۔

ایمان کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اطلاع پر اعتماد کر کے مانا جائے۔ مثلاً جنّت و نار و فرشتوں کا وجود، پل صراط، میزان اور قیامت وغیرہ تو یہ ساری چیزیں نہ عقل سے مدرک ہوتی ہیں نہ محسوسات سے۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام کے فرمانے پر اعتماد کر کے ان کو مانا جاتا ہے۔ اور یہ غائب ہیں لیکن جب یہ چیزیں سامنے آگئیں تو ایمان بالغیب نہ رہا کیونکہ قیامت میں جب کفّار جنّت و جہنّم کو دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے۔ مگر اس وقت کا ایمان قبول نہیں ہوگا کیونکہ وہ ایمان بالغیب نہیں ہوگا۔ بلکہ ایمان بالمشاہدہ ہوگا اور وہ غیر مقبول ہے۔

فرعون ایمان اس وقت لایا جب غرغرے کی حالت تھی۔ میکائیل علیہم السلام سامنے ہیں اور ملائکہ بھی سامنے آگئے تو وہ ایمان نہ رہا یہ تو مشاہدہ ہوگیا۔ تو فرعون کے اوپر سے عذاب اسلیئے نہیں ٹلا کہ اس نے ایمان قبول ہی نہیں کیا تھا۔ اور قبول بھی کیا تو غرغرہ کے وقت جس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسلیئے اس سے پہلے نو آیتیں (نشانیاں) موسیٰ علیہ السلام نے دکھائیں اور جب جب وہ عذاب آتا تو وعدہ کرتا کہ دُعا کیجئے عذاب ٹل جائے میں ایمان قبول کر لوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام دُعا فرماتے اور عذاب ٹل جاتا۔ مگر وہ ایمان نہ لاتا۔ تو نو دفعہ ایسا ہی ہوا۔ لہٰذا اس کی بات کا اعتبار نہیں اور اگر اعتبار بھی کیا جائے تو وہ دنیا کا عذاب نہیں تھا۔ بلکہ آخرت کا تھا۔ اور آخرت کے منکشف

ہونے کے بعد ایمان کا محل ہی نہیں باقی رہتا تو یہاں عذاب ہٹایا نہیں، اور قوم یونس علیہ السلام سے عذاب اسلیے ہٹالیا گیا کہ وہاں عذاب آیا ہی نہیں تھا صرف کچھ آثار نمایاں ہوئے تھے۔ پھر قوم یونس علیہ السلام ایمان لے آئی کہ یونسؑ صحیح کہتے تھے انھوں نے رجوع اور توبہ کی اور ایمان لے آئے تو آثار سے وہ سمجھ گئے کہ معلوم ہوتا ہے عذاب آئے گا۔ ان کا وعدہ سچا ہے ان آثار کو دیکھ کر ان کے کچھ سمجھ میں آگیا پھر انھوں نے رجوع کیا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم غلطی میں مبتلا تھے اور اب وہ غلطی کھل گئی کیونکہ آثار سامنے آگئے تو عذاب نہیں آیا تھا۔ بلکہ آثار نمایاں ہوئے تھے جیسے بادل کو دیکھ بارش آنے کا یقین ہو جائے اسی طرح سے یہاں ہوا۔

رہا قارون کے بارے میں اولاً یہ تو اسرائیلی روایت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا ورنہ حدیث میں تو نہیں ہے لیکن ایسا ہو بھی تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر عذاب آنے سے پہلے ایک مرتبہ بھی قارون مجھ سے فریاد کرتا تو میں اس کی فریاد سُن لیتا۔ یہاں پر عذاب آنے اور آخرت منکشف ہونے کے بعد۔ توبہ قبول کرنے کا وعدہ نہیں ہے لہٰذا کوئی اشکال نہ رہا۔

فرشتوں کے منکشف ہو جانے سے عالم غیب منکشف ہو جاتا ہے اس وقت کا ایمان معتبر نہیں کیونکہ قرآن میں فرمایا گیا۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ، یعنی وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں سا اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بالغیب ہی۔۔ مقبول ہے اور توبہ اسی وقت تک قبول ہوتی ہے جب تک عالم غیب سامنے نہ آئے۔

شیاطین کو انسان سے حسد کی وجہ

حضرت نے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ انسان

سے پہلے زمین پر جنات کی آبادی تھی ان کے اندر جب گمراہی بڑھ گئی تو اللہ تعالےٰ نے ان کی ہدایت کے لیے نبی بھیجا۔ مگر ان لوگوں نے ان کو قتل کر دیا۔ اور فساد اور جور و تعدّی شروع کر دیا کیونکہ ان میں طیش زیادہ ہوتا ہے اسی طرح ان کے مزاج میں کبر و رعونت بھی زیادہ ہے۔ اس وقت حق تعالےٰ نے فرمایا کہ تم زمین کا نظم نہیں کر سکتے اس لیے میں خلیفہ پیدا کروں گا جو زمین کا نظام چلائے گا اسی لیے شیطانوں کو انسان سے حسد پیدا ہوا کہ ہمارے اقتدار پر انسانوں نے قبضہ کر لیا۔

مولانا حامد میاں صاحب نے سوال کیا کہ حضرت جنت میں ان کے داخلہ پر کوئی نص موجود نہیں ہے تو ان کے داخلے کی کیا شکل ہوگی۔ حضرت نے فرمایا کہ نص تو یہی ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ہ یہ تو جنت ہی کی تو نعمتیں تبلائی گئیں ہیں۔ کہ کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے اور جب تکلیف شرعی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس پر اجر ضرور مرتب ہوگا۔

اور حدیث میں ہے کہ مختلف مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں جا کر وعظ فرمائے اور ان کو نصیحت کی ہے۔ جنات کے قبائل جمع ہو گئے اور آ کر عرض کیا کہ سارے خاندان جمع ہیں آپ وعظ فرمائیں تو آپ تشریف لے گئے عبداللہ ابن مسعودؓ آپ کے ساتھ تھے۔ اس پہاڑی کے نیچے جس پر یہ جنات جمع تھے۔ عبداللہ ابن مسعودؓ کو آپ نے بٹھا دیا اور ایک دائرہ کھینچ دیا کہ اس سے باہر مت جانا وہ رات بھر بیٹھے رہے تو عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ عجیب عجیب شکلوں کے جنات میں نے وہاں سے گذرتے دیکھا ان کے چہرے بھی عجیب تھے انسانوں جیسے نہیں تھے مگر اس دائرے کے قریب کوئی نہیں جاتا تھا ادھر اُدھر سے نکل جاتے تھے تو اس پہاڑی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وعظ فرمایا اور

جناتوں کو نصیحتیں کیں اور جناتوں نے بنی آدم کی کچھ شکایتیں بھی کیں تو آپ نے بنی آدم کو خطاب فرمایا کہ ہڈی سے استنجا مت کرو۔ فَاِنَّھَا زَادُ اِخْوَانِکُمْ مِّنَ الْجِنِّ۔ یہ تمہارے جنات بھائیوں کی غذا ہے۔ اسی طرح گوبر وغیرہ سے بھی استنجا کرنے کو منع فرمایا۔ اوّل تو اس سے تطہیر کی بجائے تنجیس ہو جاتی ہے وہ خود نجاست ہے۔ اور بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ اس میں دانہ دُنکا ہوتا ہے۔ وہ جنات کے جانوروں اور چوپایوں کی غذا ہے۔ اسے آلودہ مت کرو۔ یا جیسے آپ نے فرمایا کہ کسی سوراخ میں پیشاب مت کرو۔ ممکن ہے کہ وہاں جنات کی رہائش گاہ ہو وہ تمھیں تکلیف پہنچائیں۔ اسی طرح کوئلوں سے استنجا کرنے کی ممانعت فرمائی گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شکایت پر فرمایا کہ جس طرح تم زمین پر ہو۔ وہ بھی زمین پر ہیں۔ تمہارے حقوق ہیں تو ان کے حقوق بھی ہیں۔ اور سب سے بڑا حق کھانا اور پینا ہے۔ لہٰذا ان کی غذا کو آلودہ مت کرو، سوراخ میں پیشاب مت کرو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہارے لیئے مکان ہے ان کے لیے بھی مکان ہے۔ تو ان کے ٹھکانے کو کیوں گندہ کرتے ہو۔ اگر تمہارے مکان میں کوئی آکر پلیدی ڈال جائے تو تم کیسے صبر کرو گے تو ان کے لیئے بھی مکان ہیں۔ البتہ شکلیں مختلف ہیں۔

بعض جنات اصل صورت میں رہتے ہیں۔ بعض سانپ کی صورت میں رہتے ہیں۔ بعض کُتّے کی صورت میں رہتے ہیں۔

کتّوں کو مارنے اور شراب کو مٹانے کی حکمت

کتّوں سے زمانۂ جاہلیت میں بہت زیادہ مناسبت تھی۔ جیسے اس زمانے میں یورپ والوں کو کتّوں سے بہت محبّت ہے۔ کتّوں

کی ایک جوڑی ہزاروں روپیہ کی بکتی ہے۔ وہاں کے لوگوں سے سُنا ہے کہ جو اچھی نسل کے کتے ہیں ان کو برابر لحاف میں لے کر سوتے ہیں۔

اور ایک شراب سے زیادہ شغف تھا۔ کتا اور شراب ان ہی دو چیزوں سے زیادہ شغف تھا۔ آج یورپ کا حال بھی یہی ہے۔ شراب اور کتے بہت زیادہ ہیں۔ کتوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ قتل کرو۔ چنانچہ قتل ہوتے چلے گئے جب دیکھا کہ اب قلوب سے کتوں کی محبت نکل گئی تو فرمایا کہ اُقتُلُوا کَلبَ الاَسوَدَ فَاِنَّھَا شَیطَانٌ ۔ یعنی کالے کتوں کو قتل کرو کیونکہ وہ شیطان ہے۔ بقیہ کتوں کو نہیں اکثر جنات سیاہ کتوں کی شکل میں رہتے ہیں جب کتوں کی محبت اور مناسبت لوگوں کے دل سے نکل گئی تو فرمایا گیا مَالَنَا الکِلَاب، یعنی اب کتوں سے تعارض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو مٹانا نہیں ہے۔

بہرحال کتوں کی بیخ مارنا مقصود نہیں تھا کہ نسل ختم ہو جائے۔ بلکہ دلوں سے ان کی محبت اور مناسبت نکالنی تھی۔ جب وہ نکل گئی تو ان کو چھوڑ دیا گیا، اور شراب کی محبت ہی نہیں بلکہ اس کی بیخ مارنا تھا اس لیے اس کو ہمیشہ کے لیے حرام کر دیا۔

ایک جگہ شریعت چلی تنگی سے آسانی کی طرف، اور ایک جگہ چلی ہے آسانی سے تنگی کی طرف، تو شراب کو چونکہ بالکل ختم کرنا تھا۔ اس واسطے آسانی سے تنگی کی طرف چلی۔ ابتداء میں تو صرف اس کی مضرت نازل ہوئی کہ یہ نقصان کی چیز ہے اس کا نقصان نفع سے بڑھا ہوا ہے اور فرمایا یَسئَلُونَکَ عَنِ الخَمرِ وَالمَیسِرِ قُل فِیھِمَا اِثمٌ کَبِیرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔

اس شراب میں نفع بھی ہے اور نقصان بھی لیکن اِثمُھُمَا اَکبَرُ مِن نَّفعِھِمَا اس کا نقصان نفع سے بہت زیادہ ہے۔ یعنی مضرت غالب ہے نفع کم ہے۔

تو جو اخص الخواص تھے وہ سمجھ گئے کہ اب شراب حرام ہونیوالی ہے اور اسی وقت سے چھوڑ دی لیکن اور لوگ پیتے رہے اس کے بعد دوسرا حکم آیا۔ اس میں تھوڑی سی اور تنگی کی گئی اور فرمایا کہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی یعنی اے ایمان والو جب نماز پڑھنے کے لیے جاؤ تو نشہ کی حالت میں مت جاؤ۔

اس کے بعد شراب حرام قرار دے دی گئی تو پہلے برائی بیان کی گئی پھر نفرت دلائی گئی پھر حرمت آئی۔ مگر مختلف اوقات میں، اب تو بہت سے صحابہ کو شراب سے نفرت ہوگئی۔ اس کے بعد پھر آخری حکم آیا کہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ، یہ سب شیطانی حرکت ہیں ان سے بچو۔

احادیث میں ہے کہ یہ خبر سنکر صحابہ کی یہ حالت تھی کہ کسی کے گھر میں شراب کا ایک مٹکا ہے تو انھوں نے توڑ دیا۔ اور اگر کسی کے گھر میں دو یا کئی مٹکے تھے وہ پھوڑ دیئے اور مدینے کی گلیوں میں اس طرح شراب بہتی تھی کہ جیسا برسات کا پانی بہتا ہے۔ اس طرح پورا گھر شراب سے خالی ہوگیا۔ بعض شراب کا پیالہ منہ میں لگائے ہوئے تھے کہ اعلان سنا۔ مگر اعلان ہوتے ہی بس اسی وقت اٹھا کر پھینک دیا۔

چونکہ اس کی بیج مارنی تھی۔ اسلیئے آسانی سے تنگی کی طرف آئی اس کے بعد بہت سخت حکم آیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ وفد عبدالقیس جب آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اٰمُرُکُمْ عَنْ اَرْبَعٍ وَاَنْهٰکُمْ عَنْ اَرْبَعٍ تم کو چار باتوں کا حکم کرتا ہوں، اور چار باتوں سے روکتا ہوں۔ کرنے کا جس کا حکم ہے وہ یہ ہیں وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ط

اللہ کی عبادت کرو اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو۔ اور چند چیزوں سے روکتا ہوں اَنْهٰكُمْ الْحَنْتَمُ وَالدُّبَّاءِ وَالنَّقِيْرِ وَالْمُزَفَّتُ،

یہ چار قسم کے مشہور برتن تھے جن میں شراب رکھی جاتی تھی۔ دُبّا۔ کدو، اس کے اندر شراب رکھتے تھے وہ نشیلی زیادہ ہوتی تھی۔ نقیر ایک پیالہ ہوتا تھا جو درخت کی جڑ کو کھود کر بنایا جاتا تھا وہ مخصوص تھا شراب پینے کے لیے۔ جیسے آجکل شرابیوں کے یہاں برتن متعین ہوتے ہیں خاص قسم کے گلاس ہوتے ہیں۔

اور مزفت وہ لکڑی کا پیالہ ہوتا ہے جس پر کچھ رنگ و روغن کیا جاتا تھا۔ تو ان برتنوں سے بھی ممانعت کر دیجئے کہ ممکن ہے اگر ان میں پانی پیو تو شراب کی طرف دھیان چلا جائے اور پھر شراب پینے لگو۔

یہ حکمت شرعی ہے کہ بعض مرتبہ مربّی ایک گنہگار کو ایک بیک معصیت چھڑا دیتا ہے کہ اس کی طرف مت جاؤ۔ یہ بالکل حرام ہے اور بعض مربّی یہ کرتا ہے کہ ہلکے پھلکے چھڑاتا ہے تاکہ چھوڑنے میں تکلیف نہ ہو کیونکہ عادت پڑی ہوئی ہے۔ بار بھی نہ پڑے اور چھوٹ بھی جائے۔

حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور بیعت ہوگیا پھر خود ہی کہا کہ حضرت آپ نے تو یہ پوچھا نہیں کہ تو افیم کھاتا ہے یا نہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے کیا معلوم کہ تو افیم کھاتا ہے کہا کہ میں افیم کھاتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کی آدھی کر لو پھر بیس۲۰ دن کے بعد اس کی آدھی کر لینا۔ اس طرح آہستہ آہستہ چھوٹ جائے گی۔ چونکہ اس کی عادت تھی اس لیے یک بیک اگر چھوڑنے کا حکم کرتے تو ممکن ہے پریشان ہوتا اس لئے رعایت کی لیکن دیہاتی نے جب دیکھا کہ افیم حرام ہے تو کہا کہ جس طرح ایک گولی حرام ہے اسی طرح آدھی گولی بھی حرام ہے۔ اس نے بالکل چھوڑ دیا اور اس کی وجہ سے بیمار پڑا اور بہت ضعیف ہوگیا

مگر ایک ماہ کے بعد پھر ٹھیک ہوگیا پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک روپیہ پیش کیا۔ حضرت نے پوچھا کہ یہ روپیہ کیسا ہے اس نے کہا کہ ایک ماہ میں ایک روپیہ کی افیم کھاتا تھا۔ اور جب یہ بچ گیا تو کہا کہ لاؤ پیر ہی کو دیدوں حضرت ہنسنے لگے پھر چار آنے قبول کئے اور بارہ ۱۲ آنے اس کو دیدیئے کہ یہ تیرے ہیں اپنے بچوں کو دیدینا۔

تو یہاں تنگی سے آسانی کی طرف معاملہ کیا۔ گو اس نے حضرت کی توجّہ سے دفعتًہ ہی چھوڑ دیا۔

مجلس نمبر ۲

۸ رمضان المبارک ۹۴ھ مطابق ۷۵ء

ظہور فتن کی علامات اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ضرورت اور انکا طریقۂ کار

سوال :۔ آج کل ریڈیو اور سینما کی کثرت ہو رہی ہے کیا ایسے فتنوں کی نشاندہی شریعت نے کہیں کی ہے۔ کیا ایسی صورت میں خدا کا کوئی غضب نازل ہو سکتا ہے اور اگر ہو سکتا ہے تو اس سے بچنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ باجے گاجے وغیرہ کی شریعت میں صراحۃً ممانعت ہے مگر سینما و تھیٹر وغیرہ جزئیات ہیں ان کا اصول بتلایا گیا ہے کہ لہو ولعب کی چیزیں ممنوع ہیں۔ اول تو لہو ولعب ہیں اسی بنا پر ممنوع ہیں کہ اس سے نفسانی جذبات بھڑکتے ہیں کوئی روحانیت تو ہوتی نہیں اور شریعت کا مقصود تہذیب روحانی ہے لہٰذا اس کے جو چیزیں منافی ہوں گی وہ ممنوع ہوں گی۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو سینما وغیرہ میں گانے بھی ہوتے ہیں اس لئے ممنوع ہے اور مرد و عورت کا ان میں اجتماع بھی ہوتا ہے۔ اور مرد و عورت کا اختلاط یہ خود ممنوع ہے لہٰذا تجزیہ کے بعد متعدد چیزیں ممنوع نکلتی ہیں۔ اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لہو ولعب ہونے میں کلام نہیں اور شریعت کا مقصود دوسری لائن پر لگانا ہے کہ ان لہو ولعب کو چھوڑ کر روحانی تہذیب حاصل کرو، اخلاق کاملہ پیدا کرو اعمال صالحہ پیدا کرو اور عقائد حقہ پیدا کرو، جو جو چیزیں اس کے منافی ہوں گی وہ تمام چیزیں ممنوع ہوتی چلی جائیں گی۔

دوسرا سوال کہ علامات قیامت میں سے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ناچ گانے کی کثرت ہوگی کیا اس سے یہی ریڈیو اور سینما مراد ہیں۔؟

فرمایا یہ مراد تو نہیں ہے لیکن اس کا مصداق یہ چیزیں ضرور ہیں ایک تو یہ کہ شارع علیہ السلام نے صراحت کی ہو کہ اس سے ریڈیو اور سینما مراد ہیں۔ تو ایسا نہیں ہے بلکہ کلی طور پر فرمایا گیا کہ اخیر زمانے میں گانے کی کثرت ہوگی اور مغنیہ عورتیں یعنی گانے والی عورتیں غالب آجائیں گی۔

آج دیکھا جائے تو اس کا مصداق موجود ہے کیوں کہ آج کل اسکولوں میں گانے بجانے کی مستقل تعلیم دی جاتی ہے اور ان کو فنون لطیفہ کہا جاتا ہے لہٰذا جب ان کا اصول ممنوع قرار دیدیا گیا تو ساری جزئیات اس کے ذیل میں ممنوع ہوں گی۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ط

بلاشبہ لہو الحدیث میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ اور یہ سینما ایک مستقل معلم ہے۔ منکرات اور فواحش کا۔ اس میں مختلف قسم کے فواحش دکھلائے جاتے ہیں۔

اس سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ خدائی احکام کی پیروی کی جائے اگر اللہ نے کسی چیز کو ممنوع قرار دیا ہے تو اس سے بچا جائے۔

البتہ ہمت کی ضرورت پڑے گی نفس کو اتنا آزاد چھوڑ دینا کہ وہ حاکم بن جائے آدمی پر، یہ فساد کی جڑ ہے اور سینما میں نفسانی جذبات ابھرتے ہیں۔ اور شریعت نے جو قانون بنایا وہ فطری قانون ہے مگر لوگ عقل پر فیصلے کرتے ہیں اور یہ فساد کی جڑ ہے۔ اگر خدائی حکم پر فیصلے ہوں تو بہت سے جھگڑے و فسادات ختم ہو جائیں۔

عذابِ خداوندی سے بچنے کی صورت

تیسرے سوال کے جواب میں حکیم الاسلام نے فرمایا کہ عذاب کی نوعیت مختلف ہوتی ہے کہیں قحط ہے تو کہیں سیلاب اور کہیں فتنہ و فساد۔ لہٰذا یہ سوال کرنا کہ عذاب آسکتا یہ ناواقفیت کی دلیل ہے۔ پتہ نہیں کہ عذاب آیا ہوا ہے اسے تو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ کسی طرح سے وہ ٹلے اور یہ جبھی ہوسکتا ہے کہ منکرات کو ترک کریں۔ اب ظاہر بات ہے کہ نہی عن المنکر یہ لازم ہے۔ مامور بہ ہے کتاب اللہ میں بھی اور سنت رسول اللہ میں بھی، اور اس امت کا فریضہ منصبی یہی بیان کیا گیا ہے۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ یہ امت پورے عالم کے لئے بنائی گئی ہے۔ کسی فرقے یا طبقے یا کسی خاندان کے لئے نہیں بنائی گئی ہے لِلنَّاسِ لوگوں کے لیے صراحت ہے۔ باقی اسکا کیا کام ہے ارشاد ہے۔۔۔

تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط

تین چیزیں بتائی گئیں۔ ایمان باللہ اس کے نیچے، ایمان بالرسول ایمان بالقیامت آجاتے ہیں۔ پہلی چیز ایمان وہ تو اپنی اصلاح کے لئے ہے۔ آگے اس کی تبلیغ ہے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورت میں ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس کا اہتمام کم ہوگیا ہے، کھلے بندے منکرات کو دیکھتے ہیں۔ مگر ٹوکنے کی جرأت نہیں ہوتی کیونکہ انھیں منکرات میں خود بھی مبتلا ہیں، ان کو خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم دوسروں کو روکیں گے تو وہ کہے گا کہ پہلے اپنی خیر تو لو۔ بلکہ اس سے بڑھ کر چیز ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کَیْفَ بِکُمْ اِذَا فَسَقَ فِتْیَانُکُمْ الخ

لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ تمہارے نوجوان فاسق اور فاجر بن جائیں گے۔ اور عورتیں سرکش اور آزاد ہو جائیں گی یعنی اتباعِ شریعت کم ہو جائے گا۔ اور احکام پر عمل نہیں رہے گا۔ اور لوگ فسق و فجور میں مبتلا ہوں گے۔ صحابہ کو حیرت ہوئی کہا کہ وَاِنَّ ذٰلِكَ لَكَانَ یَا رَسُوْلَ اللہ کہ کیا ایسا ہو جائے گا یارسول اللہ، صحابہ کو حیرت اسلیے ہوئی کہ وہ خیرالقرون کا زمانہ تھا ان کے حاشیہ خیال میں یہ بھی آسکتا تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بند ہو جائے گا یہ تو رات دن کا ان کا۔ اوڑھنا اوڑ بچھونا تھا حیرت کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو۔۔ منکرات وہ ہیں جو محرمات کے درجے میں ہیں تو ان سے وہ حضرات بحمداللہ بری تھے۔ بعض منکرات وہ ہیں جو مکروہات کے درجہ میں ہیں۔ ان سے بھی وہ حضرات بری تھے۔

بعض منکرات وہ ہیں جو لاینبغی کے درجے میں ہیں۔ یعنی غیر مستحسن وہ اس سے بھی بری تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس غم کی کوئی انتہاء نہ تھی۔ صحابہ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا تاریک ہو گئی، کچھ باقی نہیں رہا۔ سب اس غم میں مبتلا تھے۔ اس وقت ایک واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عمر فاروق رض تشریف رکھتے تھے وہاں سے حضرت عثمان غنی رض کا گذر ہوا گرمی کی وجہ سے منہ پر رومال لٹکا ہوا تھا۔ تو حضرت عمر فاروق رض نے سلام عرض کیا۔ عثمان غنی رض اپنے خیال میں غرق تھے ان کو سنائی بھی نہیں دیا۔ اس لیے انہوں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ بس صرف اتنی سی بات تھی کوئی ایسا منکر بھی نہیں تھا جس پر نکیر ہو۔ صرف غیر مستحسن کے درجہ میں تھا کیونکہ ایک مسلمان کا حق ہے کہ دوسرے مسلمان کے سلام کا جواب دے، لیکن عثمان غنی رض کے جواب نہ دینے پر حضرت عمر رض نے صدیق اکبر رض کی خلافت میں

دعوای دائر کر دیا کہ میں نے عثمانؓ کو سلام کیا جو حق مسلم تھا مگر انھوں نے جواب نہیں دیا۔ حضرت عثمان غنیؓ کی طلبی ہوئی حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ یہ تو حق مسلم تھا آپ نے جواب کیوں نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ وَاللّٰہِ مَا شَعَرْتُ مجھے پتہ بھی نہیں کہ مجھے کسی نے سلام کیا اور فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ وَاللّٰہِ کہ میں نے سلام کیا۔ عثمان غنیؓ نے فرمایا کہ وَاللّٰہِ مَا شَعَرْتُ۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ آخر تم کس غم میں مبتلا تھے۔ فرمایا یہ غم تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا جسمیں فاروق اعظمؓ اتنے منہمک ہوگئے تھے کہ تلوار لے کر کھڑے ہوگئے تھے اور کہتے تھے کہ جو یوں کہے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو اُس کی گردن اُڑا دوں گا۔ وہ غم کا غلبہ تھا، وہی غلبہ حضرت عثمان غنیؓ پر تھا تو انھوں نے عرض کیا کہ میں اسی غم میں مبتلا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے۔ مگر ایک سوال مجھے کرنا تھا میں وہ نہیں کر سکا۔ اور اس کا جواب رہ گیا میں عمر بھر اس میں مبتلا رہوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا غم تھا ہی، اوپر سے یہ غم کہ ایک علم میرے ہاتھ سے چلا گیا میں نے حاصل نہیں کیا اور وہ سوال یہ تھا کہ مَا بَقَاءُ هٰذَا الْاَمْرِ کہ آپ کے بعد اس امر دینی کی بقا کی کیا صورت ہوگی یہ سوال تھا میرے ذہن میں جس کے غم میں مبتلا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ یہ سوال میں کر چکا ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب بھی دیا تھا۔

عثمان غنیؓ نے فرمایا کہ فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ ہی اس امر دینی کے مستحق تھے اور آپ ہی کو یہ جواب مل سکتا تھا اب وہ مجھے تبلا دیجئے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے فرمایا کہ میں نے سوال کیا تھا کہ مَا بَقَاءُ هٰذَا الْاَمْرِ یہ امر دینی کس طرح سے باقی رہے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ

باقی رہے گا، اُس کلمے کے ذریعے جو ہم نے ابوطالب پر پیش کیا تھا یعنی کلمہ طیبہ سے اس کو دل میں جمالو۔ یہ ہے بقاءِ دین۔

دین کی حفاظت کس طرح کی جائے

مطلب یہ تھا کہ دین مجموعہ ہے عقیدہ اور عمل کا۔ جس شخص نے عقیدہ اور عمل اپنے دل میں محفوظ کر لیا تو اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ امر دینی محفوظ ہو گیا یہ دین کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو مجسمہ یا تصویر ہو اس کی حفاظت کرو۔ یہ تو ہر شخص کے اندر ہے جس نے اپنے اندر محفوظ کر لیا وہ محفوظ ہو گیا۔ اب لوگ اسلام کے تحفظ کی صورتیں تلاش کرتے ہیں اور اسلام کو ایک مجسمہ فرض کر رکھا ہے کہ وہ کھڑا ہے اور الیکشن کے موقعہ پر زیادہ فکر کرتے ہیں کہ یہ کیسے باقی رہے گا اور اس کی تدبیر الگ سے کرتے ہیں کہ اس کی حفاظت کرو حالانکہ وہ اپنے اندر ہے اور وہ عقیدہ اور عمل ہے اور اسی کلمہ طیبہ کی شاخیں ہیں جتنی چیزیں ہیں ،....... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب میں فرمایا اس کلمہ کو پڑھو اور تکرار کرتے رہو۔

حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ بِقَوْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہ ایمان کو تازہ کرتے رہو۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ سے صبح وشام سو سو دفعہ کلمہ طیبہ پڑھ لیا کرو۔ تو دین محفوظ ہو جائے گا۔ اب وہ اگر دوسروں کو تلقین کرے کہ تم بھی اس کو محفوظ کر لو اگر اس نے محفوظ کر لیا تو دین محفوظ ہو گیا۔ لہٰذا اسی طرح اگر اس کی تبلیغ جاری رہی تو دین محفوظ رہے گا۔

اس کے بعد صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ صَدَقَ عُثْمَان۔ یعنی عثمان غنیؓ سچ کہتے ہیں یہ غم میں مبتلا تھے۔ ان کو سلام کا پتہ ہی نہ ہوا یقین کریں کہ وہ خیر و برکت کا ایسا زمانہ تھا کہ مستحبات پر بھی گرفتیں ہوتی تھیں کہ یہ کیوں نہیں کیا؟

صحابہ کو اس پر حیرت ہوئی کہ کیا ایسا بھی زمانہ آئے گا کہ نوجوان فاسق و فاجر بن جائیں گے اور عورتیں سرکش اور آزاد ہو جائیں گی۔ اب عورتوں کی آزادی ظاہر بات ہے جتنے فیشن چلتے ہیں وہ سب عورتوں ہی سے چلتے ہیں اور جتنی رسمیں چلتی ہیں وہ عورتوں ہی سے چلتی ہیں اور خاوند زن مرید ہوتے ہیں۔ اگر ان سے کہو کہ یہ کام کیوں کر رہے ہو تو کہتے ہیں کہ کیا کروں عورتیں نہیں مانتی ہیں وہ حاکم بنی ہوئی ہیں۔ حالانکہ قرآن میں فرمایا گیا اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ مرد حاکم بنائے گئے ہیں عورتوں پر۔ مگر اب لوگوں نے انھیں حاکم بنا دیا۔

ظاہر بات ہے کہ جب جاہل بادشاہ اور حاکم بنے گا تو رعیت تباہ ہو جائے گی۔ جیسے بہت سے ملکوں میں ہو رہا ہے۔ اس لیے حضرات صحابہ نے پوچھا۔ قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِكَ لَكَائِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ یارسول اللہ ایسا وقت بھی آئے گا۔ قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ، آپ نے فرمایا کہ یہ بھی آئے گا اور اس سے سخت وقت بھی آئے گا۔ کَیْفَ بِکُمْ لَاتَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَاتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ نہ اچھی باتوں کا حکم کرو گے اور برائیوں سے روکو گے۔ یعنی نصیحت چھوٹ جائے گی۔ اس لئے کہ سب کے سب خود بھی مبتلا ہوں گے۔ اب صحابہ کو اور زیادہ حیرت ہوئی کہ ایسا وقت بھی آنا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ترک ہو جائے گا۔ فرمایا کَیْفَ بِکُمْ اِذَا اَمَرْتُمْ بِالْمُنْکَرِ وَنَهَیْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوْفِ۔ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جبکہ تم برائیوں کی ترغیب دو گے۔ اور اسے حکم کرو گے۔ اور بھلائیوں سے روکنا شروع کرو گے تو بھلائی کرنے والا قابل تحقیر ہوگا۔ کہ یہ کام تو مُلّا لوگوں کا ہے ہم تو بڑے ہیں اور یہ حقیر کام ہے۔

حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ آگیا ہے۔ آج کل اسی کی ترغیب

دی جارہی ہے کہ سینما دیکھو، تھیٹر دیکھو اس سے دل بدلتا ہے۔ روشنی پیدا ہوتی ہے۔ غیر اقوام تو پہلے ہی سے مبتلا ہیں۔

مگر اب شہروں میں عام طور پر مسلم مرد اور عورتیں بھی سینما اور تھیٹر دیکھنے میں مشغول ہیں اور اس کی ترغیب دیتے ہیں۔ مسلمانوں کا اکثر حصہ اسی کی تبلیغ کر رہا ہے۔ اور روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے جو مسلمانوں کے ایمان بلکہ ان کی جان کے لیے خطرناک ہے آج سینما جیسے منکرات سے روکنا اور معروفات کی تبلیغ کرنا دین کی اہم خدمت ہے۔

دنیا میں دوستی آج کل اس لیے ہوتی ہے کہ آج ملکر سینما چلیں گے آج فلاں شو آیا ہے آج فلاں فلم آئی ہے اور جو روکتا ہے اس کو تاریک خیال کہتے ہیں کہ اس کے دل میں کچھ ہے ہی نہیں تو جو روشن خیال تھے وہ تاریک خیال ہو گئے اور جو تاریک خیال تھے وہ روشن خیال ہو گئے۔

لَا تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ گویا آنکھوں سے نظر آرہا ہے جس کی پیشین گوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی صحابہ کو یہ معلوم کر کے اور زیادہ حیرت ہوئی کہ منکر کا حکم کریں گے۔ قَالُوْا وَاِنَّ ذٰلِكَ لَكَائِنٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ کیا ایسا بھی وقت آئے گا۔ کہ منکر کا امر کریں گے اور معروف سے روکیں گے۔

قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں! یہ بھی ہوگا۔ اور اس سے بھی زیادہ سخت بات ہوگی۔ كَيْفَ بِكُمْ اِذَا رَاَيْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْكَرًا وَالْمُنْكَرَ مَعْرُوْفًا۔ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ بھلائیاں تمہارے دلوں میں برائی بن جائے گی اور برائیاں بھلائی بن جائیں گی۔

اب آج معروف کیا ہیں ہ ڈانس کرنا، کھیلنا۔ اور عورتوں کا اجنبی مردوں کے

ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ننگی ہو کر ناچنا۔ کلب گھر وغیرہ مہیا ہوتا ہے اور اسی کی ترغیبات دی جاتی ہیں اور روکتے ہیں کس سے ؟ قرآن پڑھنے سے کہ قرآن پڑھ کر کیا کرو گے کہ کیا مسجد کا مُلّا بنو گے۔ کوئی روٹی کا فکر نہیں کریگا پہلے روٹی کی تو فکر کرو۔ تو جو معروفات تھے وہ نگاہوں میں منکر بن گئے۔ اور جو منکرات تھے وہ معروف بن گئے۔ قصہ اُلٹا ہو گیا۔

ان احادیث میں ترتیب بیان فرمائی گئی ہے کہ ایک چیز کے بعد دوسری چیز ہو گی سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ فسق و فجور عام ہو جائے گا۔ اور جب یہ عام ہو گا تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو گا۔ جب آدمی خود اس میں مبتلا ہو گا تو نصیحت کسے کریگا اور جب نصیحت رُک جائے گی تو تیسرا درجہ آئے گا کہ برائیوں کا آڈر دو گے اور بھلائیوں سے روکنے کھڑے ہو جاؤ گے اور جب اس کی بھی مشق ہو جائے گی تو چوتھا درجہ آئے گا کہ معروفات دلوں میں منکر بن جائیں گے اور منکرات معروف بن جائیں گے۔ اس لیے میں عرض کر رہا ہوں کہ بلاشبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت ہے۔ مگر محبت سے کیا جائے لاٹھی مار بات نہ ہو جیسے کوئی منکر میں مبتلا ہو تو کوئی شخص سختی سے یوں کہے کہ فلاں جہنم میں جائے گا۔ ایسا مت کر۔ تو اس کا جواب یہ دے گا کہ میں اپنی قبر میں سوؤں گا اور تم اپنی قبر میں سوؤ گے تم کو اس سے کیا مطلب ہم جو چاہیں کریں نصیحت کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ شفقت اور محبت سے سمجھائے اس وقت وہ مان لے گا۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی حکایت

جیسے حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا واقعہ ہے ان کا زُہد و تقویٰ پورے خاندان ولی اللّٰہی میں مشہور تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اولاد میں سب سے چھوٹے

بھائی تھے مگر تقویٰ و طہارت کی وجہ سے سارا خاندان ان کی عظمت کرتا تھا اُنھوں نے اکبری مسجد میں چالیس۴۰ برس تک اعتکاف کیا ہے سوائے قرآن پڑھنے و پڑھانے کے ان کا کوئی شغل نہیں تھا۔ اس درجہ کا ان کا تقویٰ اور طہارت تھا۔

ان کا واقعہ ہے کہ کسی نوجوان نے آکر وضو کیا جیسے جوانوں کی عادت ہے۔ جلدی جلدی ہاتھ پیر دُھلا۔ مگر ایڑیاں خشک رہ گئیں تو ایک صورت تو یہ تھی کہ شاہ صاحب فرماتے کہ اے جوان بے وقوف نالائق تیری ایڑیاں خشک رہ گئیں ہیں اور حدیث شریف میں آیا ہے وَیْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ۔ اگر خشک ایڑیاں ہوں گی تو جہنم میں جلائی جائیں گی۔

وہ یوں جواب دیتا کہ جناب آپ اپنی قبر میں سوئیں گے اور میں اپنی قبر میں سوؤں گا۔ آپ کے پیٹ میں درد کیوں ہو رہا ہے۔ مگر شاہ صاحبؒ نے اس طرح سے نصیحت کی کہ اُسے بلایا اور سر پر محبت سے ہاتھ رکھا اور کمر پہ پیار سے ہاتھ رکھ کر کہا کہ بیٹا میں بڈھا ہوگیا ہوں اور بعض مرتبہ وضو کرتا ہوں اور یہ پتہ نہیں رہتا کہ میری ایڑی تر ہے یا خشک رہ گئی ہے اگر خشک رہ گئی ہے تو... حدیث شریف میں آیا ہے کہ خشک ایڑی جہنم میں جلائی جائے گی میری ایڑی دیکھ لو کہیں خشک تو نہیں رہ گئی ہے میں وضو کر کے آیا ہوں وہ نوجوان سمجھ گیا اور کہا کہ حضرت آپ کی ایڑی خشک کیوں رہ گئی ہے یہ ہماری غلطی ہے میں توبہ کرتا ہوں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔

ان حضرات کا یہ طریقہ تھا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں یہ طریقہ نہیں تھا کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر آپ فہرست گنا دیں۔ بات وہی ہے کہ جو میں کہہ رہا تھا کہ شفقت اور محبت سے اگر کہا جائے تو لوگ مانتے ہیں اور شرمندہ بھی ہوتے ہیں۔ اور اگر لاٹھی ماری بات کہہ دی تو چڑھ پیدا ہوگی۔ کوئی نہیں...

مانے گا۔

لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اس کی ضرورت ہے کہ شفقت سے ہو، محبت سے ہو اور نرمی سے بھائی بندی کے طرز پر ہو، مسئلہ بھی معلوم ہو جائے اور دوسرا شرمندہ بھی ہو جائے، تبلیغ کا جذبہ یہ نہ ہو کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر کے الگ ہو جاؤں گا یہ جہنم میں جائے یا کہیں جائے۔ بلکہ جذبہ یہ ہو کہ اس کو شریعت پر لانا ہے۔ جیسے باپ اولاد کو راہ راست پر لاتا ہے تو کسی وقت گھور دیتا ہے، اور کسی وقت لالچ دلاتا ہے کہ بیٹے نماز کو چلو مٹھائی دوں گا، تو بچہ راضی ہو جاتا ہے تو فکر یہ ہو کہ اسے جہنم سے بچانا ہے۔ لہٰذا جیسا موقع ہو، اسی طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ ہو اور اسی طریقے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کارگر بھی ہوگا۔

حضرت نانوتویؒ کا نہی عن المنکر کا طرز

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں مجھے حضرت نانوتویؒ کا واقعہ یاد آیا ان حضرات کا عجیب طرز عمل تھا۔ واقعی ان حضرات میں باپ کی سی شفقت ہوتی تھی۔ مظفر نگر میں ایک مجلس کے اندر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کچھ نصیحت اور مسائل بیان فرما رہے تھے۔ اس مجلس میں ایک تھانیدار بھی تھے وہ بہت متاثر ہوئے اس زمانے میں تھانیدار کی جو حیثیت تھی اس زمانے کے کلکٹر کی بھی نہیں ہوتی ہے۔

انھوں نے غایتِ عقیدت سے کہا کہ حضرت میری دعوت قبول فرمالیں اور حضرت نانوتویؒ پولیس والوں کے یہاں دعوت قبول نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ یہ ظلم زیادہ کرتے ہیں۔ اور ان کی کمائی میں ناجائز کا قوی شبہ ہوتا ہے حضرتؒ

نے یہ نہیں کہا کہ تو پولیس کا آدمی ہے کیونکہ ان کا دِل دُکھتا۔ بلکہ یوں فرمایا کہ مجھے کچھ عُذر ہے آپ معاف فرمائیں اس نے کہا کہ حضرت اگر یہ بات ہے تو میں تانگہ لے کر آؤں گا اور تانگے میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔ تاکہ چلنے میں دشواری نہ ہو لیکن بات دوسری تھی۔ حضرت اسے کہنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے پھر فرمایا کہ مجھے کچھ عُذر ہے معاف فرمائیں۔ اسنے کہا کہ کھانا پکا کر یہیں بھجوا دوں لیکن یہاں تو کھانے ہی سے گریز تھا۔

چنانچہ پھر حضرت نے عُذر کیا۔ اب اس نے کہا کہ پھر میں پیسہ دیدوں خود پکالیں۔ مگر یہاں تو پیسے ہی سے بچنا تھا۔ وہ پھر مانا نہیں اور حضرت بہت نرمی اور محبت سے عذر کرتے رہے۔ اتنے میں تھانیدار کو غصّہ آیا اور کہا کہ یہ کون سا اتّباع سنّت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتیں قبول فرمائیں اور یہ سنّت کا طریقہ ہے اور آپ عالمِ دین ہو کر سنّت کا طریقہ چھوڑ رہے ہیں۔

بہرحال جو اس کے منہ میں آیا اس نے سخت سے سخت جُملے کہے۔ حضرت گردن جُھکا کر سُنتے رہے۔ لوگوں کو غصّہ آیا۔ مگر حضرت ساکت تھے اس لیے کوئی بول نہیں سکتا تھا۔ مجلس بالکل ساکت اور صامت اور وہ اپنا کہتا رہا، اور جو اس کے منہ میں آیا وہ سب کہتا رہا۔ حضرت اس کو تحمل کے ساتھ سنتے رہے اس کے بعد بہت ہی تواضع سے فرمایا کہ تھانیدار صاحب ابھی تو میرے اتنے ہی عیب آپ کو معلوم ہوئے ہیں۔ اگر ہمارے سارے عیوب کھل جائیں تو شاید آپ میری صورت بھی دیکھنے کے روادار نہ ہوں گے۔

حضرت نے معلوم نہیں قلب کے کس انداز سے یہ فرمایا کہ تھانیدار کی ایک چیخ نکلی وہ رو پڑا، اور روتے ہی اس پر حالت منکشف ہو گئی کہا کہ حضرت اب میری سمجھ میں آگیا۔ میں پولیس کا آدمی ہوں اور میں توبہ کرتا ہوں آئندہ ظلم

نہیں کروں گا۔ اور اب میں اس پلینے کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ جو میری اصل جائیداد کی کمائی ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ دعوت قبول ہے۔ یہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا طریقہ تھا۔ سب کچھ اپنے اوپر لے لیا اور آخر میں یہ کہا کہ ابھی تک تو آپ کو میرے اتنے ہی عیب معلوم ہوئے ہیں اگر سارے معلوم ہو جائیں تو میری صورت دیکھنے کے روا دار نہ ہوں گے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ایک بزرگ کے پاس ایک شخص آیا اور اپنی مصیبتیں بیان کی اور کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں خودکشی کر لوں نہ کھانے کو ملے، بیوی الگ نافرمان، بچے الگ پریشان، میرا جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں، حضرت نے فرمایا کہ ہاں بہت اچھا ہے سوائے خودکشی کے آدمی کیا کرے ایسی پریشانی میں ضرور خودکشی کرنی چاہیئے۔ مگر میری ایک رائے ہے کہ خودکشی میں مضائقہ نہیں مگر خداکشی نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر آپ صبر و تحمل سے کام کریں اور نصیحت کرتے رہیں۔ اور اس کی تدبیریں کریں تو خودکشی سے زیادہ بہتر ہوگا۔

یہ نہیں فرمایا کہ خودکشی حرام ہے اور کتے کی موت مریگا۔ بلکہ فرمایا کہ "خداکشی نہ کرو" ظاہر بات ہے کہ جب اللہ پر بے اعتمادی کی اور اس کی وجہ سے خودکشی کی تو وہ خداکشی ہوئی اور یہ مسلمان کے لیے کب زیبا ہے اس کو صبر آگیا اور صحیح راستے پر پڑ گیا تو یہ طریقہ ہے نہی عن المنکر۔

ایک طریقہ نصیحت کا یہ ہے کہ اگر کسی کو برائی میں دیکھا جائے تو بر سر مجمع اس کو نہ کہا جائے کیونکہ وہ شرمندہ اور رسوا ہوگا۔ بلکہ تنہائی میں بلا کر نرمی کے ساتھ کہا جائے تاکہ وہ رسوا نہ ہو۔ اور وہ منکر بھی چھوڑ دے۔

حدیث شریف میں ہے کہ مجلس مبارک میں تمام حضرات صحابہ بیٹھے تھے ایک صاحب کا وضو ٹوٹ گیا، آپ نے فرمایا کہ کوئی آدمی بے وضو نہ بیٹھے اُٹھ جائے جاکر وضو کر لے۔ اب ان کو اُٹھنا بھاری ہوگیا کہ اگر وہ اُٹھیں تو سب کے سامنے لکو ہوں کہ یہ ہیں وہ آدمی اس لیے وہ نہیں اُٹھے آپ نے پھر فرمایا کہ ہماری مجلس میں کوئی بے وضو نہ بیٹھے اُٹھ کر چلا جائے مگر وہ پھر نہیں اُٹھے تو حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت اجازت دیں ہم سب جاکر وضو کر آئیں جن کا وضو ہے اُسے تبرید ہو جائے گی۔ نورٌ علیٰ نور

تو آپ نے فرمایا کہ ہاں سب کر لو، وہ بات چھپی رہ گئی اور حضرت عباسؓ رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو آپ نے پسند فرمایا۔ تو ایسی حکمت کے ساتھ اگر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تبلیغ ہو تو کار گر ہوگی۔

اصل یہ ہے کہ جو آدمی جس راستے پر چلتا ہے تو اس راستے کے نشیب و فراز اس پر کھلتے رہتے ہیں، اور حکمت کی باتیں سمجھ میں آتی رہتی ہیں لہٰذا جس نیکی پر مزاولت ہوگی معرفت بڑھے گی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی اجنبی عورت جا رہی ہے اور نگاہ پڑ گئی تو النظرۃ الاُولیٰ لکَ والثّانیۃُ علیکَ یعنی پہلی نگاہ تو معاف ہے، جو بلا ارادے پڑ جائے۔ مگر دوسری نگاہ جو ارادے سے پڑی وہ معاف نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قصداً نظر نہیں ڈالنی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی عورت پر نگاہ ڈالنا چاہتا ہو جو سامنے سے جا رہی ہو۔ مگر وہ رک گیا تاکہ نگاہ نہ پڑے تو حق تعالیٰ اس کے قلب میں ایک معرفت پیدا فرمائیں گے اور بہت سے نیکی کے راستے اس پر کھل جائیں گے۔ تو کسی برائی سے صبر کر لینا یہ معرفت کے کھلنے کا دروازہ ہے تو اگر ایک

شخص نہی عن المنکر کی عادت ڈال لے کہ میں منکر کو مٹانے کی کوشش کروں گا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایسے راستے بھی ڈالتے ہیں کہ یہاں اس طرح کرو یہاں ایسا کرو وہ راستے خود بخود کھلتے ہیں یہ کوئی فن نہیں ہے کہ آپ نے چند اصول پڑھ لیا پھر اس کے مطابق کرتے رہو یہ تو خود قلب کے اندر القا ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ اس عمل کے ساتھ مداومت جاری رہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا تَجْرِیْ مِنْ قَلْبِہٖ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَۃِ۔ اگر اخلاص کے ساتھ کوئی نیک کام چالیس روز تک کرے تو حکمت کا چشمہ اس کے دل میں پھوٹ نکلتا ہے خیر کے نئے نئے راستے اس پر کھل جاتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی حکایت

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں بدعت کی بہت کثرت ہو گئی تھی۔ اور دلی کے لال قلعہ میں تو ہر بدعت جاری تھی۔ سنت کا پتہ نہیں تھا۔ بس بدعات اور خرافات پھیلی ہوئی تھیں تو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے زمانے میں لوگوں نے ایک شوشہ اٹھایا اور وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تختے پر تصویر بنائی جو بہت رنگین اور خوشنما تھی اور ہاتھی منگا کر اس پر وہ تصویر رکھی اور جلوس نکالا۔ ہزاروں آدمی پیچھے جمع ہو گئے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک کا نام آجائے تو طبعی طور پر مسلمان ٹوٹ پڑتے ہیں، یہاں تک تو ان کی حرکت تھی پھر آدمی بھیجا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے پاس کہ شبیہہ مبارک کا جلوس نکل رہا ہے۔ آپ اس میں شریک ہوں اور مقصد یہ تھا کہ انھوں نے اگر انکار کر دیا تو ہم کو کہنے کا موقع مل جائے گا کہ ان لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم

سے محبت نہیں۔ حضورؐ کے نام کی تصویر تھی۔ ہم نے بلایا مگر وہ نہیں آئے اور اگر آ گئے تو کل کو ان کو کچھ کہنے کا موقع نہیں رہے گا۔

بہر حال اس شخص نے جا کر کہا کہ شبیہ مبارک کا جلوس نکل رہا ہے آپ بھی شرکت کریں۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا۔ اچھا شبیہ مبارک کا جلوس نکل رہا ہے؟ تمام طلباء کو کہا کہ سب چلو۔ لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا جو اپنے تھے وہ بھی خوش ہوئے کہ اب فتنہ نہیں ہوگا۔ اور جو فتنہ پرداز تھے وہ یوں خوش ہوئے کہ اب ان کی زبان بند ہو جائے گی، اب یہ کسی بدعت سے روک نہیں سکیں گے۔

بہر حال شاہ صاحبؒ کے ساتھ ایک مجمع چلا اور جلوس میں بڑی خوشی ہو گئی کہ حضرت شاہ صاحبؒ آ گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے بہت ہی ادب سے شبیہ مبارک کی زیارت کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ بھائی اس سے تو کوئی برکت بھی حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک ہے اس کی برکات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ لوگ حضرت شاہ صاحبؒ کے آنے سے مطمئن ہو گئے تھے، کہا کہ جو مناسب ہو وہ کریں تو شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ گلاب اور کیوڑے کی بوتلیں منگاؤ اور ایک بڑا طشت منگاؤ۔ اس... ہاتھی پر بیٹھ کر اس شبیہ مبارک کو اس طشت میں رکھا، اور چھینٹے دینے شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ وہ تصویر مٹ گئی اور رنگ دھل گیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ جو پانی ہے یہ برکت کی چیز ہے اس میں نسبت ہو گئی ہے کوئی منہ میں لگائے کوئی آنکھوں میں، لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ کسی نے آنکھوں میں لگایا اور کسی نے چہرہ پہ ملا۔ اس طرح تصویر بھی ختم ہو گئی اور جلوس بھی ختم ہو گیا۔

یہ حکمت کی بات تھی کہ منکر کو مٹا بھی دیا اور خود شرکت بھی کر لی تو یہ حکمت کوئی فن نہیں ہے کہ آدمی کو پہلے سے معلوم ہو کہ یوں کر لیا کرو۔ بہت سی باتیں پیش

آتی ہیں۔ سب چیزیں سامنے تھوڑی ہی ہوتی ہیں۔ جو عمل کرتا ہے حق تعالیٰ اس کے دل میں تدابیر بھی ڈالتے ہیں کہ یہاں یہ عمل کرو یہاں یہ کرو۔ شاہ صاحبؒ کی تدبیر سے جلوس کا سارا قصہ بھی ختم ہوگیا۔ اور کسی کو گرانی بھی نہیں ہوئی۔ اور اعتراض کا کوئی محل بھی نہیں رہا کہ کل کو کوئی یوں کہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ بدعت میں شامل رہے۔

حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب مبلغ دار العلوم کا حکمتِ عملی سے کام لینا

مولانا ارشاد احمد صاحب مبلغ دار العلوم نے ایک مرتبہ ایسی ہی حکمت سے کام لیا بنگلور میں جلسہ تھا اور ان کی تقریر تھی بہت بڑا مجمع ہونے والا تھا۔ اور تدبیر یہ تھی کہ ان کی تقریر کے بعد قیام بھی ہوگا۔ اور سلام بھی پڑھا جائے گا اور راز اس میں یہ تھا کہ اگر انھوں نے روکا تو ہم کو کہنے کا موقع مل جائے گا کہ دیکھئے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں۔ قیام اور سلام کو منع کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہم قیام وسلام تعظیماً کرتے ہیں۔ اور اگر نہ روکا اور شریک رہے تو کل سے قیام وسلام پر نہی عن المنکر نہ کر سکیں گے، لوگ اس قسم کی تدبیریں کیا کرتے ہیں مولانا ارشاد احمد صاحبؒ کو علم ہوگیا کہ میری تقریر کے بعد قیام وسلام ہوگا تو مولانا کو فکر ہوئی کہ اگر میں کھڑا نہ ہوا تو لوگ فتنہ اٹھائیں گے اور اگر کر لیا تو کل روکنے کو منہ نہیں رہے گا۔ ان کے ذہن میں تدبیر آئی جب اسٹیج پر پہنچے تو کہا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ کا ذکر مبارک کر رہا ہوں یہ کتنی بڑی بے ادبی کی بات ہے کہ میں کھڑا ہو کر تقریر کروں اور تم بیٹھے رہو یہ بے ادبی ہے کھڑے ہو جاؤ سب کھڑے ہوگئے۔

انھوں نے کھڑے کھڑے تقریر شروع کردی۔ کوئی ۱۵ منٹ پر لوگ بھاگنے

لگے کوئی آدھا گھنٹہ کے بعد بھاگا۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد اخیر میں پندرہ۱۵، بیس۲۰ آدمی رہ گئے۔ نہ وہ قیام ہوا۔ نہ سلام ہوا۔ یہ تدبیر کی بات تھی جوان کے ذہن میں آئی کسی کو اعتراض کا موقع بھی نہیں ملا اور ان کو کہنے کا موقع ملا کہ تم نے تو صرف دس پندرہ۱۵ منٹ قیام کیا، ہم نے تو ڈھائی گھنٹہ قیام کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کرنے پر جیسا موقع ہوتا ہے ویسی ہی تدبیر ذہن میں آتی ہے۔ بشرطیکہ اس لائن پر آدمی لگا ہوا ہو۔

رُکانہ پہلوان کا واقعہ ایک حدیث میں ہے حدیث تو ضعیف ہے مگر منکر و موضوع نہیں صرف ضعیف ہے لیکن فضائل اعمال میں ہے اس لئے لوگ قبول کر لیتے ہیں۔

عرب میں ایک پہلوان تھے رُکانہ ان کا نام تھا وہ بڑے زبردست پہلوان تھے اور مشہور یہ تھا کہ یہ ایک آدمی ایک ہزار سے مقابلہ کر سکتا ہے بہت ہی قوی تھے۔ ان کے بدن کے وزن کی یہ کیفیت تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کی کھال بچھا دی جاتی اور رُکانہ اس پر بیٹھتے اور نوجوانانِ عرب اس کھال کو کھینچتے تو وہ کھال ٹوٹ جاتی پھٹ جاتی۔ مگر وہ حصہ جنبش نہیں کھاتا تھا جس پر رُکانہ بیٹھے ہوتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا، اور فرمایا رُکانہ آخرت آنے والی ہے کیوں اپنی عمر کو ضائع کر رہے ہو اسلام قبول کر لو۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ انھوں نے کہا کہ اے محمدؐ! میں تو نہ کوئی عالم و فقیہ ہوں نہ سمجھ دار۔ میں تو ایک پہلوان ہوں مجھ سے کشتی لڑ لو۔ اگر آپ نے مجھے پچھاڑ دیا تو میں آپ کا دین قبول کر لوں گا۔ آپ نے فرمایا بسم اللہ وہ لنگوٹ کس کر آ گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی آستین چڑھا کر میدان کشتی میں آ گئے

ایک دو داؤں اور پیچ کے بعد حضورؐ نے اس کے کمر میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہاتھ سے اس طرح اُٹھایا جیسے کوئی چڑیا کو اُٹھایا اور آہستہ سے زمین پر رکھ کر چھاتی پر بیٹھ گئے اور فرمایا "رکانہ" اب کہو مگر رکانہ کو یقین نہیں آیا کہ میں پچھڑ گیا ہوں کیوں کہ کسی نے آج تک اسے پچھاڑا ہی نہیں تھا۔

اور حضورؐ نے اس طرح سے پچھاڑا کہ اتنی وزنی لاش کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر پچایا اور آہستہ سے رکھ دیا اس نے کہا کہ کیا میں پچھڑ گیا ہوں مجھے تو یقین نہیں آیا ایک دفعہ اور کشتی لڑو۔ تو حضورؐ نے فرمایا اچھا پھر آپ نے ایک دو داؤں پیچ کے بعد کمر میں ہاتھ ڈال کر اٹھا کر پچایا اور آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ فرمایا اب بتاؤ یہی شرط تو ٹھہری تھی کہ اگر تم پچھڑ گئے تو اسلام قبول کر لوگے اس نے کہا کہ محمدؐ یہ تو آپ کے بدن کی طاقت تو ہے نہیں کہ میری لاش کو چڑیا کی طرح اٹھا کر پچادی ۔معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اندر کوئی چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس اندر ہی والی چیز کی دعوت دے رہا ہوں بدن کی دعوت نہیں دے رہا ہوں، تو پھر رُکانہ نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام میں پختہ ہو گئے اور بڑے بڑے کام بھی کیئے۔

ایک مرتبہ بہت سے چور آئے اور رات کو بیت المال سے بہت سے اونٹ چُرا کر چلتے بنے۔ صبح کو پتہ چلا تو آپ نے فرمایا کہ لوگو! ان کے پیچھے دوڑو رُکانہ نے کہا کہ میں تنہا کافی ہوں ۔چور رات ہی میں نکل کھڑے ہوئے تھے اور تیزی سے بھاگے جا رہے ہوں گے معلوم نہیں کتنی دور چلے جا چکے ہوں گے رکانہ دَوڑ پڑے اور راستہ میں ان کو تھام لیا اور کہا کہ سامان اور اونٹ لے کر واپس چلو۔ چنانچہ ان کو پکڑ کر لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سزائیں دیں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بہت لوگوں کے دل میں حق آجاتا ہے اگر تعصّب نہ ہو

اور واقعی حق طلبی ہے تو حق ضرور کھل جاتا ہے۔

مظفر نگر کے مناظرہ کا اثر مظفر نگر میں ایک مناظرہ ہوا، آریوں کا اور مسلمانوں کا۔ یہ انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت کا واقعہ ہے۔ شروع میں ایسے قصے بہت چھیڑے جاتے تھے تاکہ ہندو مسلمانوں میں تفریق اور نزاع پیدا ہو جائے۔ اس مناظرے میں خود حضرت شیخ الہندؒ تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ حضرت مولانا شاہ انور صاحبؒ بھی تھے یہ حضرت شیخ الہندؒ کی جوانی کا زمانہ تھا آپ کو اللہ نے وجاہت بھی دی تھی اور حسین وجمیل بھی تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے کھڑے ہو کر کچھ فرمایا تو ان لوگوں نے کہا کہ یہ تو چھوٹے مولوی ہیں اگر بڑے بڑے کھڑے ہوں گے۔ تو کیا حال ہوگا۔ ایک نے کہا کہ ان کا چہرہ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام حق ہے اگر چہرہ دیکھ کر میں اسلام قبول کرتا تو آج میں اسلام قبول کر لیتا۔ تو بعضوں کے دل نرم ہو گئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کا تقویٰ وطہارت خود ہی ذریعہ بن جاتا ہے حق تک پہنچنے کا اسی طرح سے مسلمان جب ہندوستان تشریف لائے تو سندھ کی طرف سے آئے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ جب بازاروں سے گذرتے تھے۔ گو ان کا معمولی پوشاک بد ویانہ تھا۔ مگر چہروں پر نور ایمان تھا ان کو دیکھ کر ہزاروں آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہیں ان کے چہروں پر سچائی برستی تھی۔ انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ مگر پھر بھی دیکھنے والوں کے دلوں میں اسلام گھر کر گیا اگر شفقت کے ساتھ دل میں تقویٰ وطہارت بھی ہو تو اس کا اثر ہوتا ہے اور زبان سے بھی نہیں کہنا پڑتا اور اثر ہو جاتا ہے

مباحثہ شاہ جہاں پور کا واقعہ جب مباحثہ شاہ جہاں پور ہوا تو حضرت مولانا

محمد قاسم نانوتویؒ کو دعوت دی گئی۔ اس وقت حضرتؒ کی طبیعت علیل تھی۔ اسلیئے انکار لکھدیا۔ اور پہلے اپنے چند شاگردوں کو بھیجدیا ان میں حضرت شیخ الہندؒ مولانا احمد حسن امروہیؒ اور مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ تھے ان کو بھیجا تھا کہ تم جاکر مناظرہ کرو، مگر بعد میں خود ہی خیال ہوا کہ یہ مختلف مذہب کا اکھاڑا ہے معلوم نہیں نتیجہ کیا نکلتا ہے اور مناظرہ اہم ہے اور مختلف مذاہب کے لوگ جمع ہیں اس میں اچھے اچھے ماہر بھی ہوں گے۔

یہ حضرات بیشک قابلِ اعتماد ہیں مگر ابھی نوجوان ہیں۔ زیادہ تجربہ نہیں تو حضرت نے بھی ارادہ کر لیا۔ اس وقت پیدل سفر کیا کرتے تھے اس لیے پیدل ہی سفر کیا حالانکہ شاہجہاں پور بہت دور ہے۔ ان تلامذہ کو فکر تھی کہ مناظرہ اہم ہے اور ہار مار کا موقع ہے اور حضرت ہیں نہیں اور ہم پر اعتماد کر کے بھیجدیا ہے اللہ تعالیٰ لاج رکھ لے۔ یہ تفکر تھا۔ یہ مناظرہ چاند پور میں تھا جو شاہ جہاں پور سے تقریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہے، بیچ میں ایک ندی پڑتی ہے۔ اس ندی سے جب یہ حضرات پار ہو گئے تو کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ اتنے میں حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ استاذ محترم آ رہے ہیں۔ وہی نیلی لُنگی اور دو پلی ٹوپی میں تھے۔ سادہ لباس رہتا تھا۔ مولانا امروہیؒ نے فرمایا کہ واقعی اُستاذ ہی ہیں اب ان کے دل بڑھ گئے ان کو یقین ہو گیا۔ اور آگئے تو حضرت نے ان کو سواری پر بٹھا دیا خود پیدل چلے مگر ان حضرات سے سواری پر بیٹھا نہیں جا رہا تھا مگر مامور تھے۔ اب یہ حضرات سواریوں پر جا رہے ہیں اور خود حضرت پیدل چل رہے ہیں، اور اُن سے فرما دیا کہ کسی کو میرے آنے کی اطلاع نہ دینا اور نہ میرا نام تبلانا۔

وہاں شامیانے تانے گئے تھے اور اسٹیج بھی لگایا گیا تھا۔ ہندو مسلمان

اور عیسائی سب جمع تھے۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے پنڈت پہنچے۔ پنڈت دیانند خود پہنچے ہوئے تھے جو بانی ہیں آریہ سماج کے، ادھر عیسائیوں میں پادری اسکارٹ جو مشہور فلسفیوں میں تھا۔

غرض ہر مذہب کے اونچے طبقے کے لوگ پہنچے ہوئے تھے مگر حضرت نے اپنا نام بتلانے سے روک دیا تھا۔ اور آپ کا ادھر جانا نہیں ہوا تھا۔ اس لیے لوگ پہچانتے بھی نہیں تھے تو یہ شاگرد حضرات جاکر اسٹیج پر بیٹھے اور حضرت جوتیاں دباکر ایک کنارے میں بیٹھ گئے اب لوگ افسوس کر رہے ہیں۔ کہ اگر ایسے موقع پر حضرت آتے تو کام چلتا مگر کیا کیا جائے ان کی طبیعت خراب ہے۔ خیر مناظرہ شروع ہوا اور پہلی گفتگو اس میں ہوئی کہ شرائط طے کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ مناظرے میں ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے کہ آخری تقریر میری ہو اس سے دلوں میں پائیدار اثر رہتا ہے، تو ہندو کہتے تھے آخری تقریر ہماری ہوگی، عیسائی کہتے تھے کہ ہماری ہوگی اور مسلمان کہتے تھے کہ آخری تقریر ہماری ہوگی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ مگر بات طے نہ ہوئی۔

جب حضرت نانوتویؒ نے دیکھا کہ کام نہیں چل رہا ہے، تو جوتیاں بغل میں دبا کر کھڑے ہو گئے ان کو کوئی پہچانتا نہیں تھا اور فرمایا کہ بھائی یہ بحث ہو رہی ہے میں تو ایک جاہل سا آدمی ہوں مجھے تو کچھ پتہ نہیں ہے۔ باقی ایک بات میری سمجھ میں بھی آئی ہے۔ ممکن ہے اس سے فیصلہ ہو جائے وہ یہ ہے کہ ہندو کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب کروڑوں برس کا ہے وہ اربوں کھربوں کا حساب لگاتے ہیں اور یہودی کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب تین ہزار برس کا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا حساب لگاتے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب پر کوئی تیرہ سو برس گزرے ہیں۔ گویا سب سے اخیر کی قوم مسلمانوں کی ہے، ان کے بعد

کوئی قوم نہیں تو اگر یہ ترتیب بن جائے پہلے ہندو تقریر کریں پھر یہودی، پھر عیسائی اور آخر میں مسلمان کریں تو ترتیب ٹھیک ہوگی سب نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے لوگوں کو حیرت ہوئی اور کہنے لگے کہ یہ تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے بڑھ گئے یہ کون صاحب ہیں کہ اس نے بات ہی ایسی کہی کہ سب راضی ہوگئے مگر اس وقت تک نام بتانے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر لوگ بہت اصرار کرتے تو حضرت ایسے موقع پر اپنا تاریخی نام بتادیا کرتے تھے کہ کہہ دو "خورشید حسن" نام ہے لوگ کہتے تھے کہ یہ مولوی "خورشید حسن" کون ہیں یہ تو کوئی معروف آدمی نہیں ہیں۔ مگر یہ تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے بڑھ گئے۔ انھوں نے تو مناظرہ کا کایا ہی پلٹ دیا۔

اس کے بعد لوگوں میں کھوج شروع ہوئی اور ایک دو پہچاننے والوں نے پہچان بھی لیا تو بات کھل گئی پھر حضرت کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ چنانچہ آپ اسٹیج پر آگئے۔ اس کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔

امیر شاہ خاں صاحب فرماتے تھے کہ جب حضرت تقریر فرما رہے تھے تو لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ کَاَنَّ عَلٰی رُءُوسِهِمُ الطَّیْرُ لوگ ساکت اور صامت تھے اور اس تقریر پر ہر ایک محو تھا، عیسائی جب ہارنے لگتے ہیں تو وہ تقدیر کا مسئلہ چھیڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ کسی کی سمجھ میں آتا نہیں پادری اسکارٹ" نے یہی کیا کہ اخیر میں تقدیر کا مسئلہ چھیڑ دیا کہ جب انسان نیکی اور بدی کرنے پر مجبور ہے تو سزا کیوں دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کا کارخانہ کھول دیا ہے خود ہی کفر اور بدی کرائیں اور یہ بھی کہیں کہ تجھے کفر کی سزا ملے گی۔ یہ کہاں کے انصاف کی بات ہے۔ اس پر حضرتؒ نے تقریر فرمائی۔ کیونکہ تقدیر کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔

امیر شاہ خاں صاحب یہ کہتے تھے کہ اس مجمع میں معمولی قسم کے لوگ بھی ہزاروں تھے بے پڑھے لکھے دیہات کے جاہل تھے تو وہ لوگ کہتے تھے کہ یہ تقریر تو ایسی بدیہی اور کھلی ہوئی ہے کہ ایک ایک مسئلہ دل میں گھر کرتا ہے لوگ بلا وجہ اس کو کیوں چھیڑتے ہیں اس میں تو کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں مسئلہ کو پانی کر کے رکھدیا اس پہ پادری اسکارٹ نے کہا کہ اگر کسی شخص کی تقریر پہ ایمان لایا جاتا تو آج ہم کو مسلمان ہو جانا چاہیئے تھا کہ اس سے بہتر تقریر نہ میں نے سُنی اور نہ آئندہ سُنوں گا کیونکہ ایسے پیچیدہ مسائل کو لوگوں کے دلوں میں پانی کی طرح بہا کر اتار دیا۔ یہ کمال ہے تقریر کا۔ میں مسلمان ہو جاتا اگر تقریر پر مسلمان ہونے کی اجازت ہوتی یہ جب ہوتا ہے کہ آدمی کا تقویٰ و طہارت اور اس کے علم میں گہرائی ہو وہ اثر کرتی ہے قلوب میں بولنے سے پہلے وہ اثر کر جاتی ہے اور لوگ سماع قبول سے سنتے بھی ہیں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں وہی شفقت اور پیار و محبت کا اندازہ ہونا چاہیئے تاکہ لوگ مان لیں ایسا نہ ہو کہ دوسروں کو رُسوا اور ذلیل کر دیا جائے۔ کوئی معصیت میں مبتلا ہے تو تھوڑی دیر صبر کرے بعد میں اس سے تنہائی میں مل کر کہا جائے کہ بھائی یہ بات خلافِ شرع ہے اس کا خیال رکھو وہ خود ہی شرمندہ ہوگا اور مان جائے گا لیکن مجمع میں کہنے سے نہیں مانے گا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ اگر اس طریقے سے کی جائے جس طرح ابھی میں نے تفصیل سے بیان کیا تو انشاء اللہ ضرور کارآمد ہوگی۔

حضرتِ نانوتویؒ کا دوسرا واقعہ

حکیم الاسلام مدظلہ العالی سے سوال کیا گیا کہ حضرت نانوتویؒ کی تقریر شاہجہاں پور میں مشہور ہوگئی تو حضرتؒ جب شاہ جہاں پور سے تشریف لائے تو وہ حضرات جو تقریر میں شریک نہ ہو سکے تھے حضرتؒ سے اس تقریر کو سننے کی تمنا ظاہر کی۔

حضرت نانوتویؒ نے خود تو نہیں بیان فرمایا لیکن بہت اصرار پر حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو بیان کرنے کا حکم دیا۔ حالانکہ وہ پوری تقریر میں شامل نہیں تھے بالکل آخر میں پہنچے تھے لیکن حضرت کے حکم کی وجہ سے بیان سے انکار بھی نہیں کر سکے لیکن جب بیان شروع کیا تو شروع سے آخر تک پوری تقریر بیان کر دی مولانا فرماتے تھے کہ مجھ کو کچھ معلوم نہیں کہ میں نے کیا بیان کیا (یہ حضرت نانوتویؒ کی توجہ تھی کہ زبان تو میری تھی۔ مگر معلوم ایسا ہوا کہ بیان خود آپ فرما رہے ہیں اگر حضرت والا اس واقعہ کی وضاحت فرما دیں تو بہتر ہے۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ یہ واقعہ میرے علم میں تو نہیں ہے البتہ اس کا مماثل دوسرا واقعہ ذہن میں ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرتؒ کی عادت یہ تھی کہ نانوتہ میں رمضان گذارتے اور نماز جمعہ کے بعد عصر تک تقریر فرماتے ایک آیت اور ایک حدیث اختیار کر لیتے پورے رمضان شریف وہی چلاتے ایک رمضان میں حضرت نے یہ حدیث اختیار کر لی کہ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔

اس حدیث پر تین جمعہ مسلسل بیان فرمایا جب چوتھا جمعہ آیا تو طبیعت خراب تھی اور ایسی نہیں تھی کہ بیان کر سکیں تو میرے بڑے پھوپھا مولانا عبید اللہ صاحبؒ غازی صاحبؒ کے دادا یہ اس زمانے میں شرح جامی پڑھتے تھے حضرت نے ان سے فرمایا کہ تم بیان کرو انھوں نے کہا کہ حضرت میں تو شرح جامی پڑھ رہا ہوں مجھے بولنا بھی نہیں آتا اور وہ بھی حدیث پر تقریر اور میں نے ابھی حدیث پڑھی بھی نہیں ہے حضرت نے فرمایا کہ اللہ مدد کرے گا تم بیان کرو وہ پریشان ہوئے کہ ہم شرح جامی کے مبتدی طالب علم کیا بولیں اور وہ بھی حضرت کے قائم مقامی میں لیکن حضرت نہیں مانے اور خود ہاتھ لگا کر مجھے

کھڑا کر دیا کہ جاؤ بیان کرو۔ چنانچہ میں کھڑا ہو گیا اور یہ حدیث پڑھی اور پھر تقریر شروع کی۔ ڈھائی گھنٹے تقریر کی مگر مجھے خود خبر نہیں کہ میں نے کیا کہا اور کیا نہیں کہا۔ لیکن لوگ بہت متاثر تھے اور سبحان اللہ کہتے تھے لیکن مجھے کچھ خبر نہیں۔ البتہ اتنا ہم نے ضرور دیکھا کہ حضرت گردن جھکائے ہوئے میری طرف متوجہ ہیں حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ یہ واقعہ تو میرے ذہن میں ہے باقی دوسرا واقعہ جو آپ نے ابھی بیان کیا وہ میرے ذہن میں نہیں ہے۔

مجلس نمبر ۷

۱۰ رمضان المبارک ۹۴ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۷۴ء

اکابر کا ذوق اور تزکیۂ نفس کی صورت

اس مجلس کی ابتداء میں غالباً کسی نے سوال نہیں کیا بلکہ حضرت نے خود ہی بیان شروع فرمایا البتہ درمیان مجلس میں بعض حضرات کچھ سوالات کرتے رہے اور آپ ان کے جوابات دیتے رہے۔

حکیم الاسلام نے فرمایا کہ بزرگوں پر کسی نہ کسی عمل کا غلبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر حج کا غلبہ تھا پیسے جمع کرتے رہتے جب پورا انتظام ہو جاتا حج کے لیے روانہ ہو جاتے۔ اس طرح سے آپ نے بیسوں حج کئے۔ عبادت میں حضرت مولانا کو حج سے زیادہ مناسبت تھی۔ ہمارے مولانا مبارک علی صاحب مرحوم نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد (حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ) پر صلوٰۃ کا غلبہ تھا واقعی وہ نماز بڑے ہی ذوق وشوق سے پڑھتے تھے اور کہنے لگے کہ انھوں نے مجھے اس نسبت پر لگا دیا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی مجھے بھی لگا دو مگر انھوں نے لگایا تو نہیں لیکن ان میں یہ جذبہ تھا اور کہتے تھے کہ نسبتِ صلاتیہ مجھے ان سے حاصل ہوئی ہے تو بعض پر نماز کا غلبہ ہوتا ہے جب دیکھو نفلیں پڑھ رہے ہیں اور بعض پر حج کا غلبہ، حج نہ ہو تو عمرہ ہی سہی، مطلب یہ کہ بیت اللہ حاضری ہو۔

اور حضرت تھانویؒ پر صفائی معاملات کا غلبہ تھا۔ آپ کی خواہش تھی کہ نہ کسی کو مجھ سے تکلیف پہنچے اور نہ کسی سے مجھے۔ چنانچہ معاملات بہت صاف رکھتے

تھے جہاں کسی نے کوئی عمل کیا آپ نظر رکھتے کہ اس سے کسی کو ضرر تو نہیں پہنچا اور بعض پر انفاق فی سبیل اللہ کا غلبہ ہوتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو انھیں بزرگوں میں سے کسی کے ایک صاحب متعلق تھے، وہ اسٹیشن ماسٹر تھے۔ بھوپال میں ان کے اوپر انفاق کا غلبہ تھا۔ ان کا یہ معمول تھا کہ جب اپنی ملازمت کے فرائض سے فارغ ہوتے تو ریل میں چڑھ جاتے تھے اور تحقیق کرتے تھے جس کے پاس ٹکٹ کے پیسے نہ ہوتے اس کو پیسے دیتے تھے ساری تنخواہ ان کی اسی میں جاتی تھی وہ مسافروں کی خبر گیری کرتے رہتے تھے تو طبائع کی مناسبت ہوتی ہیں اور آدمی اسی لائن سے ترقی کرتا ہے جس سے اس کو ذوق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسی راہ سے اس کو مدارج دیتے ہیں۔ ہر گُلِ را رنگ بوئے دیگراست۔

اور حضرت شیخ الھندؒ پر جہاد کا غلبہ تھا ہر وقت جہاد ہی کی دھن لگی رہتی تھی۔

بیعت کی حقیقت اور تزکیۂ نفس

ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا تزکیۂ نفس کے لیے بیعت ہونا ضروری ہے بہت سے لوگ تصوّف کے منکر ہیں حکیم الاسلام نے فرمایا کہ ایک تو بیعت کی صورت ہے اور ایک حقیقت ہے صورت تو ضروری نہیں مگر حقیقت ضروری ہے، صورت تو یہ ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیدو اور معاہدہ کر لو اور ایک ہے تربیت اور تلقین کرنا یہ حقیقت ہے اور ضروری ہے اس کے بغیر راستہ طے نہیں ہوتا یعنی کسی کو اپنا مرجع بنالے کہ میں آپ کے کہنے کے مطابق عمل کروں گا تا کہ وہ کامیاب ہو جائے تربیت باطن ایک معالجہ ہے اور ظاہر بات ہے کہ معالجہ بغیر طبیب کے نہیں ہوتا۔ اب آپ چاہیں کسی طبیب سے معاملہ کریں کہ آپ میرے فیملی طبیب ہیں۔ ہم اور ہمارے گھر والے سارے کے سارے آپ ہی سے علاج کرایا کریں گے۔ یہ ایسا ہے جیسے بیعت کی صورت اختیار کر لی اور ایک

یہ ہے کہ ذہن میں منتخب کر لیا کہ فلاں طبیب اچھا ہے جب وہ بیمار ہوا وہیں پہنچ گیا۔ معالجے کی حقیقت حاصل ہوگئی۔ گو صورت نہیں بنی۔ اسی طرح تربیت باطن اور تزکیۂ نفس کے لیئے کسی ایک کو مرجع بنا لینا کافی ہے اسلیئے کہ اس راستے میں سینکڑوں ہلاکت کی جگہیں ہیں بعض مرتبہ آدمی کے عقائد تک خراب ہو جاتے ہیں۔ رہنما اور مربّی ہونا ضروری ہے۔ عوام ظاہری مسائل میں ان میں سے کسی کو منتخب کرتے ہیں کہ فلاں جماعت کے علماء متدین ہیں ان سے ہم مسائل پوچھا کریں گے۔

ایک ہے باضابطہ تعلیم پانا اگر یہ نہ ہو تو مسائل میں خود رائی سے نہ چلے بلکہ پوچھ پوچھ کر چلے چنانچہ جو لوگ کسی بزرگ تک نہیں پہنچ سکتے ہیں وہ خط کے ذریعے بیعت ہوتے ہیں۔ پہلے معلوم کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ متبع سنت ہیں وہ صحیح رہنمائی کریں گے پھر خط و کتابت شروع کرتے ہیں۔ وہ بیعت کرتے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حالات لکھتے رہو میں خط کے ذریعہ رہنمائی کرتا رہوں گا۔

علم صرف راستہ بتاتا ہے مولانا حامد علی صاحب ابن مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے دریافت کیا کہ حضرت علم تو خود ہی تزکیہ کرتا ہے پھر بیعت کی کیا ضرورت ہے حکیم الاسلام نے فرمایا کہ علم تو خود تزکیہ نہیں کرتا وہ صرف راستہ دکھلا دیتا ہے۔ تزکیہ تو دوسری چیز ہے جیسے معلم طب، طب کا مسئلہ بیان کریگا کہ فلاں دوا کی یہ خاصیت ہے رہا باقی علاج تو یہ مزاجوں کو پہچان کر ہوتا ہے۔ جب تک طبیب نبض نہ دیکھے اور مزاج کی تشخیص نہ کرے اور موسم کی رعایت نہ کرے اس وقت تک نسخہ تجویز نہیں کر سکتا تو تعلیم طب اور چیز ہے اور مطب اور چیز ہے

تعلیم میں تو صرف علم سامنے آجاتا ہے اور تربیت میں اتباع کی ضرورت پڑتی ہے۔

جیسے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے ان کا جملہ تھا کہ ہر طالبعلے کہ چون وچرا نکند وہر طالب کہ چون وچرا کند ہر دو را چراگاہ باید فرستاد۔ طالب علم کا کام تو یہ ہے کہ خوب چون وچرا لما وکیف کرے یعنی یہ مسئلہ کیسا ہے اور کیوں ہے کس طرح ہے ایسے سوالات کرے تاکہ علم کی تنقیح ہوجائے اور استاذ کو چلنے نہ دے جب تک مسئلہ کو سمجھ نہ لے اور تزکیۂ نفس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں جو شیخ کہدے طالب کو کرنا پڑے گا خواہ وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت ایک شخص دونوں ہو یعنی طالبعلم بھی ہو اور طالب تزکیہ بھی ہو تو اس کے لیے کیا حکم ہے تو حضرت نے فرمایا کہ دونوں ایک شخص میں جمع ہوسکتے ہیں البتہ دائرے الگ الگ ہوں گے جب وہ پڑھنے جائے خوب چون وچرا کرے اور جب اصلاح کے لیے جائے تو شیخ کی اتباع کرے اور خاموش رہے تو یہاں حیثیت کا فرق ہوجائے گا۔

مِنْ حَيْثُ هُوَ طَالِبُ الْعِلْمِ وَمِنْ حَيْثُ هُوَ طَالِبُ التَّزْكِيَةِ جیسے کہ ایک مربی ہو مگر عالم نہ ہو اور ایک عالم ہو مگر مربی نہ ہو اور ایک وہ ہے کہ اس میں دونوں جمع ہوجائیں یعنی عالم بھی ہو اور مربّی بھی ہو جیسے امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ علماء کی تین قسمیں ہیں (۱) عالم باللہ (۲) عالم بامر اللہ (۳) عالم باللہ و بامر اللہ۔ باللہ یعنی ذات صفات کی معرفت اس کو حاصل ہو۔ رات ودن اسمیں مستغرق ہو مگر مسائل وعلم سے زیادہ واقف نہیں اور اصطلاح

سے بھی واقف نہیں اور ایک عالم بامر اللہ ہے کہ قانون شرعی کا عالم ہے اور محقق بھی ہے مگر معرفت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس راستے کو طے ہی نہیں کیا اور ایک عالم باللہ و بامر اللہ ہے وہ ظاہری علوم بھی جانتا ہے اور باطن کے علوم بھی۔ کیونکہ وہ اس راستے پر چلا ہوا ہے۔ ہمارے اکابر مرحومین جامع تھے عالم باللہ بھی تھے اور عالم بامر اللہ بھی تھے دن میں درس و تدریس کا کام ہو رہا ہے اور رات کو مصلے پر بیٹھے ہوئے ذکر اور ذات و صفات کے مسائل بیان کر رہے ہیں اور معرفت کی باتیں ہو رہی ہیں یہ دونوں چیزیں جمع تھیں۔

تصوف کے اعلیٰ مقامات

ایک صاحب کے سوال پر حضرت نے فرمایا کہ جو آپ نے سوال کیا ہے ہمارا خود اس راستے پر گذر نہیں ہوا اگر یہ باتیں معلوم ہو بھی جائیں تو نہ آپ کا فائدہ ہوگا نہ ہمارا کیونکہ اس راستے پر چلنا مشکل ہے۔ صرف علم ہو جائے گا۔ فائدہ کچھ نہ ہوگا۔ پھر آپ نے وہ پرچی حضرت مولانا مفتی احمد علی سعید کو دیدی اور فرمایا کہ آپ ہی جواب دیدیں مفتی صاحب نے پڑھ کر کے حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاری کے حوالہ کر دی انھوں نے پڑھ کر کے فرمایا کہ یہ سوال بہت اونچا ہے پوری مجلس خاموش تھی حضرت نے دیکھا کہ سب خاموش ہیں تو حضرت مولانا بہاری صاحب سے وہ پرچی واپس لے لی اور خود ہی جواب دیا۔

اور فرمایا کہ ایک تو لطیفۂ نفس ہے اور ایک لطیفۂ عقل ہے اور ایک لطیفۂ قلب ہے۔ اور ایک لطیفۂ روح ہے۔ اور ایک لطیفۂ خفی ہے اور ایک لطیفۂ اخفاء ہے اور ہر لطیفے کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ ریاضت اور مجاہدے میں سب سے پہلے لطیفۂ نفس کھلتا ہے اس کے بعد نفس کے جتنے تقاضے ہیں وہ ذریعہ بنتے ہیں معرفت خداوندی کے۔ مثلاً نفس کا تقاضا کھانا، پینا

سونا اور کپڑے پہننا ہے۔ چنانچہ کھانا پینا معرفت خداوندی کا ذریعہ بنتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں جو کچھ کھا رہا ہوں یہ سب کیسی نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کس کس طرح سے ہمیں پہنچاتے ہیں اور اس نے ساری کائنات کے رزق کا ذمہ لے رکھا ہے جس طرح مجھے کھانا مل رہا ہے سارے انسانوں کو بلکہ کیڑوں مکوڑوں تک کو مل رہا ہے۔

جانوروں کی ہزاروں قسمیں ہیں۔ سب کو ان کے مناسب غذا مل رہی ہے۔ اربوں کھربوں مچھلیاں سمندر میں ہیں ان کی غذا وہیں مہیا ہو رہی ہے بہرحال غذا اور طعام و شراب کے راستے سے معرفتِ الٰہی حاصل ہونا کام ہے لطیفہ نفس کا نفس کے جتنے اغراض ہیں۔ ان سب کو حق تعالیٰ کی طرف متوجّہ کرے اور معرفت کا ذریعہ بنا دے اور اس طرح نفس قابو میں آجاتا ہے۔

اس کے بعد لطیفۂ عقل ہے اس میں عموم ہے اس لیے کہ وہ تو شعوری لطیفہ ہے۔ عقلمند صرف یہ نہیں چاہے گا کہ کوئی چیز صرف اس کو مل جائے بلکہ اس کے سامنے پوری نوعِ بشری ہوگی۔ کہ مجھے فائدہ پہنچے اور پھر مجھ سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ گویا وہ اپنی غرض کے سامنے دوسروں کے اغراض بھی رکھے گا۔ اس میں اصول ہوں گے اور وہ ان کو ذریعہ بنائے گا۔ معرفتِ خداوندی کا، اور جب اس کے اندر اس کو کمال پیدا ہو جائے گا۔ تو لطیفۂ عقل اس کا تام اور منوّر ہو گا اس کے بعد میں لطیفۂ قلب ہے تو قلب درحقیقت مخزن ہے ذوقی کیفیات کا جیسے عشق و محبت، ذوق و شوق اور انس جب وہ اس ذوق و شوق و انس کو حق تعالیٰ کی طرف متوجّہ کرے گا تو اس کے ذریعہ اس کو معرفتِ خداوندی حاصل ہوگی۔ تو کہیں گے کہ لطیفۂ قلب اس کا کامل ہو گیا۔ جو کام اس لطیفے کا تھا یعنی کیفیاتِ باطنی وہ ذریعہ بن گئی ہیں معرفت خداوندی کا۔

اس کے بعد پھر لطیفۂ روح ہے وہ مخزن ہے محبت و مودت کا اور اصل فنائیت کا۔ اس لیے کہ عاشق کا کام فانی ہونا ہے وہ محبوب میں فنا ہوتا ہے خود اس کی غرض کچھ نہیں۔ اصل محبوب کی غرض ہے وہی اس کی غرض ہے اس کا ارادہ محبوب کا ارادہ ہے۔ اس کی خواہش محبوب کی خواہش ہے تو اس وقت نفس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور بنی آدم کے جو مطالبات اور ان کی کیفیات ہیں وہ بھی ذہن میں نہیں رہتی ہیں وہ ہمہ وقت فانی اور مستغرق ہوتا ہے ذاتِ خداوندی میں۔ تو اس کے جتنے تقاضے ہیں وہ سب پورے ہو لیں گے تو کہا جائے گا کہ اس کا لطیفۂ روح کامل ہو گیا۔

لطائف روحانی اور اُن کے الوان

اس کے بعد پھر لطیفۂ خفی ہے۔ وہاں غرض ہے کہ میں پہنچوں گا۔ مگر یہاں تو میں ہی سرے سے باقی نہیں رہتی "حیرت اندر حیرت" وہ مدہوش ہو جاتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے سامنے دریا ہے کہ ایک وہ ہے کہ چلّو میں پانی لیا اور دریا سے فائدہ اُٹھا لیا۔ ایک وہ ہے کہ ذرا اندر پانی میں گھسا۔ اور ایک یہ ہے کہ دھار میں پہنچ گیا غوطے کھا رہا ہے نہ اپنی خبر نہ دوسروں کی خبر تو گویا لطیفۂ خفی میں آدمی فانی بن جاتا ہے اور اس فنائیت کے مقام پر پہنچنے کے بعد نہ اپنی کوئی غرض رہتی ہے اور نہ کوئی مقصد رہتا ہے۔ اصل مقصد محبوب بن جاتا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر لطیفۂ اخفاء ہے۔

وہ یہ ہے کہ فنا کی بھی خبر نہ رہے یہ فناء الفناء کہلاتا ہے یہ بھی محسوس نہ ہو کہ میں فانی ہو گیا ہوں۔ وہاں پر جا کر کوئی چیز باقی نہیں رہتی ہے۔ صرف تحیّر رہ جاتا ہے مگر ایک تحیّر ہے معرفت کا اور ایک تحیّر ہے جہالت کا۔ مثلاً ایک تحیّر یہ ہے کہ شے معلوم نہیں تو حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ اور ایک تحیّر یہ ہے

کہ محبوب کے خدوخال سامنے ہیں۔ اور ان میں مستغرق ہے اور حیرت میں ہے کہ کیسا عجیب حُسن ہے کیسا دل فریب جمال ہے نہ اپنے عشق کی خبر اور نہ اس کی خبر کہ میں فانی ہوں یہ انتہائی درجہ ہے اور اس کے تقاضے بالکل الگ ہیں تو ان لطائف کے تقاضوں کو پورا کر دینا یہی ہے تکمیل اللطائف، اور ان سب کے اندر ایک نورانیت ہے اسی واسطے ان کو لطیفہ کہا گیا ہے اور صوفیاء حضرات ان کے الوان بھی لکھتے ہیں کہ لطیفۂ روح اس کا رنگ سیاہ ہے اس لیے کہ سیاہی میں آدمی کو آگے پیچھے کچھ خبر نہیں رہتی وہ فانی ہے اور کسی کا زرد ہے کسی کا سفید ہے کسی کا نیلوفری ہے جو ان کے اوپر منکشف ہوتے ہیں اس لیئے وہ حضرات الوان بھی لکھتے ہیں یہ بڑوں کا کام ہے۔

لیکن اگر فنی طور پہ کہا جائے تو ان کے تقاضے ہیں۔ اور ان تقاضوں کی تکمیل کر لینے سے ان لطائف کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے بعد حضرت اقدس نے فرمایا کہ اس سے مجھے اور آپ کو کیا فائدہ ہوا۔ اصل چیز تو علوم ہیں کہ جن پہ عمل کر کے آدمی آگے پہنچتا ہے اگر انتہاء کی بات کسی نے سنا دی اور آپ نے سُن لیا تو یہی کہیں گے کہ ایسا ہوتا ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ آدمی اس راستے سے گذرے مگر حال یہ ہے کہ اس راستے سے نہ میں گذرا اور نہ آپ گذرے اس لیے نہ مجھے فائدہ اور نہ آپ کو۔

اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ مبتدی کا کام یدور مع الحق ہے یعنی جس طرف حق ہو وہ اسی طرف چلے اور منتہی کا کام یہ ہے کہ جدھر یہ چلے ادھر حق چلے جیسے عمر فاروق رضؓ کے بارے کہا گیا ہے کہ جدھر عمر چلتے ہیں ادھر کو حق بھی چلتا ہے تو یہ انتہائی مقام ہے کہ سرتا پا حق میں آدمی مستغرق ہو جائے جیسے اقبال رحؒ نے کہا ہے کہ سہ

کہ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ⁂ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یعنی حق تعالیٰ خود پوچھنے لگیں کہ تو اپنی رضا ظاہر کر۔ چونکہ وہ حق میں فانی ہو چکا ہے اس لیے وہ رضا عین حق ہو گی۔ تو یہ انتہائی مقام ہے مطلق فنا تو ہر درجے میں ہے۔ باقی کیفیات ہیں۔ ان سے فائدہ کچھ نہیں فائدہ تو ان اعمال میں ہے جن کا آدمی مکلف ہے ان کے کرنے سے ہی کچھ ملے گا۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ ع "می دہد یزداں مرادِ متقی"

یعنی متقی کے دل میں مراد آئے گی تو راستے پیدا ہو جائیں گے۔ پورا ہونے کے لیے جدوجہد کی ضرورت نہیں اور یہ جبھی ہوتا ہے کہ آدمی تابع مطلق بن جائے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا مجاذیب کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے تو حضرت نے فرمایا کہ یہ سارے احوال سالکین کے ہیں۔ مجذوب، مجنون نہیں ہوتے کہ مسلوب العقل ہو جائیں۔ مگر مغلوب العقل ضرور ہوتے ہیں کیونکہ عقل ادھر لگ جاتی ہے اس لیے ادھر کی خبر نہیں رہتی دیوانے اور مجذوب دونوں کی صورت ایک ہے وہ بھی بڑ ہانکتا ہے اور یہ بھی بڑ ہانکتا ہے۔

لیکن فرق یہ ہے کہ دیوانہ مسلوب العقل ہوتا ہے اور مجذوب مغلوب العقل ہوتا ہے مجذوب ادھر کی تو بڑ ہانکتا ہے مگر ادھر بیدار ہوتا ہے۔ مگر یہ مرتبہ کوئی کمال کا نہیں ہے یہ تو تکوینی چیز ہے ایک صاحب نے کہا کہ مجذوب جو کہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے تو حضرت نے فرمایا کہ وہ اپنی عقل سے کہتے ہی نہیں بلکہ جو ہونا ہوتا ہے وہ ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے تکوینی طور پر ان کی زبان چلتی رہتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اِنَّ رَبَّكَ يُصْلِحُكَ فِي هَوَاكَ یارسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے

دل میں جو خواہش ہوتی ہے ۔ آپ کا رب اسے پوری فرما دیتا ہے ۔ مطلب یہ کہ وہ خواہش حق ہوتی ہے اور حق پورا ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا انبیاء کے قلوب کی خواہش باطل نہیں ہو سکتی خواہش ہوگی مگر حق ہی کی ہوگی ۔

اس پر مولانا حامد صاحب نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض خواہش تو پوری نہیں کی گئی ۔ جیسے ابو طالب کے ایمان کی خواہش ، تو ہر خواہش کے پوری ہونے کا کیا مطلب ہے اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ ابو طالب ہی کی کیا خصوصیت ہے آپ کی تو خواہش یہ بھی کہ سارے کفار مسلمان ہو جائیں مگر ایسا نہیں ہوا ۔ لہٰذا خواہش پوری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تعلق تکوین سے ہے اس لیے فرمایا گیا ۔ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ ۔

یہ آپ کے تابع نہیں ہے کہ جسے چاہیں ہدایت دیدیں اور جس کو چاہیں محبت دیدیں ۔ یہ تو ہمارا کام ہے جو خصوصیات حق ہیں وہ حق تعالیٰ ہی پورا فرمائیں گے ۔ بندہ اس میں چاہے بھی تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ پوری ہو جائے کیونکہ اس کا تعلق حکمتِ تکوین سے ہے ۔ انبیاء تو یہی چاہتے ہیں کہ سارے انسان مومن بن جائیں مگر وہی ہوتا ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے ۔

حضرت کے ان بیانات سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی وہ خواہش ضرور منظور ہوتی ہے جو خدا کی مرضی و خواہش کے مطابق ہوتی ہے ۔ رہا یہ سوال کہ ساری خواہش پوری نہیں ہوتی یہ درست ہے ۔ مگر اس سے انبیاء علیہم السلام پر اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بشر ہیں ۔ بعض مرتبہ بشری خواہش بھی ہوتی ہے تو ہر بشری خواہش کا پورا نہ ہونا ۔ اس سے نبوت میں فرق نہیں آتا ۔ اور اس میں مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ساری خواہشات کا پورا نہ ہونا ہی بہتر ہے ۔ کیونکہ ممکن ہے بعض لوگ آپ کی خدائی کا دعوٰی کر بیٹھتے کہ حضورؐ نے جو چاہا وہ ہوگیا اور جو ارادہ

کیا وہ پورا فوراً سامنے آگیا۔

یہ خدا تعالیٰ کی حکمت ہے کہ بعض بشری خواہش کو پوری نہ کر کے ہزاروں انسانوں کو گمراہی سے بچا لیا اور اس طرح آپ کی شانِ عبدیت کو بھی مکمل کر دیا اب آپ کی عبدیتِ کاملہ پر شبہ نہیں ہو سکتا بشرطیکہ عقل سلیم ہو۔ (واللہ اعلم بالصواب)

مجلس ۸

۱۲ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۹۷۴ء

شریعت میں تبلیغ کی حیثیت اور اس کے طریقے اور تعلیم و تبلیغ میں باہمی ربط و جوڑ

سوال ۱:۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ تبلیغ ہمارے اوپر فرض ہے بغیر تبلیغ کے ایمان کامل نہیں ہو سکتا تو حضور والا سے معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا تبلیغ مثل نماز و روزہ کے فرض ہے۔؟

سوال ۲:۔ وہ علماء دین جو تعلیم و تعلم کی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اصل تبلیغ یہی ہے مگر حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ تعلیم و تعلم دعوت الی اللہ کے مقدمات ہیں۔ اصل مقصد[ع] دعوت ہی کا کام ہے یہ تعلیم و تعلم منزل وضو کے ہے لہٰذا فراغت کے بعد تبلیغ و اشاعت کا کام نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے وضو کر کے نماز نہ پڑھنا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ان اقوال سے ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو تبلیغ کے کام میں مشغول ہیں اس میں اعتدال کا راستہ کیا ہے۔

ع اصل مقصد دعوت الی اللہ ہے سارے انبیاء علیہم السلام اسی لیے بھیجے گئے انہوں نے دعوت دی۔

سوال ۳:۔ اگر تبلیغ اسلام اور تبلیغ احکام دونوں فرض ہیں تو کیا صرف تبلیغ احکام سے دونوں کا حق ادا ہو جائے گا۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ جنس تبلیغ واجب اور فرض ہے جیسے نماز اور روزہ اس واسطے کہ قرآن کریم میں ایمان کی دو بنیادیں بتائی گئیں ہیں۔ بلکہ چار کہنا چاہیئے۔ البتہ نوعیں دو ہوں گی۔ سورۂ والعصر میں فرمایا گیا ہے کہ

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ہ

دو چیزیں تو وہ بتائی گئی ہیں جو اپنے نفس سے متعلق ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح یعنی کسی کا ایمان کسی کے کام نہیں آئے گا۔ اور کسی کا عمل کسی دوسرے کے لیے باعث نجات نہیں بنے گا۔ وہ اپنے ہی لئے ہے۔ اس کے بعد میں دوسرا درجہ وصیت کا ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح آپ کے پاس ہے اسے دوسرں تک پہنچائیں حق کی وصیت کریں تو حق میں دونوں چیزیں داخل ہیں یعنی ایمان بھی اور عمل صالح بھی اور اس راستے میں جو مصیبت پیش آئے ان کے جھیلنے کے لیے صبر کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ تو تواصی بالصبر فرمایا۔

یہ تو ہیں تبلیغ کے متعلق کہ حق کو پہنچاؤ اور دعوت الی اللہ دو اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ یعنی دعوت دو اللہ تعالیٰ کے راستے کی جس طرح فرمایا گیا وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ۔ اس میں نماز کا حکم ہے اسی طرح اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ میں دعوت کا امر ہے فرق سرف اتنا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی جزوی حدود بھی شریعت نے بنادی ہے۔ اس درجہ کا نام ایمان ہے کہ تصدیق قلبی ہو اقرار باللسان اس کے لیے شرائط میں داخل ہے اور عمل صالح اس کے لوازم میں ہے کہ وہ جز ہے ایمان کا تو تجزیہ کر کے الگ الگ بتایا کہ ایمان کا یہ

درجہ ہے اور عمل جو اس کے فرائض ہیں ان کے حدود بھی متعین ہیں کہ نماز میں اتنی رکعات ہوں گی اور واجبات اتنے ہیں اور فرائض وسُنن اتنے ہیں تو شارع علیہ السلام نے متعین کر دیا۔ اسلیئے ایمان کے اجزاء متعین ہو گئے لہٰذا کمی و بیشی ممکن نہیں اور نہ ترمیم ممکن ہے۔

اسی طرح وہ عمل صالح جو فرائض و واجبات کے درجے میں ہیں ان کے حدود بھی متعینؑ ہیں کہ دو پر سلام پھیرو۔ یا چار رکعت پر سلام پھیرو صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ وصلوٰۃ النہار اربعۃ اربعۃ

یعنی رات کی نماز دو دو رکعت ہیں اور دن کی نماز چار چار رکعت ہیں لیکن دعوت الی اللہ یہ جنس واجب اور فرض ہے۔ اسیلے اس کے حدود متعین نہیں کئے گئے۔ اور نہ ان کی تجزیہ کی گئی کیونکہ ہر زمانے کی دعوت کے ڈھنگ الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور دعوت کے طریقے بھی مختلف ہیں اگر کوئی تصنیف سے دعوت دے رہا ہے تو وہ کتابی دعوت ہو گئی اور کوئی تقریر سے دعوت دے رہا ہے تو وہ خطابی دعوت ہو گئی۔

اسی طرح سے اور مختلف طُرق ہیں بچوں کو اور نوجوان کو اور طرح کی دعوت دی جاتی ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اور طرح کی اور جاہلوں کو اور طرح کی دعوت دی جاتی ہے۔

اس لیے جنس فرض کر دی مگر کوئی خاص طریقہ متعین نہیں کیا اگر پوری امت اسے مل کر چھوڑ دے تو ساری امت گنہگار ہو گی اگر ایک طبقہ کرتا رہا اور ایک نے نہ کیا تو اُمت پر سے یہ فرض اُٹھ گیا زیادہ سے زیادہ اس طبقہ سے باز پُرس

ؑ اسی طرح نمازوں میں نوافل وتطوعات ہیں ان کے حدود بھی متعین ہیں۔

ہو گی۔ جس نے دعوت کا کام نہیں کیا کہ تم نے اس کام کو کیوں نہیں کیا۔

دعوت کی قسمیں

قرآن مجید نے دعوت کی تین نوعیں بیان فرمائی ہیں۔ مگر وہ بھی اصولی ہے اس میں طریقے متعین نہیں کیئے۔

(۱) اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ (۲) وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ (۳) جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ہ تو حکمت اور موعظت اور مجادلت یہ تین نوعیں ہوئیں اسلیے کہ دنیا میں انسانوں کی قسمیں بھی تین ہیں۔ بعض ہیں دانشور جب عقلی رنگ میں ان کے سامنے کوئی تو حکمت رکھی گئی کہ موقع پہچان کر موقع کے مناسب دعوت دی جائے جیسا آدمی ویسا خطاب۔

جیسا آدمی سامنے مخاطب ہو گا ویسا ہی دعوت کے طریقے ہوں گے ایک وہ ہیں جو سادہ لوح ہیں کہ جب اُن کے سامنے اللہ ورسول کا نام لیا گیا تو وہ گردن جھکا دیتے ہیں ان کے مطالبات نہیں ہوتے ہیں اور نہ لم کی ضرورت سمجھتے ہیں بس وہ حکم جاننا چاہتے ہیں کہ شریعت کا حکم معلوم ہو جائے تو ان کے لیے موعظت ہے کہ وعظ و نصیحت کردو ان کے لیے کافی ہو جائے گی۔ اور بعضے حجت پسند ہوتے ہیں یعنی کٹھ حجت کہ جب تک ان کے مسلمات سے ان پر حجت قائم نہ ہو وہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تو ان کے لیے مجادلہ رکھا اور مجادلہ بھی ڈھنگ علمی انداز پر جھگڑنا سے نہیں۔ پھر اس کا خیال رہے کہ اس میں سخت کلامی نہ ہو بلکہ معروف طرز پر ہو۔

ان کے مسلمات سے ان پر حجت قائم کرو، دین کے مسلمات ان کے یہاں زیادہ نہیں ہیں کیونکہ دین سے مناسبت کم ہے اور عقل سے زیادہ ہے اسی ڈھنگ سے اُن کو دین پر لایا جائے۔ جیسے احادیث میں مختلف طریقے ہیں۔ بعضوں نے شرط لگائی کہ ہم تین وقتوں کی نمازیں پڑھیں گے۔ صرف ۲ پڑھیں

گئے۔ آپ نے قبول فرمالیا۔ بعض نے کہا کہ ہم چار گناہ کرتے ہیں تین تو چھوڑ دیں گے مگر ایک نہیں چھوڑیں گے آپ نے مان لیا۔ حکمت کا طریقہ تھا تو جیسا مخاطب ہو اس کے مناسب حال دعوت دی جائے۔ اب یہ کہ اس حکمت کا اندازہ کیا ہوگا وہ مخاطب اور متکلم پر ہے کہ جیسے اس زمانے کے حالات اور نفسیات ہوں اُن کے لحاظ سے دعوت دی جائے۔

اس لیے شریعت نے ان ڈھنگوں کو متعین نہیں کیا۔ بلکہ صرف اصول بتا دیا ہے۔ اب اس میں علماءِ دین ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ زمانے کے نفسیات کے اعتبار سے کون سا طرز مناسب ہے اگر فلاں مرض قلوب میں غالب ہے۔ تو اس کا اس طرح استیصال کیا جائے گا۔ بقیہ کو بعد میں رکھا جائے۔

اور یہ ہوگا تو داعی کے فہم و تفکر پر فقہاء نے اس کے طریقے متعین کر دیئے کہ اگر آپ کسی کو نصیحت کرنا چاہتے ہیں تو اگر ظنّ غالب یہ ہے کہ یہ قبول نہیں کریگا تو واجب ہے کہ سکوت کرے، اور اگر ظنّ غالب ہے کہ قبول کر لے گا۔ تو تبلیغ کرنا واجب ہے۔ اور اگر بین بین ہے تو اختیار ہے کہ اگر موقع ہو تو کر دو ورنہ دوسرے وقت پر رکھو۔

تو مخاطبوں کے احوال سے فقہاء نے تین طریقے متعین کر دیئے۔ اس کو سمجھنے والا وہی ہے جو داعی ہوگا کہ اس کے اندر نفس فقہ ہے وہ جانتا ہے کہ حالات کیا ہیں۔ اسی کے اعتبار سے نصیحت کرے گا۔ یہ تو اصولی بحث ہوئی۔ اب اِس راستے کے اندر جب آدمی نصیحت کریگا تو ظاہر بات ہے کہ نصیحت اس کے نفس کے خلاف پڑے گی۔ وہ ایک کام سے رکے گا اور دوسرے کام پر لائے گا جن کی عادت پڑی ہوئی ہے ان کو چھڑائے گا۔

بعضے سلیم الطبع ہیں وہ چھوڑ دیں گے لیکن بعضے مقابلے پر آجائیں گے

بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں گے۔ تو اس کے لیے صبر بتلایا۔ چنانچہ اسی آیت میں فرمایا گیا ہے۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ آگے فرمایا کہ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۔

اس راستے میں اگر کوئی تم کو بُرا بھلا کہے تو حق تو تمہیں بھی ہے کہ تم بھی اسی طرح ڈانٹ دو۔ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۔ اگر تم صبر و تحمل سے کام کرو تو یہ اولوالعزمی کی بات ہے تو اعلیٰ طریق نصیحت میں یہی ہے۔ پھر کتاب و سنت میں داعی کی کچھ صفات بیان کی گئی ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صابر ہو۔ دوسری صفت یہ ہے کہ اس میں لین یعنی نرمی ہو۔ یہ نہ ہو کہ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جائے۔ اگر آپ سے باہر ہو گیا تو لوگ نصیحت نہیں سُنیں گے لہٰذا اس کو صبر جھیلنا پڑے گا جیسے انبیاء علیہم السلام نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ ان کو گالیاں دی گئیں بُرے بھلے کہے گئے۔ بُرے بُرے الفاظ سے اُن کو یاد کیا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر مجنون اور کذّاب کہا گیا۔ پھر یہ کہ ایذا رسانی کے تمام طریقے جمع کئے گئے۔ اوجھ آپ کے سرِ مبارک پر ڈالا گیا۔ پتّھر آپ کو مارے گئے۔ کانٹے آپ کے راستے میں بچھائے گئے۔ وطن سے بے وطن کیا گیا۔ گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ لیکن آپ نے صبر و تحمّل فرمایا۔

أَشَدُّ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ ۔ مصیبت میں سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام مبتلا کئے گئے۔ یہ وہی ہیں۔ جو رواجوں کو چھڑا کر دین نافذ کرتے ہیں۔ اور اس میں بڑی مصیبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ اس لیے پہلی چیز ہے صبر اور دوسری چیز ہے لین اور نرمی۔ لوگوں کو پیار و محبّت سے سمجھایا جائے ڈانٹ

ڈپٹ کا طریقہ نہ ہو۔ کیونکہ اس سے چڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔ تو نصیحت کی زینت ہے لینت۔

خوب یاد رکھا جائے کہ سخت گیری، اور سخت کلامی نہ ہو تاکہ نصیحت مؤثر بن سکے۔ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں ارشاد ربانی ہے۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ؕ

تو یہ ہیں اصول دعوت و تبلیغ، اور علماء وقت لوگوں کے حالات کو دیکھ کر موقع و محل کے اعتبار سے ان اصول کو سامنے رکھ کر کچھ اور باتیں تجویز کر سکتے ہیں لیکن اس میں سر پھٹوں کی ضرورت نہیں اصولاً ایک شخص دعوت دے رہا ہے۔ ایک طریقہ اس نے اختیار کیا ہے اگر وہ طریقہ آپ کے خلاف ہو تو بہت سی چیزیں آپ کے خلاف ہوتی ہیں یہ کیا ضروری ہے کہ جو طریقہ آپ کے خلاف ہو۔ اس میں آپ لڑائی مول لیں، اِلّا یہ کہ کوئی چیز کھلی ہوئی خلاف شرع ہو اس میں آپ کہہ سکتے ہیں مگر محض طرز، انداز کا فرق اس میں دوسرے کو معذور سمجھنا چاہیئے۔ کہ اس نے ایک ڈھنگ اختیار کیا ہے کرنے دیجئے۔

فرض کیجئے کہ تبلیغی سلسلہ ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے چھ اصول تجویز کئے وہ زمانے کے حالات کو دیکھ کر کئے۔ اس میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ انفرادی طور پر نہ ہو بلکہ جماعتی طور پر ہو۔ یعنی جماعتیں جائیں اور جا کر تلقین کریں۔ تو دعوت الی اللہ فرض ہے۔ جیسے نماز و روزہ فرض ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض چیزیں فرض علی العین ہوتی ہیں۔ اور بعض چیزیں فرض علی الکفایہ ہوتی ہیں۔ تو واجبات نماز و روزہ فی الذمہ ہیں اور یہ فرائض عینی ہیں سب کو الگ کرنا پڑے گا۔ لیکن دعوت الی اللہ یہ فرض کفایہ ہے۔ اگر چند شخص نے بھی کر لیا تو دوسرے کے سر سے گناہ اٹھ جائے گا۔ اگر کسی نے نہ کیا

تو سارے گنہگار ہوں گے ۔

اب آگے دوسرا مسئلہ رہ جاتا ہے وہ تعلیم ہے تو تعلیم کا مقصود دوسرا ہے اور تبلیغ کا مقصود دوسرا۔ تعلیم تو کہتے ہیں کتاب و سنت کی مرادات اور مقاصد کو مع دلائل کے سمجھنا۔ یہ تبلیغ کا موضوع نہیں ہے اور تبلیغ کا موضوع نفس دین پہنچانا ہے کہ بھائی دین پر قائم رہو۔ لیکن اس کے دلائل کیا ہیں اس کے وجوہ کیا ہیں اور کتاب و سنت سے یہ دینی باتیں کس طرح نکلتی ہیں یہ موضوع ہے تعلیم کا ہر مسئلے کو سمجھایا جائے عقائد کو بھی اور مسائل کو بھی تو تعلیم کا موضوع محدود ہے اور تبلیغ کا موضوع عمومی ہے صرف احکام شریعت جہلاء تک پہنچائے جائیں کیونکہ وہ دلائل وغیرہ کو نہیں سمجھتے اور ان کے سامنے یہ رکھا جائے کہ فرائض و واجبات پر عمل کرو تو یہ کہنا کہ تعلیم دینے والوں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا یہ غلط ہے کیونکہ اس کا موضوع ہی دوسرا ہے یا تبلیغ والے یہ کہیں کہ ہم نے تعلیم کا حق ادا کر دیا یہ بھی غلط ہے۔

کیونکہ نہ ان کے یہاں دلائل ہیں نہ حقائق ہیں صرف دین کے اوپر چلنے کی تمنا ہے انھوں نے فضائل بیان کر کے دین پر چلنے کے لیئے آمادہ کر دیا۔ اب آگے ضرورت پڑے گی تعلیم کی۔ تو تبلیغ و دعوت سے جذبہ تو پیدا ہو گیا دین پر چلنے کا مگر طریقہ معلوم نہیں کہ کس طرح چلیں تو تبلیغ کے بعد ضرورت ہے تعلیم کی، خواہ وہ اردو میں ہو یا عربی میں ہو۔ صورت جو بھی ہو مگر تعلیم ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ خیر و برکت میں جب تبلیغ عام ہوئی اور آپ نے داعیوں کو روانہ فرمایا کہ وہ دعوت دیں۔ دعوت دینے والے کی سعی سے اگر ایک قبیلہ بھی اسلام کی طرف آجاتا تھا تو وہاں جم جاتے تھے اور مہینوں ان کو کتاب و سنت کی تعلیم دیتے تھے تاکہ دین کے مسائل معلوم ہوں

تو نفسِ تبلیغ سے دین پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں صرف ایک کے کرنے سے دوسرے کا حق ادا نہ ہوگا۔

تعلیم کا دوسرا موضوع یہ ہے کہ کتاب وسنت سے مسائل نکال کر یہ بتانا کہ اس کی غرض وغایت کیا ہے۔ غرض وغایت بتا کر پہلے تو عمل کرانا اور اس کے بعد جذبہ پیدا کرنا ہے کہ اس چیز کو دوسروں کو پہنچاؤ یعنی دعوت الی اللہ کرو تو تعلیم کا موضوع ہوا استعمال بعد میں دعوت، اور دعوت الی اللہ کا موضوع ہے کہ دین پر آؤ اور پھر تعلیم پاؤ تو معلوم ہوا کہ ایک دوسرے سے مربوط ہے مگر لوگوں نے ایک دوسرے کو مقابل میں ڈال دیا۔ جو درست نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کے لیے تبلیغ ضروری ہے اور تبلیغ کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ اگر کوئی تبلیغ تعلیم سے کٹ جائے تو وہ تبلیغ جہالت ہوگی۔ تبلیغ دین نہ ہوگی۔ تو تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ تبلیغ کی طرف لاؤ اور تبلیغ کا تقاضا یہ ہے کہ تعلیم کی طرف لاؤ یہ ایک دوسرے کے لئے لازم ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی تبلیغ ودعوت کا مقصد

حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے اس کام کو اُٹھایا ایک مجلس میں حضرت مولانا نے فرمایا جسمیں میں بھی موجود تھا۔ میرا مقصد اس دعوت وتبلیغ سے یہ ہے کہ لوگ اس کے بعد تعلیم کی ضرورت محسوس کریں۔ تاکہ معلّمین کے پاس جاکر وہ علمِ دین سیکھیں اور مشائخ کے پاس جاکر اپنے اخلاق کی تربیت کرائیں ہم نے تو صرف یہ جذبہ پیدا کر دیا کہ اپنے اخلاق درست کرو۔ مولانا کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تبلیغ مقدمہ ہے تعلیم کا۔

اب آگے ہے طریق، مولانا نے ایک طریق اختیار فرمایا۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کے حالات کے پیشِ نظر سب سے پہلی چیز اس زمانے میں عمومیت اور اجتماعیت

اور جمہوریت ہے۔ انفرادی طور پر اس زمانے میں کوئی چیز چلتی نہیں۔ حتیٰ کہ کھیل کی بھی ٹیمیں بنتی ہیں۔ فلاں ٹیم فلاں ملک میں جارہی ہے تو یہ اجتماعی بن گئی۔

اسی طرح لہو ولعب بھی ہے یہ تو ہمارے یہاں لہو ولعب ہے مگر یورپ والوں نے اس کی ایجاد کی ہے اس لیے اس کو ایک نظم کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور ان کے یہاں زندگی منضبط ہے مگر ہمارے یہاں منضبط نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے سے ٹکرادیا ہے حالانکہ اسلام میں ٹکراؤ نہیں ہے اگر ہم ان میں ٹکراؤ ڈال دیں گے تو درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانوں میں ٹکراؤ پیدا کرنا ہوگا۔

آپ کی ایک شان تعلیم کی ہے کہ آپ معلم ہیں آپ نے فرمایا کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا میں بھیجا ہی گیا ہوں معلم بنا کر۔ ایک شان آپ کی داعی ہونے کی ہے کہ آپ دعوت دے رہے ہیں اور ایک آپ کی تمرین کی شان ہے کہ ان کو کام پہ لگاؤ تو ان میں اگر ٹکراؤ ڈال دیا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ٹکراؤ ڈالنا ہو گیا۔ ہر شان کا ایک مظہر ہے۔ مبلغین کی جماعت یہ مظہر ہے دعوت کا اور معلمین کی جماعت مظہر ہے شانِ تعلیم کا۔ اور مشائخ کی جماعت جو لگاتے ہیں کام پر یہ مظہر ہے شان تمرین کا۔ تو ہر جماعت ایک ایک شان کا مظہر ہے تو ان جماعتوں میں ٹکراؤ ڈالنے کا مطلب ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف شان میں تضاد پیدا کرنا اور اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ دین میں تضاد ہے۔ وہ اسے جاہل کہے وہ اسے احمق کہے۔ حالانکہ دونوں دین کا کام کر رہے ہیں اور دین میں تضاد ہے نہیں۔ تو مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ اس زمانے میں عمومیت اور جمہوریت واجتماعیت سب سے بڑی چیز ہے۔ تو انھوں نے تبلیغ کے اندر بھی ایک عمومیت اور اجتماعیت پیدا کر دی۔ رہا انفرادی طور پہ وعظ کہہ دینا۔

یہ علماء کا کام ہے وہ کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہے لیکن اس زمانے میں اثر جو ہوگا وہ اجتماعی رنگ میں ہوگا۔ اسلئے انھوں نے جماعتی تبلیغ رکھی کہ اکیلے آدمی نہ جائے بلکہ جماعت کے ساتھ جائے۔

دوسری چیز اس میں انھوں نے فضائل رکھا کیونکہ فضائل میں اختلاف نہیں ہے اور اس سے دین پہ چلنے کی ترغیب ہوتی ہے اور مسائل کو اسلیے نہیں رکھا کہ مسائل میں اختلاف ہے اگر مسائل بیان کیئے گئے تو لوگوں میں اختلاف پیدا ہوگا لوگ اختلاف کے شکار بن جائیں گے۔ اور اصل کام سے رہ جائیں گے۔ لیکن یہ چیز ناتمام ہوگی اگر جذبات کو نکالنے کا طریقہ تعلیم کے ذریعہ پیدا نہ کیا جائے کیونکہ یہ لازم ہے اس کے لیے دوسری چیز انھوں نے یہ دیکھی کہ داعی اور مبلغ اس وقت کام کر سکتا ہے جبکہ اپنے سامانِ عیش و آرام کو چھوڑ دے کیونکہ اگر وہ ہر وقت آرام و عیش میں رہا تو وہ تبلیغ کیا کرے گا۔ اس کو تو اپنے نفس ہی کے آرام سے فرصت نہ ہوگی۔ اسلیے مولانا نے دوسرا اصول رکھا کہ گھروں سے ان کو نکالو۔ اور گھروں کے عیش و آرام کو چھڑا کر ان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جاؤ۔ اب وہ خود ہی اپنے سامان لادے ہوئے جا رہے ہیں۔ اور جیسا جہاں موقع مِلا وہیں پڑ رہے۔

فرض کیجئے کہ کسی نے ایک چلّہ دے دیا تو اُسے ایک نئی زندگی معلوم ہوگی کیونکہ گھر والی زندگی عیش و آرام کی ہے اور یہ محنت اور جفاکشی والی زندگی ہے پھر ایسے لوگوں کے پاس پہنچتے ہیں کہ جن کے ذہنوں میں یہ ہے ہی نہیں کہ تبلیغ ہمارے ذمہ بھی فرض ہے۔

حالانکہ اسلام نے ہر مسلمان کو داعی بنایا ہے لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا۔ کہ دعوت دینا صرف علماء کا کام ہے ہمارے ذمہ نہیں ہے۔

حضرت مولانا نے اس روگ کو نکالنے کی کوشش کی تاکہ ہر شخص داعی بنے مگر بات وہی ہے کہ جو داعی بنے وہ مسائل بھی سیکھے اگر مسائل سے واقفیت نہیں رہی تو اسٹیج پر آکر جہلا ایسی باتیں بھی کہیں گے جو خلاف شرع ہوں گے مسائل کے خلاف بھی ہوں گی۔ اس سے لوگ خرافات اور بدعات و منکرات میں مبتلا ہوں گے تو تبلیغ کا الٹا اثر ہو جائے گا۔ تو تبلیغ اس لیے رکھی تاکہ یہ دین پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کر دے تو اس کے بعد اس جذبے کے نکالنے کا طریقہ مسائل ہیں خواہ تعلیم سے ہو یا کتاب پڑھ کر ہو یا کسی مدرسہ میں داخل ہو کر ہو۔ یا مُفتیوں سے فتاوٰی معلوم کر کے، کہ یہ مسئلہ پیش آیا ہم کیا کریں تو اس کے حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہیں۔ مگر وہ سب لازم ہیں۔

لہٰذا بلا تعلیم کے اگر تبلیغ کی گئی تو وہ تبلیغ جہالت بن جائے گی اسلئے اس کے لیے علماء ہوں تو وہ اور زیادہ اچھا کام کریں گے۔ عالم تو محض مقلد نہیں ہے وہ بھی تبلیغ کے طریقے ذہن میں بٹھائے گا۔ اور یہ بھی کہے گا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے یوں ہونا چاہیئے۔ اور یہ طریقہ ٹھیک نہیں یوں ہونا چاہیئے۔ مگر علماء کو چاہیئے کہ جو طریقے ان کے ذہن میں ہوں۔ تبلیغی جماعت کے ذمہ داروں کے سامنے پیش کریں۔ یہ نہیں کہ عوام کے سامنے پیش کر دیں۔ ورنہ عوام تو سرے سے تبلیغ سے بدظن ہو جائیں گے۔ اگر عوام میں یہ اعلان کیا کہ یہ طریقہ غلط ہے تو عوام بدظن ہو کر چھوڑ دیں گے۔ نہ تعلیم کے رہیں گے نہ تبلیغ کے۔

اس کا طریقہ یہی ہے کہ ذمہ دارانِ تبلیغ سے کہیئے کہ اس کی رعایت کیجائے اگر وہ مناسب سمجھیں گے تو مان لیں گے۔ اگر مان لیا تو نِبَھا اور اگر نہیں مانا تو اُن کا وہ طرز ہے اس پر چل رہے ہیں۔

علماء کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اس کی مخالفت کریں وہ ایک ڈھنگ

اختیار کر کے اس پر چل رہے ہیں آپ دوسرا ڈھنگ اختیار کریں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس میں ٹکراؤ پیدا کیا جائے کہ وہ کہیں تم میرے راستے پر آجاؤ اور تم ان سے کہو کہ ہمارے راستے پر آجاؤ اس سے مخالفت پیدا ہوگی۔ لہٰذا تم دوسرا راستہ اختیار کرو۔

بہر حال تبلیغ ان پر بھی فرض ہے اور آپ پر بھی فرض ہے یہ کام ہر ایک کے ذمہ ہے یہ طریقہ جو ہے کہ علماء اعتراض کریں مبلغین پر اور مبلغین اعتراض کریں علما پر، اس سے ضعف اور ٹکراؤ پیدا ہوگا اور جو کام ہو رہا ہے وہ بھی رک جائے گا۔ اب اگر علماء حضرات جماعتِ تبلیغ کے مقابل آجائیں اور جماعتِ تبلیغ مدِ مقابل علماء کے آجائیں۔ اور جماعت والے یوں کہیں کہ علماء کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مدرسہ میں بیٹھ کر کتابیں پڑھائیں۔ ان کے پاس دعوت کا کام نہیں ہے۔ اور علماء یوں کہیں کہ جاہل لوگ تبلیغ کا کام کرتے ہیں ان کو شعور نہیں ہے تو اس سے ان میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے گا۔

لہٰذا ضروری یہ ہے کہ ایک جماعت دوسرے سے مل کر کام کرے تبلیغ والے افراد لوگوں میں جذباتِ دین پیدا کریں۔ اور علماء حضرات مکاتب قائم کرتے چلے جائیں۔ تاکہ تعلیم ختم نہ ہو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ چندے ہی کے مدرسے ہوں جیسے قدیم زمانے میں دستور تھا کہ ہر مسجد میں ایسا امام رکھا جاتا تھا جو بچوں کو تعلیم بھی دے اس لیے اِس زمانے کے بچے جو پڑھے ہوئے ہیں ان کا دین مضبوط ہے۔ بہ نسبت اس زمانے کے بچوں کے۔ مگر اس وقت امام ڈھنگ کا ہوتا تھا وہ بچوں کو پڑھاتا بھی تھا۔ اور مسائل بھی بیان کرتا تھا۔ اور امامت بھی کرتا تھا اور تبلیغ و دعوت کا کام بھی کرتا تھا۔

بہرحال جب تعلیم و تبلیغ کا جوڑ پیدا ہوگا تو اس سے کامیابی ہوگی اور دوسری بات یہ ہے کہ اس سے تعلیم و تبلیغ دونوں جمع ہو جائیں گے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جہاں جہاں عربی مدارس قائم کریں وہ مرکزی مدارس کو لکھیں کہ اتنا کام ہمارا تھا۔ ہم نے کر دیا اب تم سنبھالو، تو علماء تو یہ سمجھیں گے کہ یہ تو ہمارا ہی کام انجام دے رہے ہیں کہ جگہ جگہ مدرسے و مکتب قائم کیئے تو اس کا نظم بنے گا۔ اور علماء جہاں بھی ان مدارس میں کام کریں وہاں کے لوگوں میں دعوت کا جذبہ پیدا کریں۔ اور جماعت تبلیغ کو لکھیں کہ ہم نے ان میں جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اب تم آؤ اور ان کو گھروں سے نکالو اور چلاؤ۔ تو اس طرح سے دونوں آپس میں جڑ جائیں گے۔ اس جڑنے میں دونوں کا فائدہ ہے اور ٹوٹنے میں دونوں کا نقصان ہے لیکن آج کل یہ دیکھا جاتا ہے کہ علماء یہ کہتے ہیں کہ تبلیغ سے جہلاء کی جماعتیں تیار ہو رہی ہیں۔ جاہلوں سے کیا بنے گا۔ ان میں نہ کوئی عالم قرآن ہے نہ عالم فقہ[ع]، تو یہ دونوں طریقے غلط ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ایک دوسرے کا معاون بنے رہیں۔ اور اصلاح کی کوشش کریں۔ اگر نہ مانیں تو اپنے کام کو اپنے طرز پہ چلائیں اس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔

بہرحال تبلیغ کا ایک کام ہو رہا ہے اور اس کا فائدہ بھی ظاہر ہے اسمیں بعض نقائص بھی ہیں لیکن فوائد بھی ہیں۔ لہٰذا اگر نقائص پہ زور دیا گیا تو وہ فوائد بھی بند ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ ہونا چاہیئے کہ جو فوائد ہیں وہ چلتے رہیں اور جو نقائص ہیں ان کی اصلاح کرتے رہیں۔

ع اور اگر تبلیغ والے کہتے ہیں کہ یہ انبیاء کا کام ہے جو دین کا اصل مقصد ہے علماء اس سے دور ہیں گویا علماء کو معتوب کرتے ہیں۔

تبلیغی جماعت والوں نے اس پر بھی زیادہ زور دیا ہے کہ کلمہ طیبہ کی حقیقت مسلمانوں کے دلوں میں جماؤ اور توحید کے اوپر لاؤ جو اصل بنیاد ہے اور دوسرے نماز اور ذکر اللہ پر زور دیا ہے کہ اگر نماز کی پابندی ہو گئی اور ذکر کی شان پیدا ہو گئی تو ہزاروں چیزوں کی اصلاح ہو جائے گی۔ اور دینی جذبہ پیدا ہو گا تو ان کی نگاہ اس پر ہے۔ ہر جماعت اپنے اپنے درجہ میں کام کر رہی ہے۔ نقائص سے کون خالی نہیں۔ آپ مدارس لیے بیٹھے ہیں تو کیا مدارس میں نقائص نہیں ہیں بہت سے نقائص ہیں۔

لہٰذا نقائص کو سامنے رکھ کر یہ فیصلے کر لینا کہ مدارس کو چھوڑو سراسر غلط ہے اصل فیض تو جاری رہے اور نقائص کی اصلاح کی جدوجہد ہو۔ اسی طرح اگر تبلیغی سلسلے میں کوتاہی ہے تو آپ اصلاح کی کوشش کریں اگر اصلاح نہیں ہوتی تو اتنا زور نہ دیں کہ جو اس سے فوائد مرتب ہوتے ہیں وہ بھی بند ہو جائیں۔ ماحصل یہ ہے کہ ان دونوں میں ٹکراؤ نہیں کرنا چاہیئے یہ دونوں لازم ہیں متضاد نہیں ہیں۔

مولانا محمد الیاسؒ نے موجودہ زمانے کے احوال کو دیکھ کر کام شروع کیا کیونکہ لوگوں کے دلوں سے دعوت کا جذبہ ہی نکل گیا تھا۔ تو انھوں نے اس کی اصلاح کی۔ اور اسمیں کامیابی بھی ہوئی داعیوں کا لشکر پیدا ہو گیا۔ چاہے اسمیں جہلاء ہی زیادہ ہوں۔ اب آگے ان کا فرض ہے کہ وہ جہل کو دور کر کے علم حاصل کریں کتابیں دیکھیں اور مسائل معلوم کریں تو وہ نقائص رفع ہو جائیں گے۔

درمیان میں حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی سے بعض حضرات نے کہا کہ تبلیغی جماعت میں بہت سی کوتاہیاں ہیں اس پر نکیر کرنی چاہیئے۔ تو حضرت نے فرمایا کہ اگر اسٹیج پر نکیر کی گئی تو لوگ نہ ادھر رہیں گے نہ ادھر کے۔ نقائص تو رفع ہونگے نہیں البتہ جو فوائد ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔ ان کا بھی یہ فرض ہے کہ جو تعلیم میں

کوتاہی ہے اس کو علماء کے سامنے رکھیں کہ یہ تعلیم میں کوتاہی ہے اور واقعہ یہ ہے
کہ کمی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں جو طالب نکلتے ہیں ان کا مقصد صرف
کتاب ہوتا ہے کہ پڑھ لیے اور جا کر پڑھا دیے لیکن جو دعوت الی اللہ کا جذبہ ہے
وہ پیدا نہیں ہوتا حالانکہ وہ اصل ہے وہ جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ جو بھی طریقہ
دعوت کا اختیار کریں وہ ہونا چاہیئے۔ وعظ و تقریر یہ تربیت نہیں ہے بلکہ یہ تو
تذکیر ہے آپ نے کسی بھولے ہوئے مسئلے کو تقریر میں یاد دلا دیا ایک یہ ہے
کہ عوام کو دین پر لگانا یہ اسوقت تک نہیں ہوگا۔ جب تک کہ آپ انھیں سمیٹ کر
نہیں لائیں گے۔ محض اسٹیج پر وعظ کہدینے سے لوگ نہیں لگیں گے۔ کہیں پڑ رہنے
ہی سے کام بنتا ہے کہ جا کر لوگوں کی تمرین و تربیت کیجئے کامیابی ہوگی۔ علماء میں
یہ کمی ہے اور ان میں تعلیم کی کمی ہے تو ان دو کمیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔
اب تک تو حضرت حکیم الاسلام نے تبلیغ احکام کے سلسلے میں بیان فرمایا۔
اور مختلف پہلوؤں سے تعلیم و تبلیغ میں جوڑ اور ان کے طریقے بیان فرما کر تبلیغ و
تعلیم کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی۔

اصل تبلیغ صرف تبلیغ اسلام ہے

پھر حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ تبلیغ تو حقیقت میں اُسے کہتے ہیں کہ ایسے
لوگوں تک دین پہنچانا جن کے پاس دین نہیں ہے یعنی غیر مسلموں کو دعوت دینا
جیسے سلف میں دستور تھا کہ بعضوں نے فنِ طب اختیار کیا اور طب کے اندر جذبہ یہ تھا
کہ ہم دعوت دیں گے۔ کیونکہ مریض طبیب سے متاثر ہوتا ہے۔
جب طبیب مریض کے کانوں میں ایک چیز ڈالتا رہے گا تو مریض متاثر
ہوگا۔ تو بعضوں نے طب کے راستے سے اسلام کی دعوت دی۔ اور ہزاروں کو مسلمان
بنا دیا اور بعض حضرات نے تجارت کی لائن اختیار کی اور موضوع ان کا دعوت تھی۔

اسلئے کہ جب دُکان لے کر آپ بیٹھیں گے تو حکومت کے قوانین معلوم کرکے رہیں گے۔ جیسے اس زمانے کا دستور ہے کہ جو قانونی چیزیں ہیں۔ ان کو ہر تاجر جانتا ہے کہ یہ چیز قانون کے خلاف ہے اور یہ قانون کے موافق۔ اسمیں اپنا بچاؤ بھی کرتا ہے اور دوسروں کا بھی۔ سامان اس قدر لے جارہے ہو مگر میں اتنا ہی لکھوں گا ورنہ قانونی گرفت ہوگی تو تاجر اگر دیندار ہوں تو مسائل شرعیہ بیان کریں گے کہ یہ بیع باطل ہے یہ بیع فاسد ہے اور یہ بیع بالوفا ہے کیونکہ بیع کی بہت سی قسمیں ہیں۔

تو جب دُکانوں پر اہلِ علم ہوں گے تو یقیناً دین کے مسائل آئیں گے۔ اور غیر مسلم اس سے متاثر ہوں گے کہ جس دین نے ان چیزوں کو اس طرح سمجھایا ہے وہ دین یقیناً حق ہے۔ چنانچہ اس لائن سے ہزاروں انسان دائرے اسلام میں داخل ہوئے۔

آٹھ صحابہ کی چین میں آمد اور ان کی دعوتِ اسلام

جیسے کہا جاتا ہے کہ چین کے اندر آٹھ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم پہنچے اور تاجر بن کر پہنچے اور تجارت کی لائن سے انھوں نے تبلیغ اسلام کی دیانت اور معاملے کی صفائی اور سچائی پر عمل کر کے انھوں نے دکھلایا اور لوگوں کو آمادہ بھی کیا تو ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ہو گئے اور ان چیزوں پر چلنے لگے کہ واقعی یہ دیانت کا راستہ ہے۔ اس سے مقامی چینیوں کے اندر حسد پیدا ہوا کہ ان کی دکانیں چل رہی ہیں اور مقامی دُکانیں ٹھپ ہیں۔ یہ حضرات سچے تھے اسلئے تجارت میں فروغ ہوا۔ اور دوسرے دغل فسل کرتے تھے۔ تو مقامی تجار حکومت کے پاس پہنچے کہ یہ غیر ملکی تاجر کہاں سے آگئے ہیں۔ انھوں نے بازار ٹھنڈے کر دیئے ان کو یہاں سے نکالا جائے۔ چنانچہ ان آٹھوں حضرات کو حکومت نے بلایا اور کہا کہ تم ہمارے ملک کو کیوں تباہ کر رہے ہو انھوں نے کہا کہ ہم تباہ کر رہے ہیں یا آباد کر رہے ہیں۔

ہم نے دیانت داری سکھلائی۔ معاملے کی سچائی سکھلائی تو یہ کام ملک کے فروغ کا ہے تباہی کا نہیں ہے مگر انھوں نے کہا کہ تم لوگ نکل جاؤ تو ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہماری غلطیاں بتلائیں ہم ان کی اصلاح کریں گے۔ جب کوئی غلطی نہیں تو خواہ مخواہ آپ یہ کہہ رہے ہیں ہم نہیں جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہم زبردستی نکالیں گے تو ان آٹھ آدمیوں نے پوری چینی حکومت کو چیلنج کر دیا کہ ہم نہیں جائیں گے۔ وہاں سے جبراً حکم ہوا کہ انھیں یہاں سے نکالو۔ جب ان کے نکلنے کا وقت آیا تو چین کے سارے عوام ان کے ساتھ تھے کہ جہاں یہ جائیں گے ہم بھی جائیں گے۔ یہ منظر دیکھ کر ذمہ دارانِ حکومت نے کہا کہ جب اس قدر لوگ ان کے ساتھ چلے جائیں گے۔ آپ حکومت کس پر کریں گے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو آڈر واپس لینا پڑا۔ اور کہا کہ تم اپنے کام میں لگے رہو۔ ان آٹھ آدمیوں کا ثمرہ ہے کہ آج چین میں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں تو انھوں نے تجارت کی لائن سے دین پھیلایا۔

حضراتِ صوفیاء کی تبلیغی خدمات

حضراتِ صوفیاء ہندوستان میں آئے کیونکہ ہندوستان میں سب سے بڑا مذہب رہبانیت اور ترک لذات و جوگ عوام سے کنارہ کشی وغیرہ تھا۔ اسکی قدرتی طور پر جب نفس کشی ہوتی تھی۔ تو وہ سمجھتے تھے کہ کچھ نہ کچھ نفس میں جلا بھی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ان سے خوارق کا ظہور بھی ہوتا تھا۔ تو انہوں نے سوچا کہ یہاں کورے مولوی کافی نہیں ہوسکتے کہ صرف مسئلہ بیان کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صوفیاء کو بھیجا گیا۔ انہوں نے کچھ خوارق دکھلائے۔ اگر جوگیوں نے پہاڑ کو اڑایا تو خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے فرمایا کہ رُک جا چنانچہ وہیں رُک گیا اسوقت ہندوستان میں صرف مسئلہ بتانا کافی نہیں ہوتا۔ اسلیئے ہندوستان میں زیادہ تر صوفیاء آئے

اور اُنھوں نے دین پھیلانے کی کوشش کی۔ دیکھا جاتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو طبعی طور پر صوفیت سے اُنس ہے مولویت سے اُنس نہیں ہے۔ یہاں آج بھی اگر دین پھیلانا چاہیں تو صوفیاء کے طرز پر تو پھیلا سکیں گے۔ لیکن مولویانہ طرز پر پھیلانا بہت مشکل ہے۔ جیسے خواجہ اجمیریؒ کا طرز تھا کہ ایک جھونپڑی میں بیٹھ گئے جس میں اجمیر کے ہندو اور مسلمان سب جمع ہوتے اور شیخ کی امانت اور دیانت اور تقویٰ اور قلبی اثبات کو دیکھ کر ہزاروں انسان دائرہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ مسٹر آرنلڈ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اور یورپین تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے پریچنگ آف اسلام۔

اس میں اس نے تبلیغ اسلام کے دورا ور طرق دکھلایا ہے اور اسمیں اسنے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے ہاتھ پر ۹۹ لاکھ آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں اور ان کے خلفاء کے ہاتھ پر جتنے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے وہ تعداد میں الگ ہے تو ایک ایک درویش اور صوفی و عارف باللہ نے خطوں کو رنگ دیا۔

اسلام سے روس و فارس کے اندر جنگ و جدل کا قصہ تھا۔ فارس میں رستم اور بڑے بڑے پہلوان تھے۔ اسی طرح روم کے اندر بڑے بڑے جسیم پہلوان تھے۔ وہاں صحابہ گئے اور جنگیں کر کے ان کا زور توڑ دیا اور لاکھوں انسان دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ تو جہاں جہاں یہ حضرات پہنچ گئے وہاں ملک کے ملک کو مسلم بنا دیا۔ آج جو ہم فخر کرتے ہیں کہ ایران مسلم ملک ہے عراق مسلم ملک ہے اور افغانستان مسلم ملک ہے یہ مسلم ملک کیسے بنے آپ کو معلوم ہے ظاہر ہے یہ تو انھیں کے قدموں کی برکت کا نتیجہ ہے۔ آپ نے تھوڑے ہی بنا لیا ہے فخر تو ہم کرتے ہیں۔ مگر کارنامہ ان کا ہے۔

بہرحال تبلیغ کے طریقے مختلف رہے ۔مشائخ کا اور تھا۔ علماء کا اور تھا۔ محدثین کا طرز اور تھا اور فقہاء کا اور تھا۔ صرف ڈھنگ اور انداز کا فرق تھا۔ ان میں ٹکراؤ نہیں ہے اپنے حال کے مطابق ڈھنگ متعین کر لیئے۔ اسی طرح سے تبلیغی جماعت نے ایک ڈھنگ متعین کر لیا ہے۔ حالات کو دیکھ کر کے۔ تو آپ انھیں پرکھیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ اسمیں پورے اُتر رہے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ دوسرے معیار سے ان کو پرکھیں گے تو وہ ان کے موضوع ہی میں داخل نہیں۔ مثلاً اگر سُنار کو پرکھیں گے تو اسی لحاظ سے تو کہ وہ سونا کیسا گڑھتا ہے زیور کیسا بناتا ہے اگر لوہاری کے معیار پر اُسے جانچنے لگیں تو یہ آپ کی غلطی ہو گی۔

اسی طرح لوہار کو جب آپ جانچیں گے تو اس طرح کہ وہ لوہے کا سامان کیسا بناتا ہے اگر اس معیار سے جانچنے لگے کہ زیور بناتا ہے کہ نہیں تو یہ اس کا موضوع نہیں۔ لہٰذا ہر ایک کو اس کے موضوع کے لحاظ سے پرکھنا چاہیئے اگر وہ اپنے موضوع میں مکمل ہے تو ٹھیک ہے اسی طرح مدارس ہیں انھیں جانچا جائے گا تعلیم کے معیار سے کہ تعلیم ہو رہی ہے یا نہیں پھر وقت پر ہو رہی ہے نصاب پورا ہوتا ہے کہ نہیں نہ اس معیار سے کہ انھوں نے کتنے گشت کیئے، کتنے چلّے دیئے۔ اور کس کس کے گھر گئے۔ کیونکہ یہ ان کا موضوع نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ اداروں کو ان کے موضوع کے اعتبار سے پرکھا جائے گا۔

حضرت سے سوال کیا گیا کہ کیا جس طرح تبلیغ احکام فرض علی الکفایہ ہے کیا تبلیغ اسلام بھی فرض علی الکفایہ ہے اگر یہ بھی فرض علی الکفایہ ہے تو اس وقت ہندوستان میں کوئی جماعت تبلیغ اسلام کی خدمت انجام نہیں دے رہی ہے تو کیا اس کی وجہ سے سارے مسلمان گنہگار ہوں گے۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ نے فرمایا کہ تبلیغ تو اصل میں اسے ہی کہیں گے

جس کو آپ پوچھ رہے ہیں۔ تبلیغ احکام حقیقتاً تبلیغ نہیں ہے۔ اسے مجازاً تبلیغ کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں تبلیغ اس کا نام ہے کہ غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی جائے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ تبلیغ اسلام کا میدان اس وقت خالی سا ہو گیا ہے۔ گو کچھ جماعتیں کر بھی رہی ہیں، ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اپنے رنگ میں دوسروں تک اسلام پہنچائے۔ پڑھے لکھے ہوں یا بے پڑھے لکھے بہت سے بے پڑھے لوگوں نے اپنے ذوق سے مل ملا کر سیکڑوں لوگوں کو اسلام کی دولت سے نواز دیا۔ جن لوگوں میں تبلیغ کرنے کی صلاحیت ہے اگر وہ یہ کہہ کر ٹلتے رہیں کہ فلاں جماعت تبلیغ اسلام کا کام کر رہی ہے یہ غلط ہو گا۔ بلکہ ہر شخص کو کرنا چاہیئے اور دھیان دینا چاہیئے۔

مجلس ۹

۱۳ ر رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق ۳ ر ستمبر ۱۹۷۴ء

★ آداب مسجد اور تصویر و فوٹو کی حقیقت

ایک صاحب نے سوال کیا کہ ہم کو خواب میں کہا گیا ہے کہ دار العلوم کا فلاں مدرس جو بہت صالح اور نیک ہے اس سے کہدو کہ مسجد میں سونے سے احتراز کرے اور سوئے تو مسجد کا پورا احترام ملحوظ رکھے۔ اس کو اپنے اوپر محمول کرتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مجھ سے براہِ راست خطاب فرمایا ہے تو ہم غفلت میں کیوں رہیں۔ اس کے بعد اُٹھ کر میں باہر کی طرف چلا گیا۔ اس وقت اس خواب کی تعبیر معلوم کرنا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ کیا واقعہ سُنانا ہے۔ اگر ایسا ہے تو بہت اچھا کیا۔ اور خواب میں ایک اشارہ ہوا۔ اور یہی مسئلہ شرعیہ بھی ہے کہ مسجد کا احترام ضروری ہے مسجد میں سونا نہیں چاہیئے۔ مسجد سونے کی جگہ نہیں ہے معتکف کی بات تو الگ ہے۔ کیونکہ اس کو مسجد سے باہر جانے کا حکم ہی نہیں ہے گو اس کے لیے بھی احترام ضروری ہے۔ مگر اس کے لئے مسجد میں سونا جائز ہے۔ ویسے عام حالات میں سونا مکروہ ہے یہ خواب مبارک ہو اِسکے بعد حضرت نے فرمایا کہ مسجد کے بارے میں احترام کی کئی صورتیں ہیں ایک سونے میں احترام ہے ایک جاگنے میں احترام ہے سونے میں احترام یہ ہے کہ مسجد میں نہ سویا جائے کیونکہ مساجد اس لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک اعرابی آیا اس کو پیشاب کی ضرورت ہوئی تو سامنے ہی مسجد میں ایک کنارے پر پیشاب کرنا شروع کردیا۔ یہ دیکھ کر صحابہ رضؓ

دوڑے کہ اس کو پیشاب کرنے سے روکیں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو روک دیا کہ جب کر رہا ہے تو کر لینے دو ورنہ تکلیف میں پڑ جائے گا۔ اس کے بعد اسے بلا کر بڑی شفقت سے فرمایا کہ اِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ الخ یعنی مسجدیں اس کام کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں کہ اس میں گندگی ڈالی جائے اس وقت دیہاتی کا اس واقعہ کے متعلق بیان ہے وَاللّٰہِ مَا قَھَرَنِیْ، وَلَا ضَرَبَنِیْ، وَلَا شَتَمَنِیْ مَا رَأَیْتُ مُعَلِّمًا اَحْسَنَ مِنْہُ۔

کہ آپ نے مجھے نہ ڈانٹا نہ مارا۔ نہ گالی دیں اور نہ بُرا بھلا کہا ایسی شفقت فرمائی کہ جیسے باپ بیٹے پر کیا کرتا ہے۔ ہم نے تو ایسا پاک معلم دیکھا ہی نہیں۔ وہ دیہاتی ہمیشہ کے لیے تائب ہوگیا یہ تو بول و براز کا قصہ ہے۔ یہ تو جائز ہی نہیں ہے۔ البتہ معتکفین کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ مسجد میں جب بیٹھ کر وضو کریں تو ایسی احتیاط سے کریں کہ غسالہ نیچے گرے۔ مسجد کے فرش پر نہ گرے۔

اس لیے حنفیہ کے نزدیک ماءِ غسالہ بھی نجس ہو جاتا ہے لہٰذا مسجد کو نجاست سے بچانا چاہیے۔ اسی طرح جاگتے ہیں مسجد کا ادب یہ ہے کہ جب مسجد میں آئے تو فرمایا گیا کہ لَا تَاْتُوْھَا وَاَنْتُمْ تَسْعَوْنَ تَاْتُوْھَا وَاَنْتُمْ تَمْشُوْنَ یہ مسجد دربار خداوندی ہے اسلیے دوڑتے ہوئے مت آؤ بھاگتے اور دوڑتے ہوئے بچوں کی طرح آنا یہ بے ادبی کی بات ہے وقار کے ساتھ چل کر آؤ۔

بعض لوگ اس لیے دوڑتے بھاگتے ہیں کہ رکوع ہاتھ آجائے کیونکہ امام رکوع میں چلا گیا۔ مگر یہ غلط ہے اگر ایک رکعت چلی گئی تو بعد میں پڑھ لے گا۔ اس کا تدارک موجود ہے لیکن مسجد کی بے ادبی کا تدارک نہیں ہے

اسی طرح مسجد کے بارے میں یہ بھی حکم ہے کہ وہاں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی غلط سلط دنیا کی باتیں مت کرو اور فرمایا گیا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَاؕ اُولٰٓىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ۬ؕ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

"اس سے زیادہ بدبخت اور ظالم کون ہوگا جو مسجدوں میں اللہ کا ذکر اور عبادت کئے جانے سے روکے اور ان کو ویران اور معطل ہونے کے بارے میں کوشش کرے ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت ہو کر ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہیئے تھا۔ بلکہ جب جاتے تو ہیبت اور آداب سے جاتے ان لوگوں کو دنیا میں بھی رُسوائی نصیب ہوگی اور آخرت میں سزائے عظیم ہوگی۔"

یہ ایک تو مسجد کی تعمیر ہے وہ تو مسجد کی صورت ہے ۔اس کو ڈھانا بھی ممنوع ہے ایک مسجد کی حقیقت ہے اور وہ ہے ذکر اللہ۔ لہٰذا مسجد میں بیٹھ کر باتیں کرنا کہ جس سے دوسروں کی نمازوں اور ذکر اللہ میں خلل پڑے یہ مسجد کی حقیقت کو ڈھانا ہوا۔ تو مسجد جس غرض کی لیئے بنائی تھی۔ اس نے اس سے روک دیا۔ مسجد میں آکر یا تو ذکر اللہ میں مصروف ہو، یا نوافل یا تلاوت میں مشغول ہو، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو چپ ہو کر بیٹھ جائے۔ کیونکہ نماز کے انتظار میں بیٹھنا بھی نماز ہی کے حکم میں ہے۔ اگر ادب سے ساکت صامت بیٹھ جائے تو وہ نماز ہی میں سمجھا جائے گا۔ حتیٰ کہ فقہاء مسجد میں بوقت نماز زور سے ذکر کرنے کو بھی منع کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے دوسروں کے ذکر میں خلل پڑتا ہے۔ منع اسلیئے

کرتے ہیں تاکہ دوسروں کے ذکر و تلاوت اور نماز میں خلل نہ پڑے اور اسے تشویش پیدا نہ ہو۔ مسجد میں بعض مرتبہ لوگ ٹولیاں بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ بھی مسجد کی بنیاد کو ڈھانا ہے وہ لوگ گنہگار ہوتے ہیں اسلیئے ادب یہ ہے کہ مسجد میں آکر خاموش بیٹھے یا ذکراللہ وغیرہ میں مشغول ہو جائے مسجد کا حق یہی ہے۔ بعض روایات میں ہے یہ روایت میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ مگر مولانا مرتضیٰ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا تھا۔ ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی وہ جید عالم تھے انھوں نے کہیں دیکھی ہو گی اُنھوں نے بیان کیا کہ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا ایسا ہے جیسا کہ مسجد میں خنزیر ذبح کر دیا اور مسجد کو ناپاک اور آلودہ کر دیا وہاں نجس العین چیز کو ڈال دیا۔

بہرحال مسجد کے آداب سکھلائے گئے ہیں اور دین کی بنیاد ادب ہی پہ ہے اگر بے ادبی و گستاخی ہو گی۔ تو دین حبط ہو جائے گا۔ اللہ کا ادب اللہ کے رسول کا ادب، کتبِ خداوندی کا ادب، مکانات خداوندی کا ادب۔ یہ تمام آداب ضروری ہیں۔

پس واضح رہے کہ مسجد کے آداب بھی ضروری ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مدارس کا ادب بھی ضروری ہے۔ اگرچہ یہ مسجد نہیں ہے۔ اور بعض چیزیں جو مسجد میں ممنوع ہیں یہاں پر ممنوع نہیں۔ مگر اس میں بھی اس طرح کی تفریحات و تماشے ٹھٹھے بازی یہ اس کے خلاف ہے اسلیئے کہ مساجد جو ہیں وہ بیت اللہ ہیں اور مدارس جو ہیں وہ بیت الرسول ہیں تو بیت الرسول کا ادب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا بیت اللہ کا ادب ضروری ہے۔ البتہ مسجد میں ضروری باتیں کرنے میں مضائقہ نہیں۔ مگر پھکڑ پتی ٹھیک نہیں ہے۔ اس میں بھی سنجیدگی اور سادگی ہونی چاہیئے۔ اسی طرح علماء اور مشائخ

کا ادب بھی ضروری ہے تو دین کا دارو مدار ادب ہی پہ ہے۔ اگر ادب ہاتھ سے نکل گیا تو دین ہاتھ سے نکل گیا۔

تصویر اور فوٹو کی حقیقت اور اُس کی مذمت

کسی صاحب نے فوٹو کے متعلق سوال کیا کہ اس کا بنانا اور اپنے پاس رکھنا کیسا ہے اور اس سلسلہ میں شریعت کا کیا حکم ہے۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ ایک تو ہے مجبوری کا درجہ جیسے پاسپورٹ ہے کہ اسمیں فوٹو کھینچوانا ضروری ہے بغیر اس کے آدمی قانوناً غیر مُلک کا سفر نہیں کر سکتا۔ خواہ حج کا سفر ہو۔ خواہ باہر دوسرے ملکوں کا سفر، لیکن عام حالات میں فوٹو کا وہی حُکم ہے جو تصویر کا حکم ہے جس طرح تصویر کھینچنی اور کھینچوانی ممنوع ہے اس کا بھی کھینچنا کھینچوانا ممنوع ہے

ایک دفعہ مدرسہ دارالعلوم کی مسجد میں ایک جلسہ تھا اس میں شیخ عبدالمنعم جو مصر کے اُستاد تھے وہ بھی شریک تھے۔ کچھ مہمان آئے ہوئے تھے ان کے خیر مقدم میں میری تقریر تھی۔ تقریر اُردو میں ہو رہی تھی وہ لوگ تو سمجھتے تھے نہیں۔ لیکن کچھ متاثر ہو رہے تھے کچھ نہ کچھ لفظ عربی کے بھی آتے ہیں۔ تو آدمی اندازہ سے کچھ سمجھ جاتا ہے غائت تاثر میں اُنھوں نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کا فوٹو لے لوں۔ میں نے کہا کہ فوٹو تو ممنوع ہے اُنھوں نے کہا کہ نہیں۔ فوٹو میں کیا حرج ہے میں نے کہا یہ تصویر ہے اور تصویر کی شریعت نے ممانعت کی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ممانعت مجسّمہ کی ہے لیکن فوٹو اگر کاغذ یا... کپڑے پر ہو... تو اسمیں کوئی حرج نہیں۔ میں نے کہا کہ تصویر کی جو علت ہے وہ کپڑے پر ہو یا کاغذ پہ ہو یا پتھر پہ ہو وہ ایک ہی حکم میں ہے۔ اور دوسرے

آپ نے جو کہا کہ اس سے مجسمہ مراد ہے تو اس تخصیص کی دلیل کیا ہے۔ کہنے لگے کہ اس زمانے میں یہی مجسمے رائج تھے جب ممانعت آئی تو اسی کے لئے آئی، میں نے کہا کہ اصول یہ ہے کہ اَلْعِبْرَۃُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا لِخُصُوْصِ الْمَوْرِدِ، اعتبار الفاظ کا ہے۔ جب اس کی ممانعت فرمادی تو وہ شے جس پر وہ حکم پڑا وہ بھی ممنوع ہوگی۔ اور اس علت میں جو چیزیں مشترک ہیں وہ تمام چیزیں ممنوع ہو جائیں گی۔ اسلئے تخصیص کی کوئی دلیل نہیں پھر وہ کہنے لگے کہ فوٹو تو... عکس ہے جیسے آئینے میں دیکھ لیا کہ تصویر آگئی۔ ممانعت تو اس تصویر کی ہوگی جس میں صنعت انسانی کا دخل ہوا اور جس میں صنعتِ انسانی کا دخل نہیں وہ ممنوع نہیں ہوگی۔ جیسے آئینے میں عکس آجائے۔

میں نے کہا اوّل تو یہی غلط ہے کیونکہ آئینے میں جو عکس آتا ہے وہ اسوقت تک ہے جب تک ذی عکس سامنے ہو اگر اس کو ہٹالو تو عکس ختم ہوگیا اور فوٹو کے اندر جو پائیدار چیز وہ رہتی ہے۔ رہا یہ کہ صنعتِ انسانی کا دخل نہیں۔

ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں صنعتِ انسانی کا دخل ہے۔ اگر فوٹو لینے والا نہ لے اور صنعت نہ دکھلائے تو کیا فوٹو خود بخود آجاتا ہے جیسے آئینے میں عکس آجاتا ہے۔ دوسرے صنعتِ انسانی کبھی ہوتی ہے قلم سے کہ کاغذ پر تصویر کھینچ دی اور کبھی ہوتی ہے لوہے کے قلم سے کہ پتھر پر تصویر بنادی۔ صرف آلہ بدل گیا۔ اسی طرح کیمرہ ایک آلہ ہے یہاں قلم کی بجائے کیمرہ استعمال ہوا وہی صنعتِ انسانی یہاں بھی آگئی۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ جو آپ کیمرے سے فوٹو لیتے ہیں وہ نگیٹو ہوتا ہے۔ اس میں تصویر کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ پہلے اس کو چھاپتے ہیں پھر وہ فوٹو بنتا ہے یہ بھی صُنعِ انسانی ہے تو صاف

کرنا اور چھاپنا یہ بھی صنعِ انسانی ہے۔ تو ممانعتِ تصویر کی اصل علت ہے اس میں آلات دخیل نہیں ہیں کہ قلم ہو تو اور حکم، پنسل ہو تو اور حکم، لوہے کا قلم ہو تو اور حکم، یہ تو آلات بدل گئے۔ حکم آلات پر مبنی نہیں ہے بلکہ علت پر مبنی ہے وہ کہنے لگے کہ پھر بات ہو گی میں نے کہا کہ پھر سہی۔ تو بہرحال فوٹو اسی طرح ممنوع ہے جس طرح سے تصویر ممنوع ہے۔

شرک کی ابتداء

نفس تصویر کو شرک میں بھی دخل ہے۔ اسی وجہ سے اسکی ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ کے دین میں جو شرک شروع ہوا اور توحید میں خلل پڑا۔ اس کی بنیاد تصویر ہی ہوتی ہے۔ سب سے پہلا جو شرک شروع ہوا ہے وہ نوح علیہ السلام کی قوم میں شروع ہوا ہے۔

نوح علیہ السلام کا زمانہ آدم علیہ السلام کے زمانے سے ایک ہزار سال کے بعد ہے۔

نوح علیہ السلام جس قوم میں مبعوث فرمائے گئے۔ اس میں شرک آیا اور اس شرک کی بنیاد یہ ہوئی کہ اس قوم میں پانچ بزرگ تھے۔ ان کی مجلسوں میں لوگ بیٹھ کر خدا کو یاد کرتے تھے اور مسائل سنتے تھے۔ اس سے ان کے دین کو تقویت پہنچتی تھی۔ جب ان بزرگوں کا انتقال ہو گیا تو قوم میں پریشانی ہوئی کہ اب نہ وہ مجالس رہیں اور نہ وہ مسائل رہے۔ اب ہم کہاں بیٹھیں اس وقت شیطان نے ان کے دل میں یہ پھونک ماری کہ ان بزرگوں کی تصویریں بنا کر اپنے پاس رکھ لو۔ جب ان تصویروں کو دیکھو گے۔ ان کا زمانہ یاد آجائے گا۔ اور وہ کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ تو ان پانچوں کے مجسمے بنائے گئے۔ اور ان پانچوں کا نام تھا۔ ودؔ۱، سواعؔ۲، یغوثؔ۳، یعوقؔ۴، ۵ نسر۔ ان کا قرآن کریم میں ذکر ہے۔ یہ پانچ بت بنا کر رکھے گئے۔ ان کا مقصد محض تذکیر تھا کہ ان تصویروں کے ذریعہ یاد دہانی

ہو جائے ان تصویروں کو پوجنا مقصود نہیں تھا۔ ابتدا میں جب تک لوگوں کے دلوں میں معرفت رہی اور ان بزرگوں کے اثرات رہے۔ لیکن جب دوسری نسل آئی تو ان کے دلوں میں وہ معرفت نہیں رہی۔ اُن کے سامنے تو یہی بُت تھے چنانچہ وہ کچھ خدا کی طرف متوجہ ہوئے اور کچھ بتوں کی طرف متوجہ ہوئے تو اس طرح ان کا دین مخلوط ہو گیا۔ اور جب تیری نسل آئی تو ان کے دلوں میں اتنی بھی معرفت نہیں رہی ان کے سامنے بُت ہی بُت رہ گئے۔ انھیں کو سجدہ انھیں کو نیاز، انھیں کی نذر۔ یہاں تک کہ شرک شروع ہو گیا۔ اس شرک کو مٹانے کیلئے نوح علیہ السلام آئے تو شرک کی ابتداء جو ہوئی وہ تصویر سے ہوئی ہے تصویر میں خاصیت ہے شرک پیدا کرنے کی۔ پس اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تصویر یا تو ایسی قوم بناتی ہے جو مذہبی قوم ہے اور وہ بزرگوں کی یادگار کے طور پر ایسا کرتی ہے مگر آگے چل کر یہ تصویر شرک کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اور اگر قوم مذہبی نہیں ہے اور تصویروں کو محض زینت کے لیے بناتی ہے تو تصویر کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی صورتوں میں الجھ کر حقیقت سے دور ہو جاتا ہے اب اس دَور میں تصویروں کا غلبہ ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ تصویروں کی وہ قدر و منزلت ہے جو اصل انسان کی نہیں جو بعض تصویریں پُرانی ہیں وہ شاہکار سمجھی جاتی ہیں مالدار لوگ دس دس ہزار روپیہ دیکر خریدتے ہیں کہ یہ ایک نایاب چیز ہے اور پُرانے زمانے کی ہے۔ آدمی کے دام اتنے نہیں اُٹھتے ہیں۔ جو ان تصویروں کے اُٹھتے ہیں۔

آج کل سینما میں تصویریں ہی تو ہیں وہ گاتی ناچتی نظر آتی ہیں اس پر لاکھوں اور کروڑوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ انسان چاہے بھوکے مرے مگر ان تصویروں کی بڑی عظمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اصل کو فراموش کر گئے۔ اور صورتوں

میں اُلجھ گئے۔

حضرات صوفیاء محققین لکھتے ہیں کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ خاتمہ بالخیر ہو تو صورتوں کی طرف توجہ مت کرو اور صورتوں سے انھوں نے تصویریں مراد لی ہیں انسان کی صورت جو خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے۔ ان میں مت الجھو بلکہ ان کی سیرتوں کو دیکھو۔

اس لیے صورت پسندوں سے سیرت پسندی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اصل مقصود ہے سیرتوں کا اتباع۔ تاکہ اخلاق آئے۔ علم آئے، عقل اور عمل آئے نہ یہ کہ صورتوں کو دیکھ لو اور یہ کہو کہ بڑی اچھی صورت ہے۔ اسلیے شریعت اسلام نے تصویروں کی ممانعت کردی کیونکہ اسلام نے توحید کی تکمیل کی ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ تو سب سے پہلے اکمالِ توحید ہے۔ اور انبیاء کرام نے بھی توحید سکھلائی اور شرک سے روکا۔ مگر اسلام نے اسباب شرک کو بھی روک دیا کہ بعید سے بعید سبب جو شرک تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کو بھی روک دو۔ چنانچہ صحابہ کرام میں اس کا اہتمام تھا۔ حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا اور طواف ہو رہا تھا اور لوگ حجرِ اسود پر گر رہے تھے اور عوام الناس یہ سمجھتے تھے کہ اگر حجر کو بوسہ نہ دیا تو حج ہی مکمل نہ ہوگا۔

حضرت عمرؓ بھی طواف میں شریک تھے۔ آپ نے بآوازِ بلند یہ اعلان کیا اور حجرِ اسود کو خطاب کر کے فرمایا کہ اِنِّیْ اَعْلَمُ اِنَّکَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ۔ لَوْلَا اِنِّیْ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَبَّلَکَ مَا قَبَّلْتُکَ میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے نہ تجھ میں نفع پہنچانے کی قدرت ہے نہ نقصان پہنچانے کی قدرت ہے تو بے جان پتھر ہے اگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ تیری تقبیل سنّت کی وجہ سے ہے۔ اس وجہ سے نہیں ہے کہ تجھ میں نفع اور ضرر پہنچانے کی طاقت ہے۔ اس قول سے شرک کا مادہ ختم

کرنا تھا۔ شرک کے بھی کئی اقسام ہیں۔

شرک کی قسمیں ایک شرک جلی ہے یعنی کھلا ہوا شرک کہ وہ معبود فرض کرلیئے جائیں۔ یہ شرک فی الذات ہے جیسے مجوس دو خدا مانتے ہیں ایک خیر کا خدا، دوسرا شر کا خدا۔ ایک شرک یہ ہے کہ خدا کو ایک ہی مانا جائے مگر عبادت میں دوسروں کو شریک کرلیا جائے۔ کچھ حصہ بتوں کا۔ اور کچھ حصہ خدا کا۔ هٰذَا لِلّٰهِ وَهٰذَا لِشُرَكَائِنَا یعنی اتنا حصہ اللہ کے لیے ہے اور اتنا حصہ اپنے شریکوں کے لیئے۔ یہ شرک فی العبادت ہے۔ شریعت نے اس سے بھی رد کیا ہے جیسے زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ وہ جب تلبیہ پڑھتے تو تلبیہ میں شرک ہوتا تھا وہ کہتے تھے کہ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ یعنی میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں آپ کا کوئی شریک نہیں ہے علاوہ اس کے کہ جس کو آپ نے خود ہی شریک کرلیا ہے۔"

میں اُس کی عظمت کرتا ہوں، اور وہ بُت ہیں۔ تو شریعت نے اس کو بھی نکال دیا کہ تم نے یہ چیز کہاں سے نکالی۔ بعید سے بعید چیز جو شرک کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ اسے بھی منع کیا۔ اور ایک شرک ایہامی ہوتا ہے جس میں اپنا ذہن پاک ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کے ذہن میں اسکے شُبہ کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ شریعت نے اس شرک سے بھی منع کیا ہے۔

جیسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب وہ اپنے سامنے سُترہ رکھتے تو ناک کی سیدھ میں بالکل سامنے نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ دائیں یا بائیں مونڈھے کے مقابلے میں رکھتے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا ایسا کیوں کرتے ہیں تو فرمایا کہ ناک کی سیدھ میں رکھنے سے شرک کی صورت بن جاتی ہے کہ خدانخواستہ میں اس کو پوج رہا ہوں۔ اگر ادھر اُدھر ہے تو یہ خیال پیدا نہیں ہوگا۔ تو ان کا قلب تو

تو شرک سے پاک رہتا تھا۔ لیکن دوسروں کے دل میں یہ وہم آسکتا تھا۔ اسلیئے شریعت نے اس سے بھی روک دیا۔ ایک شرک ہے وہی کہ دوسرے کے ذہن میں کچھ نہ آئے بلکہ دوسرا موجود ہی نہ ہو لیکن اپنے ذہن میں آئے اور وہ یہ ہے کہ ریاکاری سے آدمی عبادت کرے۔ یعنی دوسروں کو دکھلانے کے لیئے کہ بڑے عابد وزاہد ہیں فرمایا کہ یہ شرک خفی ہے اس طرح غیراللہ کی عبادت ہوتی ہے۔ اللہ کی نہیں۔ اسلیئے اس کو بھی روک دیا ایک یہ ہے کہ کوئی پاس نہ ہو پھر بھی شرک کا دخل ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ عبادت کرے آدمی اور ذہن میں یہ ہے کہ میں کتنا بڑا عابد ہوں کہ کتنی بڑی عبادت کر رہا ہوں دوسرے ایسی عبادت کر ہی نہیں سکتے یہ عُجب ہے جس کو خودپسندی کہتے ہیں یہ بھی شرک ہوگیا کہ گویا یہ اپنے لئے عبادت کررہا ہے یہ وہی شرک ہے۔ شریعت نے ان سارے شرکوں کو روک دیا ہے تاکہ شرک کا مادہ ختم ہو جائے صرف توحید رہ جاتے۔ چونکہ اسلام میں توحید کی تکمیل مقصود تھی تو ہر قسم کے شرک سے منع کیا۔ شرکوں میں سے ایک تصویر بھی ہے یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے اس سے بھی روکا ہے۔

اب وہ تصویر یا فوٹو کہیں بھی ہو۔ بہر صورت ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا نے ایک پردہ خریدا۔ اسمیں تصویریں بنی ہوئی تھیں انھوں نے گھر کے دروازے پر بطور پردے کے ٹانگ دیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے فرمایا یہ کیا ہے تو حضرت عائشہؓ صدیقہؓ نے فرمایا کہ یہ ایک کپڑا ہے بھلا معلوم ہوا ہم نے خرید لیا پردہ بنا دیا۔ اس پر چونکہ تصویر بنی ہوئی تھیں۔ آپ نے اُسے اُتار کر چاک کردیا۔ ایک حِصّے کو پھاڑ دیا۔ ایک حِصّے کے متعلق فرمایا کہ اس کو دُھل دو۔ تصویریں مِٹ جائیں

گی۔ تو دیکھئے یہاں پر تصویر پتھر پر نہیں تھی۔ بلکہ کپڑے پر تھی۔ مگر پھر بھی آپ نے روک دیا۔ تو حاصل

تو حاصل یہ نکلا کہ شریعت نے ہر قسم کی تصویر کو منع کر دیا ہے خواہ وہ کہیں ہو اور کیسی ہی ہو۔ صریح حدیث یہ ہے آپ نے فرمایا کہ

اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عذاباً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ الَّذِیْنَ یُضَاھُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰہِ

سب سے شدید عذاب میں بتلا وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے ساتھ برابری چاہتے ہیں اور آگے خود ہی فرمایا۔ یعنی مُصَوِّرُوْنَ ؛ یعنی تصویر بنانے والے۔ گویا جیسا خدا خالق ہے۔ ہم بھی ایک تخلیق کر رہے ہیں تو قیامت میں کہاں جائے گا کہ جب تم خالق کی برابری کرنا چاہتے تھے تو پوری کر کے دکھلاؤ احیوا ما خلقتم۔ ان میں حیات ڈالو اور حیات ڈالنے کی قدرت ہو گی نہیں تو عذاب دیا جائے گا۔ا

اس حدیث میں لفظ عام ہے المصورون یعنی تصویر بنانے والے ہر قسم کے مصور اس میں شامل ہوں گے اور سب کا ایک حکم ہو گا۔ اور اگر اس کے باوجود کوئی عالم جواز کا فتویٰ دے تو اسکی حجت اسکے ساتھ ہے کسی کا فعل حجت نہیں ہے اصل حُجّت وہ ہے جو شریعت بیان کرے اگر مصر والے اجازت دیتے ہیں۔ تو وہ ان کا فعل ہے وہ ہمارے لیے حجت نہیں۔ جبکہ ہمارے سامنے ایک اصول موجود ہے اُنھوں نے جو بھی تاویل کی ہو ہم اس کے پابند نہیں ہیں صریح احکام ہمارے سامنے موجود ہیں اگر مجموعہ احادیث و احکام کو لے کر دیکھا جائے تو تصویر کی مذمت نکلتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحؒ کی ذہانت کے واقعات

ایک شخص تھا اس کی بیوی اس کو منہ نہیں لگاتی تھی اور

اور خاوند سو جان سے اس کا عاشق تھا بیوی کی طبیعت شوہر سے نہیں ملتی تھی اسلیئے وہ طلاق لینا چاہتی تھی۔ مگر مرد طلاق نہیں دیتا تھا۔ مرد اس کو یہی نہیں کہ ستاتا نہیں تھا۔ بلکہ محبت کرتا تھا مگر وہ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی ایک دن دونوں میاں بیوی بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے، بیوی کچھ کہہ رہی تھی۔ مرد نے بھی کوئی جملہ کہا۔ بس وہ چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ مرد نے کہا کہ اگر صبح صادق سے پہلے پہلے تو نہ بولی تو تجھ پر طلاق ہے وہ چُپ ہو گئی اور ارادہ کر لیا کہ میں خاموش رہوں گی تاکہ اس سے کسی طرح پیچھا چھوٹ جائے وہ بے چارہ پریشان ہوا۔ وہ ہر چند بُلانا چاہتا تھا مگر وہ بولتی ہی نہیں تھی اب وہ سمجھ گیا کہ یہ طلاق لینا چاہتی ہے اور اس طرح بیوی مجھ سے جدا ہو جائیگی اب اس نے فقہاء کے دروازے جھانکنے شروع کیئے ان سے جا کر اپنا حال کیا۔ اُنہوں نے یہی کہا کہ اگر وہ چُپ رہی تو طلاق پڑ جائے گی۔ یہ تو تیری طرف سے شرط ہے اس کی صورت یہی ہے کہ اس کی جا کر خوشامد کرو اور صبح صادق سے پہلے کسی طرح بلواؤ۔ ورنہ صبح صادق ہوتے ہی وہ تیرے ہاتھ سے نکل جائے گی سب نے یہی جواب دیا۔

پھر وہ امام ابو حنیفہؒ کے پاس پہنچا۔ وہ وہاں کا حاضر باش تھا۔ متفکر اور پریشان بیٹھ گیا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ آج کیا بات ہے۔ پریشان کیوں ہو۔ اس نے کہا کہ حضرت واقعہ یہ ہے کہ بیوی سے میں نے کہہ دیا ہے کہ تو اگر صبح صادق تک تو نہ بولی تو تجھ پر طلاق۔ اب وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ طلاق نہیں پڑے گی مطمئن رہ۔ اب وہ مطمئن ہو کر آ گیا۔ فقہاء نے امام صاحب پر طعن شروع کیا کہ ابو حنیفہؒ حرام کو حلال بنانا چاہتے ہیں ایک صاف صریح حکم ہے اس کو کہہ دیا کہ طلاق

نہیں پڑیگی۔
امام صاحبؒ نے یہ کیا کہ صبح صادق میں جب آدھ گھنٹہ رہ گیا تو مسجد جاکر زور زور سے تہجد کی اذان دینا شروع کردی۔ اس عورت نے جب آذان کی آواز سُنی تو سمجھی صبح صادق ہوگئی۔ بس بول پڑی اور کہنے لگی صبح صادق ہوگئی میں مطلقہ ہوگئی۔ میں اب تیرے پاس نہیں رہوں گی۔ جب تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ صبح صادق نہیں ہوئی۔ وہ تہجد کی اذان تھی لوگ قائل ہوگئے کہ واقعی امام صاحب فقیہ بھی ہیں اور مُدبر بھی۔

دوسرا واقعہ ایک مرتبہ ایک گھر میں چوری ہوئی چور اسی محلے کے تھے چوروں نے گھر والے کو پکڑا اور زبردستی حلف لیا کہ اگر تو کسی کو ہمارا پتہ بتلائے گا تو تیری بیوی پر طلاق۔ اس بیچارے نے مجبوراً۔۔ طلاق کا حلف لے لیا۔ وہ چور اس کا سارا مال لے کر چلے گئے۔ اب وہ بہت پریشان ہوا کہ اگر میں چوروں کا پتہ بتلاتا ہوں تو مال تو مل جائے گا مگر بیوی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اور اگر پتہ نہیں بتلاتا ہوں تو بیوی تو رہے گی مگر سارا گھر خالی ہوجاتا ہے، تو مال اور بیوی میں تقابل پڑگیا۔ یا تو مال رکھے یا بیوی رکھے اور کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ وہ عہد کرچکا تھا۔ پھر امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا۔ وہ بہت غمگین اور اُداس اور پریشان تھا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ آج تم بہت اُداس ہو کیا بات ہے۔ اسنے کہا کہ حضرت میں کہہ بھی نہیں سکتا فرمایا کہ کچھ تو کہو۔ اس نے کہا کہ حضرت اگر ہم نے کہا تو نہ جانے کیا ہوجائے گا۔ پھر فرمایا کہ اجمالاً کہو تو اس نے کہا کہ حضرت چوری ہوگئی ہے اور میں نے یہ عہد کرلیا ہے کہ اگر میں نے ان چوروں کا پتہ کسی کو بتلایا تو بیوی پر طلاق۔ مجھے معلوم ہے کہ چور کون ہیں وہ تو محلے کے ہیں۔ لیکن اگر پتہ بتلاتا ہوں تو بیوی

پر طلاق پڑ جائے گی۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ تو مطمئن رہ بیوی بھی ہاتھ سے نہیں جائے گی۔ اور مال بھی مل جائے گا۔ اور تو ہی پتہ بتلائے گا کوفہ میں پھر شور ہو گیا کہ ابو حنیفہؒ یہ کیا کر رہے ہیں یہ تو ایک عہد ہے جب وہ پورا کریگا تو بیوی پر طلاق پڑ جائے گی۔ یہ امام صاحب نے کیسے کہہ دیا کہ نہ بیوی جائے گی نہ مال جائے گا۔ علماء و فقہا پریشان ہو گئے۔

امام صاحب نے فرمایا کہ کل ظہر کی نماز میں تمہارے محلے کی مسجد میں آکر پڑھوں گا چنانچہ امام صاحب تشریف لے گئے وہاں نماز پڑھی اور اس کے بعد اعلان کر دیا کہ مسجد کے دروازے بند کر دیئے جائیں کوئی باہر نہ جائے۔ اس میں چور بھی تھے اس مسجد کا ایک دروازہ کھول دیا ایک طرف خود بیٹھ گئے۔ اور ایک طرف اسکو بٹھا دیا اور فرمایا کہ ایک ایک آدمی نکلے گا۔ جو چور نہ ہو اس کے متعلق کہتے جانا یہ چور نہیں ہے۔ اور جب چور نکلنے لگے تو چُپ ہو کر بیٹھ جانا۔ چنانچہ جو چور نہیں ہوتے تھے۔ ان کے متعلق کہتا جاتا تھا کہ یہ بھی چور نہیں ہے یہ بھی چور نہیں اور جب چور نکلنے لگتا تو خاموش ہو کر بیٹھ جاتا۔ اس طرح اُس نے گو بتلایا نہیں مگر بلا بتلائے سارے چور متعین ہو گئے کہ یہ سب چور ہیں۔ چنانچہ چور بھی پکڑے گئے مال بھی مل گیا اور بیوی بھی ہاتھ سے نہیں گئی یہ تدبیر کی بات تھی۔

مجلس نمبر ۱۰

۱۴ / رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۷۴ء

حضرت تھانویؒ کی کتاب اصلاح انقلاب کی وجہ تسمیہ، مجدّد کی علامت اور انکی خدمات، ظہورِ مہدی علیہ السّلام اور نزولِ عیسیٰ علیہ السّلام وغیرہ کے متعلق سوالات اور ان کے جوابات ★

سوال:۔ حضرت تھانویؒ کی کتاب "اصلاح انقلاب"، کے بارے میں بعض حضرات سوال کرتے ہیں کہ اصلاح انقلاب کا کیا مطلب ہے اور اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ کو علماء حقانی نے مجدد الامت کا لقب دیا ہے کیا وہ مجدّد تھے؟ مجدّد کی پہچان کیا ہے؟

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی نے فرمایا کہ جس طرح تمدنی انقلابات بھی آتے ہیں۔ اسی طرح دینی انقلابات بھی آتے ہیں چنانچہ جب اس کا موقعہ آتا ہے تو انسان کے جذبات و افکار بدل جاتے ہیں یہ ذہنی انقلاب ہوتا ہے بقیہ دوسرے انقلابات اس کے تابع ہوتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کا مقصد یہ ہے کہ یہ انقلابی دَور ہے دین و دیانت میں عقائد و جذبات میں انقلابات پیدا ہو رہے ہیں جو مُضر ہیں۔ لہٰذا ان کی اصلاح کی ضرورت ہے اصلاح انقلاب کا مطلب یہ ہے کہ جو انقلاب طبعی طور پر پیدا ہوا ہے اس میں مضر چیزیں آگئی ہیں اسلیئے ان کی اصلاح کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ نے ان انقلابات کے ابواب قائم کیئے کہ... معاشرت میں، شادی بیاہ میں یہ انقلاب آیا۔ اور سلف کا یہ طریقہ تھا اور اس

انقلاب میں یہ چیزیں غلط ہیں۔ اسی طرح نماز کے سلسلے میں اور حج زکوٰۃ کے سلسلے میں یہ یہ انقلابات آئے اور وہ مُضر ہیں ان کی یہ اصلاح ہے یہ ہے اس کتاب کا حاصل۔

ابتداء میں حضرت تھانویؒ کا یہ مضمون القاسم قدیم میں چھپا ہے جو دارالعلوم دیوبند سے نکلتا تھا۔ یہ بات ضرور ہے کہ ہر سو برس کے بعد کچھ نہ کچھ انقلاب آتا ہے اس لیے کہ یہ نسل سو سال میں ختم ہو جاتی ہے۔ گویا مجموعی طور پہ ایک نسل کے لیے ایک صدی ہوتی ہے دوسری صدی میں دوسری نسل کا غلبہ ہوتا ہے تو ہر قرن کے بعد نئی نسل حکمران ہوتی ہے مثلاً آج جو نسل موجود ہے ان میں بوڑھے بھی ہیں اور نوجوان بھی۔ صدی کے ختم تک ان کی اکثریت ختم ہو جائے گی صدی کے بعد پھر نئی نسل شروع ہو گی۔ جب دوسری نسل آتی ہے تو ان میں ایک ذہنی اور فکری انقلاب ہوتا ہے پچھلوں کا ذہن باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ایک نیا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ نئے حالات نئے تمدن، نئی ایجادات اسکے افکار بدلتے ہیں اس میں اندیشہ ہوتا ہے کہ فکر کا انقلاب کہیں دین پر نہ پڑ جائے۔

اسلیئے شریعت اسلام نے ہر صدی اور ہر قرن کے بعد مجدد رکھا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ فِیْ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا

گویا ہر سو برس کے بعد تجدید دین کا وعدہ فرمایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر سو برس میں ذہن بدل جاتا ہے وہ انقلاب گو تمدنی ہوتا ہے مگر تمدن کا اثر بھی دین پر پڑتا ہے۔

جیسے آج ایک انقلابی دَور ہے نئی نئی ایجادات ہیں تو نئے نئے مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ لوگ سیّاروں پر جا رہے ہیں۔ فرض کرو اگر مسلمان جائیں تو وہ نماز کیسے پڑھیں۔ اسواسطے کہ روس نے جو سیّارہ چھوڑا تو اس میں جا گزیں

کیا گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے ستّرہ۱۷ مرتبہ طلوع دیکھا اور غروب بھی۔ وہ صرف ایک گھنٹے میں۔ تو کیا ہر غروب پہ نماز پڑھی جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو ایک گھنٹہ میں ستّرہ۱۷ مرتبہ نماز پڑھنی ہوگی۔

اب ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ اجتماعی سود کا زمانہ ہے مثلاً بینک تو اس سلسلے سے سود عام ہوگیا ہے۔ اب سوالات پیدا ہوئے کہ اس سود کا حکم کیا ہے پہلے تو مہاجنی سود تھا۔ کہ ایک بنئے سے روپیہ سود پر لے لیا تو وہ سود در سود وصول کرتا تھا۔ پھر جائیدادوں پر قبضہ کر لیتا تھا۔ اب وہ سود نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی سود ہے تو کیا اس پہ انفرادی سود کا حکم ہوگا یا اجتماعی سود کا تو اس طرح جو ہر زمانے میں تمدنی انقلاب ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے فکر بدلتا ہے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ فکری انقلاب کہیں دین پر مؤثر نہ ہو جائے تو حق تعالیٰ نے ہر سو برس کے بعد دین کی تجدید رکھی ہے اسلیئے کہ نبوت تو ختم ہو چکی ہے مگر اس نبوت کا فیضان قیامت تک چلے گا۔ اور علماء دین وہ کام کریں گے، جو پچھلے زمانے میں انبیاء علیہم السّلام کرتے تھے وہ نبی تو نہیں ہوں گے لیکن نبوت کے آثار ان کے اندر کارِ بل ہوں گے وہ تجدید کریں گے دین کی۔

تو ایسے انقلابی اوقات میں دین کے اندر بھی کچھ نہ کچھ انقلابی جذبات پیدا ہوتے ہیں جیسے آج کل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ہر فرقہ اپنے ذہن کو سامنے رکھ کر قرآن و حدیث سمجھنا چاہتا ہے۔ اور وہ سلف کی مفہومات سے ہٹ جاتا ہے لہٰذا ضرورت ہوتی ہے کہ علماء اسکی اصلاح کریں۔

حضرت تھانویؒ نے یہی کیا ہے آپ نے دیکھا کہ انقلاب امت میں کن کن چیزوں کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس تمدنی انقلاب کے اثرات دین

پر کیا پڑ رہے ہیں۔ اسی طرح سے انھوں نے رسومات کو مٹایا کہ یہ بھی ممنوع ہے اور یہ بھی ممنوع ہے۔

اور اصل طریقہ سلف کا یہ ہے تو حضرت ؒ کا یہ مطلب ہے کہ اصلاح انقلاب سے دین پر وہ افکار اثر نہ کر جائیں اسلیئے مجدد کی ضرورت پڑی۔

مجددین کی تقسیم خدمات

مجدد خواہ فرد واحد ہو یا جماعت ہو کہ کوئی یہاں اصلاح کر رہا ہے کوئی وہاں اصلاح کر رہا ہے یعنی منجانب اللہ انھیں قوت دی جاتی ہے وہ پوری اُمت یا اس جماعت پر مؤثر ہوتے ہیں۔ جس کے لئے وہ مجدد بنائے گئے ہیں اور مجدد کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ تمدن بھی باقی رہے اور دین بھی باقی رہے وہ اسی انداز سے اصلاح کرتے ہیں تاکہ دین اپنی جگہ محفوظ اور تمدن اپنی جگہ باقی رہے جیسے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ میں تحریر فرمایا ہے کہ اب زمانہ عقلیت پسندی کا آگیا ہے۔ دین کو جب تک عقلی رنگ میں پیش نہ کیا جائے گا اس وقت تک یہ دین ان لوگوں کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوگا۔

اور فرمایا کہ حق تعالیٰ نے میرے قلب پر الہام کیا اور میں نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت حسنین ؓ تشریف لائے اور قلم میرے ہاتھ میں دیا۔ اور اس کی تعبیر حضرت امام نے یہی دی کہ گویا یہ نیا قلم ہے اس کے ذریعہ سے ایسی تحریرات قلم بند کیجیے کہ جن کے ذریعہ تمدنی انقلاب کو دین کے ذریعہ سے سمجھایا جائے انھیں تمدنی چیزوں کو سامنے رکھ کر مسائل کھولے جائیں۔

دارالعلوم دیوبند کی مُجدِّدانہ خدمات

تو اس صدی کے علماء کھڑے ہو جاتے ہیں اور زمانۂ حال کو سامنے رکھ کر دین کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو یہ واقعہ ہے کہ اس صدی کے شروع

میں اگر دارالعلوم قائم نہ ہوتا اور یہ مدارس دینیہ نہ ہوتے تو اس ملک میں سوائے شرک و بدعت کے کچھ نہ ہوتا۔ اور کوئی مسئلہ بتانے والا نہ ہوتا۔ اس ملک میں ان بزرگوں نے عظیم الشان کام انجام دیا ہے گویا امت کو سنبھال لیا ہے بددینی سے۔ بدراہی سے اور بدفکری سے۔ باقی ان حضرات کی خدمات میں کوئی دکھاوا نہیں۔ کوئی پوسٹر نہیں بڑے اخلاص سے کام کیا۔ جو لوگوں کے قلوب کے اندر پیوست ہو گیا۔ ہر شخص اس کا معترف ہے۔

دنیا کی تعلیم میں دکھاوا ہوتا ہے مگر دین کی تعلیم میں دکھاوا نہیں ہوتا۔ ان خدمات کے نمایاں کرنے کی ان بزرگوں نے کوشش نہیں کی۔ ان کے ہاں تو یہ رہا کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ وہ حضرات تو نیکی چھپا کر کرتے تھے۔ برخلاف دوسری جماعتوں کے جو سیاسی اور اقتصادی ہیں۔ کام کم کرتی ہیں مگر اس کو نمایاں بہت کرتی ہیں یہاں شہرت نہیں ہے۔ ہمارے حضرات نے دلوں کے اندر ایمان کو سنبھالا ہے۔ انگریزی تعلیم میں بڑے بڑے فیشن ہیں

اسلام میں سادگی کی تعلیم موجود ہے

مگر یہاں کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ نبوت کی تعلیم ہمیشہ چٹائیوں پر ہوئی ہے وہاں قالین وغیرہ کچھ نہ تھا۔ جیسے حدیث شریف میں ہے کہ تین مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ کیا تم سنو گے نہیں۔ سنو گے نہیں۔ سنو گے نہیں فرمایا اِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِیْمَانِ اِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِیْمَانِ اِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ تین دفعہ فرمایا کہ سادگی ہی ایمان ہے سادگی ہی ایمان ہے۔ سادگی ہی ایمان ہے۔

ایمان میں تزئین و آرائش نہیں ہے وہ سادہ زندگی ہے قلوب سے قلوب کی طرف چلتی ہے۔ سلف کے جو کارنامے ہیں ظاہر ہے۔ سلف نے

مواعظ بھی کئے ایک ایک حدیث کے املا کرانے میں بیس بیس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ مگر خود علماء نے یہ نہیں کیا کہ اپنے کارناموں کو شہرت دی ہو۔ البتہ معتقدین اور متوسلین نے کچھ تاریخیں لکھی ہیں جو ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے اندر یہ جذبہ اور اہتمام نہیں تھا کہ میں نے یہ کام کیا ہے اس کو لکھو وہ سبیل اللہ کرتے تھے۔

مجدد کی علامت

بہرحال مجدد کی کوئی علامت منضبط نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ مجدد کو خود بھی خبر ہو کہ میں مجدد ہوں۔ مگر کام لیا جا رہا ہے تجدید کا یعنی علم گہرا ہو اور اتباع سنت کامل ہو۔ علوم شرعیہ کے اوپر حاوی ہو۔ تقویٰ اور طہارت ہو۔ لوگ خود پہچان جاتے ہیں کہ یہ شخص اس درجہ کا ہے کہ قلوب کو پلٹ سکتا ہے اور ذہنی انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ ان کے کارناموں سے متعین ہو جاتا ہے کہ انھوں نے تجدید کا کارنامہ کیا ہے۔

مثلاً حضرت مولانا گنگوہیؒ نے سنت اور بدعت کے اندر کافی امتیاز پیدا فرمایا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجدد ہیں سنت اور بدعت کے۔ یعنی فقہی مسائل کو صحیح نہج پر پہنچا کر بدعات کو ختم کیا۔ اور حضرت نانوتویؒ نے اندرونی اصلاح سے زیادہ بیرونی سرحدات کی حفاظت کی ہے کہ کفار دخل نہ دیں۔ رخنہ نہ ڈالیں۔ شک نہ پیدا کریں۔

یہی وجہ ہے کہ کہیں آریوں کا مقابلہ ہے۔ کہیں عیسائیوں کا۔ کہیں ہندوؤں کا۔ تو آپ نے سرحداتِ اسلام کو محفوظ کیا ہے۔ اندرونی طور پر کچھ بھی ہو، ہو جائے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت نانوتویؒ نے اپنی کتابوں میں ان کا سامان جمع کر دیا ہے کہ فلسفہ کتنی ہی شکلیں بدل بدل کر آئے اور کتنی ہی

روپ اختیار کرے مگر ان کا رد حضرتؒ کی کتابوں میں موجود ہے تو آپ نے سرحدات کی حفاظت کی۔ اور حضرت گنگوہیؒ نے اندرونی طور پر حفاظت کی۔

اور تیسرا مسئلہ تھا تصوف کا کہ اس راہ سے بہت کچھ الحاد پھیلا۔ اور طریق اصلی حالت پر نہیں رہا۔ اور اسمیں بدعات و رسومات اور رواج وغیرہ داخل ہو گئے۔ تو حضرت تھانویؒ نے اس کی اصلاح کی۔ تصوف کے جتنے مقامات ہیں ان کو کھول دیا اور راستہ سہل کر دیا اور ظاہر کر دیا کہ اتنی چیزیں خرافات ہیں اور اصل طریقت یہ ہے تو معلوم ہوا کہ کسی نے اصلاح کی ہے علمی طور پر سنت و بدعت کے بارے میں۔ اور کسی نے اصلاح کی ہے مقاماتِ قلب کے بارے میں اور کسی نے مقاماتِ تصوف میں۔ اور روحانی مقامات میں۔ تصوف میں جو غل فسل تھا اس کو الگ کر کے کتاب و سنت سے جو اصل تصوف تھا اسکو واضح کر دیا۔

حضرت تھانویؒ کی تقریباً ایک ہزار تصنیف ہے ان کا قدر مشترک یہی نظر آئے گا کہ باطنی امور کے اندر جہاں جہاں سے الحاد کا دخل ہوتا تھا انھوں نے اس کے راستے بند کر دیئے اسی لیے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے خود سنا ہے کہ مجدّد کے لیے شخص واحد ہونا ضروری نہیں ہے۔ جماعت بھی مجدّد ہو سکتی ہے کہ کوئی اس دائرے کی اصلاح کر رہا ہے کوئی اس دائرے کی اصلاح کر رہا ہے اور فرمایا کہ اس زمانے کے جتنے اولیاء وقت تھے اور واقعی اُنہوں نے تجدید کا کام کیا۔ ان سب نسبتوں کا مجموعہ یہ دار العلوم دیوبند ہے۔ یہ ہے مجدّد من حیث الجماعت کہ سو برس سے اس نے یہ کام کیا ہے اور چومکھی لڑائی لڑی ہے۔ کسی نے حدیث میں دخل دیا تو اس کا رد کیا اور کتاب اللہ کے مفہومات اور مدلولات میں دخل دیا تو اس کا رد کیا۔ مختلف طریقوں سے۔ یہاں کے علماء نے کام کیا۔ اگر ان کی تصانیف پر نظر ڈالی جائے

تقریباً تین ہزار کتابیں جو مختلف علوم وفنون کی بنیادی طور پر اس جماعت کی طرف سے نکلی ہیں۔ ان میں تجدید اور اصلاح کا پورا جزئیات سے لیکر کلیات تک ساری چیزیں آگئی ہیں۔ ان میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ایک جماعت من حیث الجماعت بھی مجدد ہے۔

صدی ختم ہونے پر فتنوں کی بہتات

علماء کہتے ہیں کہ جب صدی ختم ہونے کو آتی ہے تو فتن کی بہتات ہوتی ہے۔ عقائد کے فتنے، اعمال کے فتنے اس طرح ابھرتے ہیں کہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے آج ایسا ہی زمانہ آگیا ہے کہ حق و باطل خلط ملط ہو گئے ہیں۔ یہ علامت ہے کہ اب کسی مجدّد کی ضرورت ہے جو آئے گا اس کی تجدید کرے گا۔ اس زمانے کے جو فتن ہیں وہ اجتماعی رنگ میں آرہے ہیں۔ قوموں کی خصوصیات مٹتی چلی جارہی ہیں اور عمومیت اور اشتراکیت پیدا ہوتی چلی جارہی ہے اس اشتراکیت کی لائن سے دین کے اندر بھی اشتراکیت پیدا ہو رہی ہے۔

اسی وجہ سے اس وقت کا فتنہ کسی ایک جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جو فتنہ یہاں ہے وہی افریقہ میں ہے اور وہی امریکہ اور یورپ میں ہے ایک عالم گیر فتنہ پیدا ہو گیا اسلیئے اب جو مجدّد آئے گا جو ایسا قوی الروحانیت ہوگا کہ تمام دنیا پر اس کا اثر پڑیگا۔ کار تجدید عام ہوگا۔ اور ایسا مجدّد سوائے مہدی علیہ السلام کے دوسرا نظر نہیں آتا ہے اسلیئے بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اب جو تجدید ہوگی وہ مہدی علیہ السلام کے ذریعہ ہوگی۔ عالمگیر روحانیت وہی لیکر آئیں گے۔ اب چھوٹی موٹی روحانیت کام نہیں دیگی

سوائے اس کے کہ چھوٹی روحانیت سے آدمی اپنے مجمع کو سنبھال لے لیکن عالمگیر طور پر قلوب میں ذہنی انقلاب ہو تو جب تک عالم گیر روحانیت نہ ہو اس وقت تک یہ چیز پیدا نہیں ہوگی۔

بزرگوں کے مکاشفات

بعض بزرگوں کے مکاشفات بھی ہیں مثلاً حضرت گنگوہیؒ نے ایک رسالہ لکھا "ہدایت المعتدی فی قراءۃ المقتدی" یہ فاتحہ خلف الامام کے بارے میں لکھا۔ اس کو پڑھ کر مجمع کو سُنایا۔ سب نے کہا کہ حضرت اس کو چھپنا چاہیئے۔ یہ تو بڑی بنیادی چیز ہے حضرت نے فرمایا کہ چھاپنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اگر اس کتاب کے ذریعہ سَو میں سے ایک کی اصلاح ہوئی تو ۹۹ گمراہ بھی اسی کتاب سے ہوں گے۔ کیونکہ لوگوں کے قلوب میں عام فساد پیدا ہو چکا ہے اور اب مجھے امت کی نپٹنے کی توقع نہیں ہے جب تک ظہور مہدی نہ ہو جائے یہ ان کا مقولہ ہے۔ اور حضرت نانوتویؒ کا مقولہ یہ ہے کہ جس کو مجھ سے امیر شاہ خانصاحب مرحوم نے بیان کیا کہ حضرت نانوتویؒ دہلی تشریف لے گئے۔ مدرسہ عبدالرب میں قیام تھا کچھ بُخار ہو گیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا امروہیؒ اور میں یہ سب پَیر دبا رہے تھے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت مسلمانوں کے لیے دعا کیجئے۔ یہ بہت ذلیل ہو چکے۔ ان کی حکومت جا چکی۔ ان کی جائیدادوں اور جاگیروں پر ساہوکاروں نے قبضہ کر لیا۔ دفتری سلسلہ میں ان کا کوئی رسوخ نہیں رہا۔ حکومت کے لوگ غالب آرہے ہیں۔ یہ بہت پسماندہ ہو گئے۔

دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ یہ ذلت رفع فرمائیں تو حضرت جوش میں اسی بُخار کی حالت میں اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ امیر شاہ مسلمان ذلیل ہو گئے ابھی کچھ ذلیل نہیں ہوئے ابھی اور ذلیل ہوں گے اور انتہاء ہو جائے گی ان کی ذلت

کی جو ذِلت اُنھیں مِلے گی۔ تم لوگوں کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ اس وقت غیرت خداوندی جوش میں آئے گی۔ اور ادھر سے مدد ہوگی۔ خراسان کی طرف اشارہ کیا۔ (مطلب ظہورِ مہدی تھا اور حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ ہے) کہ اس زمانے میں مجدد کا کام یہ نہیں ہے کہ غیروں کو دائرۂ اسلام میں داخل کرے کیونکہ اتنی بڑی قوت کا کوئی مجدد نہیں ہے۔

سب سے بڑا کام مجدد کا یہ ہے کہ اپنوں کو وہ بھاگنے رکھے جس سے وہ دین پر قائم رہیں۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ تمام اغیار دین پر آجائیں یہ مشکل ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسی قوت کا مجدد ہو کہ جس کی روحانی طاقت ایسی بڑھی ہو جو سارے عالم کے حالات کو بدل سکے اور اب اس قوت کے مجدد سوائے مہدی علیہ السلام کے کوئی دوسرا نہیں نظر آتا۔

الحاصل آج کل اپنی عملی کوتاہیوں کی اصلاح کرنا اور اصل شریعت کے مطابق خود زندگی گذارنا اور امت کو اس کی تبلیغ کرنا یہ سب سے بڑی کامیابی ہے

ظہورِ مہدی علیہ السلام

مہدی علیہ السلام کے بارے میں کچھ علامتیں آئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مہدی علیہ السلام کا مکہ مکرمہ میں ظہور ہوگا۔ اور یہ حدیث صحیح بخاری شریف میں موجود ہے کہ غیب سے آواز آئے گی اور وہ آواز یہ ہوگی۔ هٰذَا خَلِيْفَةُ اللّٰهِ الْمَهْدِی فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْهُ۔ یعنی یہ اللہ کے خلیفہ مہدی ہیں ان کی بات مانو اور ان کی اطاعت کرو۔ اُس وقت یہ آواز عالم میں گونج اُٹھے گی اس وقت مہدی علیہ السلام کھڑے ہوں گے اور ظہورِ مہدی علیہ السلام کی آخری علامت یہ ہوگی کہ حج کا زمانہ ہوگا۔ اور حُجاج میں جنگ ہوگی اور اتنی شدید جنگ ہوگی کہ ہزاروں حُجاج قتل ہوجائیں گے اور حطیم بھی خون سے تر ہو جائے گا۔ اور غالباً

یہ لفظ ہے کہ تین سو تیرہ ۳۱۳ آدمی باقی رہ جائیں گے انھیں فکر ہوگی کہ اب کوئی مرکز تلاش کرنا چاہیئے تو وہ لوگ مہدی علیہ السلام کو تلاش کرنا شروع کریں گے۔

مہدی علیہ السلام کو جب اندازہ ہو جائے گا کہ لوگ مجھے پکڑنے آرہے ہیں تو وہ مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے جائیں گے مگر لوگ وہیں جاکر پکڑیں گے۔ وہ پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن لوگ نہیں مانیں گے۔ اوران کو پھر مکہ مکرمہ لائیں گے وہ فرمائیں گے۔ کہ تم جب خون خوار قوم ہو تو میں کیا اصلاح کروں تم خود ہی آپس میں کٹتے مرتے ہو۔ پھر بعد میں لوگوں سے پختہ عہد لیں گے اس وقت یہ تین سو تیرہ ۳۱۳ آدمی بیعت کریں گے۔

پھر مہدی علیہ السلام اپنا مستقر شام کو بنائیں گے اور اس میں یہ بھی ہے کہ ابدال شام اور اقطاب ہند اور نجائب عراق یہ سب آکر سیاہ جھنڈے کے نیچے یہاں جمع ہو جائیں گے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پورے عالم کے مسلمان ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔ اور اب اس میں تلاش ہوگی کہ نزول عیسوی کب ہوگا تو خبریں اُڑیں گی جیسا کہ خبریں اڑا کرتی ہیں۔ مگر تحقیق کو نہیں پہنچیں گی۔

لیکن بعض روایات میں ہے کہ عصر کی نماز کا وقت ہوگا اور امام مہدی علیہ السلام مصلّی پر پہنچ جائیں گے۔ تو عیسٰی علیہ السلام آواز دیں گے کہ سیڑھی لگاؤ اور مجھے اُتارو اُس وقت وہ اُتارے جائیں گے۔ اُترتے ہوئے ان کے بدن پر وہ دو چادریں ہوں گی۔ جیسے احرام کا لباس ہوتا ہے امام مہدی علیہ السلام ان کی تواضع کریں گے کہ آپ نماز پڑھائیں تو عیسٰی علیہ السلام فرمائیں کہ امامکم منکم کہ اس امت کے امام اسی امت میں سے ہوں گے چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السلام انکی اقتداء کریں گے اور مہدی علیہ السلام نماز پڑھائیں گے۔

خروجِ دجّال اور قتلِ دجّال

اس کے بعد دجّال کی تلاش ہوگی دجّال ایک بہت بڑا فتنہ ہوگا۔ وہ ایک آنکھ کا کانا ہوگا۔ اور جس سواری پر چلے گا وہ بھی کانا ہوگا۔ لوگوں کے دلوں میں اس قدر اس کا خوف ہوگا۔ اس کی اقتداء کرتے چلے جائیں گے۔ اور اس کو خدا مانیں گے مختلف مقامات سے فارغ ہوکر وہ مکّہ اور مدینہ کی طرف رُخ کریگا۔ مگر وہ وہاں پر کامیاب نہ ہوگا۔ ایک مسلمان کے سامنے اپنی خدائی کا دعوٰی کریگا اور اپنے آپ کو خدا ماننے پر ان کو مجبور کریگا۔ مگر وہ انکار کریں گے اور کہیں گے تو دجّال کافر ہے اس کو غصہ آئیگا۔ اور قتل کر دے گا اور پھر زندہ کرے گا اور کہے گا کہ اب آپ ہماری خدائی کا اقرار کیجئے کیونکہ ہم مارتے بھی ہیں اور زندہ بھی کرتے ہیں وہ فرمائیں گے کہ اب ہم کو یقین ہوگیا کہ تو دجّال ہے اور حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کے ساتھ وہ ایسا معاملہ کرے گا وہ میں ہی ہوں پھر دجّال غصہ میں آکر ان کو قتل کرے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ مگر وہ یہی فرمائیں گے کہ تو کافر اور دجّال ہے پھر وہ قتل کرنا چاہے گا۔ مگر تیسری بار قتل نہ کر سکے گا۔ پھر عیسٰی علیہ السّلام کو مدینہ کی طرف آنے کی اطلاع ہوگی وہ آئیں گے اور ایک عصا ماریں گے وہ مر جائے گا۔

یہود و نصارٰی کا قتلِ عام

قتلِ دجّال کے بعد جہاد کی تیاری ہوگی اور سارے مسلمان جہاد میں شریک ہوں گے اس کو ملحمِ کبرٰی کہا گیا ہے۔ جنگ عظیم ہوگی۔ اور اتنا قتلِ عام ہوگا کہ احادیث میں ہے کہ کوا اُڑے گا وہ صبح سے شام تک اُڑتا رہے گا۔ مگر لاش ہی لاش دیکھتا جائے گا۔ سارے یہود قتل کر دئیے جائیں گے۔ اس وقت زمین پر کوئی یہودی باقی نہیں رہے گا۔ اگر کوئی یہودی پہاڑ کے کھوہ میں جاکر چھپے گا تو پتھر سے

آواز آئے گی کہ یہاں پر یہودی ہے اس کو قتل کرو۔ یہاں تک کہ سارے یہودی قتل کر دیئے جائیں گے۔ رہا نصاری کے متعلق تو جو لوگ اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ وہ محفوظ رہیں گے بقیہ سارے نصاریٰ بھی قتل کر دیئے جائیں گے اس وقت سارے عالم میں صرف مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔ اسلام میں دین کی تکمیل کا وعدہ کیا گیا ہے۔

جب دین کی تکمیل کماً کیفاً ہو جائیگی تو قیامت قائم ہو جائیگی

دین کی تکمیل دو حیثیتوں سے ہوتی ہے ایک کیفاً اور ایک کماً۔

دین کی تکمیل کا کیفیت کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ ایک ایک شخص دین کا مجسمہ بن جائے اور کمیت کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ تعداد کے لحاظ سے کوئی شخص باقی نہ رہے جو مسلمان نہ ہو جائے۔ دین کی کیفی تکمیل قرنِ صحابہ میں ہو چکی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں صحابہ کرام کی ایک لاکھ چوبیس ۲۴ ہزار کی تعداد ہو گئی تھی۔ اور اتنے ہی ایک لاکھ چوبیس ۲۴ ہزار انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے۔ کوئی نہ کوئی صحابی کسی نہ کسی نبی کی سنت پر ضرور تھے۔ گویا وہ نبی تو نہیں تھے لیکن اخلاق اس نوعیت کے تھے جو انبیاء علیہم السلام کے ہوا کرتے ہیں تو کیفی طور پر دین مکمل ہو گیا۔ لیکن کمیت باقی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی باقی نہ رہے جو اسلام قبول نہ کر لے اور اس کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ

یعنی وہ ذات جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ سارے دین پر غالب ہو جائے۔ مطلب یہ کہ سارے ادیان پر اسلام غالب آجائے اور کوئی فرد باقی نہ رہے۔ یا جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے لَا یَبْقٰی

عَلٰی ظَہْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا دُبُرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ یہ پیشین گوئی ابھی تک باقی ہے۔ مگر یہ خاتم المجددین نزول عیسوی کے وقت پوری ہوگی۔ فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ اس روایت کے آخر میں یہ جملہ بھی ہے فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ اسمیں شراح کا اختلاف ہے کہ یہ حضورؐ کا قول ہے یا ابوہریرہؓ کا مقولہ ہے حضورؐ نے تو اتنا فرمایا کہ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ قَالَ اَبُوْھُرَیْرَۃَ رضؓ فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ یعنی ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ پھر تو ایک ہی دین ہو جائے گا۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ حدیث کے الفاظ ہیں لیکن ہر صورت میں مطلب یہی ہے کہ سارے عالم کا دین صرف ایک ہوگا یعنی اسلام۔

دو حدیثوں میں تعارض اور ان کا جواب

ایک روایت میں پانچ سو برس کے بعد مسلمانوں کا فنا ہونا بتایا گیا ہے اور ایک روایت میں ایک ہزار برس کے بعد اس طرح بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض معلوم ہو رہا ہے۔

حکیم الاسلام نے فرمایا کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ ان حدیثوں میں علمائے نے تطبیق اس طرح دی ہے کہ پانچ سو سال کی عمر جو دکھائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منہاج عربیت پر حکومت قائم رہے گی۔ اور پانچ سو برس کے بعد وہ عربی رنگ باقی نہیں رہے گا تو یہ پانچ سو برس کے بعد وہ عربی رنگ باقی نہیں رہے گا۔ تو یہ پانچ سو برس کا اختتام ہوا۔ اور ہزار برس کے بعد مسلمانوں کی کمزوری ظاہر ہونے لگی۔ اس کے بعد عیسائیوں کا غلبہ شروع ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی حکومت اور اقتدار پر اثرات قائم کیے یہاں تک کہ آج پوری دنیا میں نصارٰی کا غلبہ ہے اور مسلمانی حکومتیں ہیں وہ بھی ان کے زیر اثر ہیں اور

ان کی پناہ ڈھونڈتی ہیں تو دونوں حدیثیں صحیح ہیں ایک میں عزبیت کا فنا ہونا دکھایا گیا ہے۔ اور ایک میں قوت اور شوکت کا فنا ہونا دکھایا گیا۔

اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا اَلْخِلَافَةُ مِنْ بَعْدِیْ ثَلٰثُوْنَ عَامًا۔ یعنی میرے بعد خلافت تیس۳۰ سال رہے گی۔ اور ساتھ میں یہ بھی پیشین گوئی ہے کہ جب تک بارہ۱۲ خلفاء ظاہر نہ ہو جائیں گے اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی۔

تو تیس۳۰ سال میں تو بارہ۱۲ خلیفہ نہیں ہوئے صرف خلفاء اربعہ اور امام حسینؓ یا عمر بن عبدالعزیزؒ کیونکہ ان کی حکومت بھی علیٰ منہاج النبوت تھی۔ وہ ختم ہو گئی۔

دوسری جگہ یہ فرمایا گیا کہ تیس۳۰ برس کے بعد خلافت ختم ہو جائیگی۔ علماء اس کا مطلب یہی بتلاتے ہیں کہ خلافت علیٰ منہاج النبوت صرف تیس۳۰ سال تک رہے گی اور علیٰ منہاج الملوکیت وہ آگے چلتی رہے گی۔

تو مہدی علیہ السلام کا زمانہ وہ زمانہ ہوگا کہ دنیا میں کوئی کافر باقی نہ رہے گا صرف مسلمان ہی مسلمان ہوں گے تو اس وقت دین کی تکمیل کمیت کے اعتبار سے بھی ہو جائے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ط

پورا ہو جائے گا۔ اس کے بعد بہت سے انقلابات آتے رہیں گے اور پھر کفر اور شرک کا غلبہ ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک ایسا بھی وقت آئے گا کہ صرف تھوڑے سے مسلمان زمین پر رہ جائیں گے۔ ایک ہوا چلے گی وہ مر جائیں گے اسکے بعد اس زمین پر صرف کافر ہی کافر رہیں گے

وہ من مانی زندگی گذاریں گے۔

فسق وفجور وزنا وغیرہ عام ہوجائیں گے۔ حیا باقی نہ رہے گی۔ بے حیائی عام ہوجائے گی۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ زمین پر اللہ کا نام لینے والا ایک شخص بھی موجود نہ ہوگا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کو جلال آئے گا اور اسرافیل علیہ السلام کو صُور پھونکنے کا حکم فرمائیں گے۔ تو دین کی تکمیل کیفی اور کمّی اعتبار سے پوری ہونے کے بعد ہی قیامت قائم ہوگی۔ اور شرار الخلق پر قائم ہوگی۔

مجلس نمبر ۱۱

۱۷ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق ۴ اکتوبر ۱۹۷۴ء

اس مجلس میں مختلف سوالات کیے گئے اسلئے اس میں مضامین
بھی مختلف ہیں۔

سوال:۔ یہ تھا کہ اسلام میں قربانی کی مشروعیت کس حکمت کی بنا پر ہے اور پھر مینڈھا ہی فدیہ میں کیوں دیا گیا۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی نے فرمایا کہ عالم کی تخلیق کا مقصدِ اصلی عبادت ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ہم نے جنّوں اور انسانوں کو عبادت ہی کیلئے پیدا کیا۔ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسکی عبدیت مطلوب ہے۔ ظاہر بات کہ انسان مجموعہ ہے بدن اور روح کا۔ اگر صرف بدن نے عبادت کی تو روح رہ جائے گی اور اگر فقط روح نے عبادت کی تو بدن رہ جائیگا۔ اور عبادت جبھی مکمل ہو گی کہ بدن و روح دونوں کے مجموعہ پر مشتمل ہو۔

ایک صورت یہ ہے کہ بدن میں روح ہوتے ہوئے بدن کے تمام اجزاء سے عبادت کی جائے۔ قلب سے الگ۔ دماغ سے الگ۔ ہاتھ و پیر سے الگ عبادت میں یہ سب چیزیں شامل ہیں مثلاً نماز عبادت ہے اس میں بدن کو پابند کیا گیا کہ ہاتھ یوں باندھو۔ رکوع یوں کرو وغیرہ وغیرہ۔ ادھر اُدھر دیکھنا جائز نہیں۔ زبان کی عبادت یہ ہے کہ کلامِ الٰہی پڑھے۔ کان کی عبادت یہ ہے کہ نماز کی حالت میں باہر کی کوئی آواز نہ سُنے اور آنکھ کی عبادت یہ ہے کہ باہر کی کوئی

چیز نہ دیکھے اور نہ اس کے دیکھنے کو متعین کرے اگر اتفاقیہ طور پر کوئی چیز نظر آجائے تو کوئی حرج نہیں مثلاً کتاب پر نظر پڑی تو کوئی فساد نہیں ہوا۔ لیکن اگر غور کیا کہ کتاب میں کیا لکھا ہے تو یہاں سے نماز میں فساد پیدا ہوجائے گا۔ تو مطلقاً نظر پڑ جانا جو غیر اختیاری ہے وہ نماز میں مخل نہیں ہے لیکن جب ارادے سے نظر ڈالی جائے تو وہ مخل ہوگی۔

اسی طرح یہ مکروہ ہے کہ تشہد کے اندر آدمی خواہ مخواہ انگلیاں پھیلائے بلکہ ادب یہ ہے کہ ملاکر قبلے کی طرف رکھے یہ انگلیوں کی عبادت ہے اسی طرح آنکھ کے لیے ضروری ہے سجدہ گاہ کی طرف نگاہ ہو کانوں کو نماز سے باہر کی چیز کی طرف نہ لگائے۔ خیال کے لیے یہ حکم ہے کہ خیال کو بٹنا نہیں چاہیئے۔

مجموعہ عبادت یہ ہے کہ جہاں آدمی نے ان چیزوں کو ختم کیا وہیں نفس کو بھی ختم کردے۔ ہونا تو یہی چاہیئے تھا کہ آتے ہی آدمی اپنے کو خدا کے لیے قربان کردیتا اور اللہ کی راہ میں فنا ہوجاتا۔ مگر اس میں نظام عالم بگڑتا تھا۔ اسلیئے حق تعالیٰ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ البتہ ایک موقعہ پر فنائیت کو بہت جگہ دی گئی ہے اور وہ حج ہے کیونکہ حج تمام تروک کا مجموعہ ہے۔ ترکِ لباس، ترکِ زینت ترک لذات وغیرہ۔ اخیر میں یہ ہے کہ منیٰ میں جاکر ہر شخص اپنے نفس کی جانور کی صورت میں قربانی پیش کرتا ہے۔ گویا جان کا فدیہ رکھا گیا ہے۔ نفس کی جگہ پر نفس دو۔ ہم تمہارا ہی نفس سمجھیں گے کہ تم نے اپنے کو راہِ خدا میں ذبح کردیا گو وہ قربانی کا جانور ہوگا۔ مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا میں ہوائے نفس کو ہی ختم کیا گیا ہے اور یہاں نفس کے بدلے میں جانور ذبح کرایا گیا تو اصل تو جان لینی تھی اسلیئے قربانی رکھ دی ایک جگہ تو اپنی جان کو بھی مارنے کا حکم دیا وہ جہاد ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اسی لیے جاتے تھے کہ ہم جہاد میں قتل ہوجائیں۔

ایک صحابیؓ کی شہادت کی تمنّا

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میں شہید ہونا چاہتا ہوں مگر آپ جہاد میں نہیں بھیج رہے ہیں۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک قبیلے نے آکر درخواست کی کہ ہم اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں آپ ہمارے قبیلے میں چند چنے ہوئے حضرات کو بھیج دیں تاکہ ان کو اچھی طرح اسلام سمجھا دیں آپ نے چند چیدہ صحابہ کو بھیجا ان میں یہ بھی شامل تھے انہوں نے دھوکا دیکر سب صحابہ کو قتل کر دیا یہ تنہا رہ گئے ان کو پکڑ آگیا قبیلے کے سردار نے کہا کہ ان کو ذبح کردو۔ اور وہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جان کے خوف سے اسلام کو چھوڑ دے مگر انہوں نے اسلام نہیں چھوڑا جب گردن پر چھری چلی تو فرمایا فزت برب الکعبہ الحمدللہ میں کامیاب ہوگیا، شہادت مل گئی۔ شوقِ شہادت کی تکمیل جہاد میں ہے تو نفس کی قربانی کے لیے جہاد رکھا گیا ہے کہ وہاں جاکر اپنے نفس کو ختم کرو۔ تاکہ اعلاء کلمۃ اللہ کا فریضہ بھی ادا ہو اور انسانیت کو زندگی بھی ملے اس لیے میدانِ جہاد سے فرار کی ممانعت کی گئی ہے کہ جان چھڑا کر مت بھاگو۔ بلکہ شہید ہوجاؤ۔

ہاں! امامِ جنگ کسی مصلحت سے پیچھے ہٹنے کی اجازت یا حکم دے تو وہ الگ بات ہے۔ فَلَا تُوَلُّوْهُمْ۔ یعنی پشت مت پھیرو۔ تو یہاں پر نفس کی قربانی رکھی۔ اور منیٰ میں نفس کا بدل جانور کی قربانی رکھی۔

رہا مینڈھے کا سوال یہ سوال بے کار ہے کہ مینڈھا کیوں رکھا گیا یہ تو شارع علیہ السلام کی مصلحت ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ کتّا اگر برتن میں منہ ڈال دے تو سات مرتبہ برتن دھونے کا حکم ہے لیکن شکاری کتّا اگر جانور کو مار دے اور گوشت میں

منہ ڈال دے تو یہاں دھونے کا حکم کیوں نہیں ہے۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ دونوں جگہ ناپاکی ہے مگر اس کا تدارک ہے۔ ایک جگہ سات مرتبہ دھونا اور دوسری جگہ کلمہ شہادت اور بسم اللہ کے ساتھ ذبح کرنا۔ اس طرح اس کی ناپاکی دور ہوگئی ہر جگہ کا حکم الگ الگ ہے ایک جگہ یعنی برتن میں جو کتے نے منہ ڈالا ہے تو بے جان میں منہ ڈالا ہے۔ یہاں سات مرتبہ دھونے کا حکم ہے اور ایک جگہ جان دار میں منہ ڈالا ہے تو جاندار میں منہ ڈالنے سے وہ ناپاک نہیں ہوسکتی کیونکہ نفس میں ناپاکی نہیں آسکتی اور جو ناپاکی تھی اسے بسم اللہ اور کلمہ طیبہ نے دور کردیا۔ اگر یہاں پر بھی سات مرتبہ دھونے کا حکم ہوتا کہ ہر ہر بوٹی کو سات بار دھوؤ تو یہ حرج عظیم تھا اور بے کار بھی تھا۔ اسلئے منہ ڈالنے سے ظرف تو ناپاک ہوسکتا ہے مگر جان ناپاک نہیں ہوسکتی پھر دمِ مسفوح کے نکلنے سے بقیہ ناپاکی خود نکل گئی۔

نماز میں خیالات کے دفعیہ کی تدبیر

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر نماز میں خیالات کے ہجوم ہوں تو ان کے دفعیہ کی کیا صورت ہوگی۔ حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ خیالات کے آنے سے عبد اور معبود کے درمیان جو ایک خاص تعلق ہوتا ہے قطع ہوجاتا ہے۔ اگر آپ نے دفعیہ کی فکر کی تو شیطان سے لڑائی مول لے لی تو وہ وصل مع اللہ ختم ہوگیا۔ اور شیطان کا مقصد پورا ہوگیا وہ چاہتا ہے کہ میرے ساتھ لڑتے رہیں تاکہ اللہ کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

اسلئے فرمایا گیا کہ اس کی دفعیہ کی فکر مت کرو صرف خیال ہٹالو اور اگر خیال ہٹانے کے بعد پھر بھی وسوسے کا ہجوم ہو تو اس کا علاج یہ تبلایا گیا ہے کہ أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھو تو وہ دفع ہوجائے گا۔ اور اگر

پھر بھی آئے تو بائیں طرف تین مرتبہ تھتکھار دو۔ یعنی تھُو تھُو کردو اس کا مقام بائیں جانب ہے تو وہ دفع ہوجائے گا اور اگر پھر بھی آتا ہی رہے تو اس کا علاج قاسم ابن محمد ابن بکرؒ نے بتایا ہے جو مدینے کے فقہائے میں سے ہیں اور ہمارے اجداد میں ہیں ان کے پاس بھی ایک شخص آیا کہ حضرت بُرے خیالات آتے ہیں تو فرمایا کہ خیال ہٹالو کہا ہٹاتا ہوں مگر پھر بھی آتا ہے کہا اَعُوذُ باللّٰہ پڑھ دو کہا اسکے پڑھنے کے بعد پھر بھی آتا ہے فرمایا تھتکار دو کہا پھر بھی آتا ہے تو فرمایا کہ اچھا شیطان سے کہدو کہ تیرا جو جی چاہے کرلے ہم نماز ہی پڑھیں گے۔

اور اس کا بہترین علاج حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے فرمایا وہ یہ ہے کہ وسوسے آتے ہیں خیال کو آزاد چھوڑنے میں۔ لہٰذا علاج ہے کہ ہر ذکر اور ہر عبادت شعور اور ارادے سے کرو۔ اب میں الحمد للہ کہہ رہا ہوں اور اب رب العالمین کہہ رہا ہوں تو سارا خیال قرآن میں لگ جائے گا۔ اس کو ادھر اُدھر بھٹکانے کا موقع ہی نہیں ملے گا یہ تو جب ہوتا ہے کہ قرآن تو حفظ پڑھ رہے ہیں مگر خیال دکان اور مکان میں جا رہا ہے لہٰذا جب ہر لفظ کو شعور سے ادا کروگے تو خیال کو دوسری طرف جانے کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔

حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک دوسرا علاج تجویز فرمایا ہے وہ یہ کہ اگر وہ دفع نہ ہو تو یہ دل میں جماؤ کہ اللہ نے شیطان کو کیسی قدرت دے رکھی ہے ہمارے دل میں گھس کر خیال ڈال رہا ہے تو قدرتِ خداوندی کی طرف خیال چلا جائے گا شیطان سے ہٹ جائے گا۔

مولانا مُحب الدّینؒ کا ایک عجیب واقعہ

حکیم الاسلام مدظلہ العالی نے فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہؒ کے دو خلیفے مکے میں رہتے تھے۔ ایک مولانا محب الدّین صاحبؒ یہ صوبہ سرحد

کے رہنے والے تھے۔ دوسرے مولانا شفیع الدین نگینویؒ صاحب۔

میں نے مولانا شفیع الدینؒ کی زیارت کی ہے پہلی مرتبہ جب حج کو گیا ہوں تو مولانا باحیات تھے۔ کوہِ صفا پر ان کا مکان تھا بڑی محبت اور شفقت سے ملے اور اپنے حجرے میں مجھے لے گئے وہاں چائے وغیرہ پلائی یہ بڑے قوی النسبت لوگوں میں سے تھے۔

اور مولانا محب الدین صاحبؒ ان سے بھی زیادہ قوی النسبت تھے اور ساتھ ہی صاحبِ کشف لوگوں میں سے تھے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کوئی تمام آداب و شرائط کے ساتھ وضو کرے اور اس کے بعد دو رکعت نفل پڑھے اور لایُحدِّثُ فیہ نفسہٗ اس میں خیالات کو سوچ سوچ کر نہ پکائے تو غفرلہٗ ما تقدم من ذنبہٖ یعنی اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

تو مولانا محب الدین صاحب نے اس حدیث پر عمل کرنے کا ارادہ کیا اور پورے اسباغ کے ساتھ وضو کیا اور سارے شرائط پورے کئے حُسنِ نیت اور اخلاص سے دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ مگر نماز میں آنکھیں بند کرلیں تاکہ وسوسے نہ آنے پائیں۔ اس طرح سے نماز پڑھی کہ اِدھر اُدھر خیال نہیں گیا۔ نماز کے بعد ان کو انشراح ہوا کہ ٹھیک حدیث کے مطابق ہماری نماز ہوئی ہے، چونکہ یہ صاحبِ کشف تھے اس لیے مراقب ہوئے کہ میں عالمِ مثال میں اپنی نماز کی صورت دیکھوں کہ قبولیت کے کیا آثار نمایاں ہوئے تو ان کی نماز متمثل ہوئی ایک حسین اور جمیل عورت کی صورت میں نہایت خوب صورت اور حسین و جمیل، لباس بڑا فاخرہ اور معنبر اور معطّر لیکن آنکھوں سے اندھی اب یہ حیران ہوئے کہ یہ تو سارا حُسن ہی کرکرا ہوگیا۔ جب آنکھ ہی نہیں ہے تو پھر جمال ہی کیا رہ گیا۔ اس کی وجہ پر غور کرنے لگے مگر وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔

پھر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ حضرت نے برجستہ فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے مولانا آپ نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی ہے۔ کہا جی حضرت ہم نے ایسا ہی کیا تاکہ وسوسے نہ آئیں تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنا یہ سنّت کے خلاف ہے چونکہ آپ کی نماز میں ایک سنت ترک ہو گئی اسلیئے اسکا عیب نماز میں نمایاں ہوا۔ نماز اعلیٰ اور مقبول لیکن ایک سنت کے ترک پہ خرابی پیدا ہو گئی۔ اگر آپ کھلی آنکھوں نماز پڑھتے اور ہزاروں وسوسے آتے تو اس حدیث کے خلاف نہ ہوتا کیونکہ حدیث میں ہے لایُحدِّثُ فیہ نفسہٗ، مطلب یہ ہے کہ وساوس اپنے ارادے سے نہ لاؤ اور آپ کے خیال بے ارادے تھے اسلیئے اگر ہزار وسوسے آتے تو حدیث شریف کے خلاف نہ ہوتا اور نہ نماز میں کوئی فرق پڑتا۔ مگر آپ نے سُنت چھوڑ دی جس کی وجہ سے وہ عیب نمایاں ہوا۔

اتنا بیان کرنے کے بعد حکیم الاسلام پہ ایک جذب کی کیفیت پیدا ہو گئی پھر آپ نے فرمایا کہ یا اللہ ہماری نماز میں تو واجبات بھی ترک ہو جاتے ہیں تو ہماری نماز کی شکل کیا ہو گی۔ جب ایک سنت کے ترک پہ اتنا بڑا عیب پیدا ہو گیا تو جہاں مستحبات اور سُنّت بلکہ واجبات ندارد ہیں تو اس نماز کی شکل کیا ہو گی۔

خیر! بڑوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔ ہم تو عوام میں سے ہیں۔ ہم تو فرائض واجبات ادا کریں نماز ہو گئی یہ تو گرفت بڑوں کے لیئے ہے ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی گرفت ہو جاتی ہے ان کی حیثیت درباری جیسی ہے جس کی ایک ایک ادا نظر میں رہتی ہے لہٰذا مایوسی اس وقت پیدا ہو گی جب ہم یہ سمجھ لیں کہ ہمارا بھی وہی مقام ہے جو ان کا تھا۔ اور جب ان سے ایک مستحب ترک نہیں ہوا تو ہم سے کیوں ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارا وہ مقام ہی نہیں لہٰذا اپنے مقام میں رہ کر

اِس پر عمل کرو۔ اس میں باتیں قابلِ تحمل ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے آرزو کرو مگر اپنی حیثیت کے مطابق۔ اگر حیثیت سے زیادہ آرزو کرو گے تو یہ ایسا ہے جیسے کہ گھاس پھونس اور تنکا یوں کہے کہ میں پہاڑ سر پر اُٹھالوں تو تنکے کی حیثیت ہی کیا ہے جو پہاڑ کو اُٹھائے گا۔ لہٰذا اپنی طاقت کے مطابق آرزو کرنی چاہیئے۔

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی حکایت

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے یہاں مہمان آگئے اور حال یہ تھا کہ مہمان کے لیے کھانے وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں تھا حضرت خواجہ صاحبؒ بہت پریشان ہوئے کیوں کہ یہاں فقر و فاقہ رہتا تھا سوچنے لگے کہ گھر میں ایک ٹکڑا نہیں اس کے سامنے کیا رکھوں اور اس کی کیا خاطر کروں کبھی گھر میں جاتے کبھی باہر آتے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کے مریدین میں ایک بھٹیارا بھی تھا اس نے محسوس کیا کہ مہمان آیا ہوا ہے اور گھر میں کچھ ہے نہیں تو وہ ایک خوان سجا کر حاضر ہوا اور حضرت خواجہ کی خدمت میں پیش کر دیا حضرت خواجہؒ صاحب بہت خوش ہوئے مہمان کو کھانا کھلانے کے بعد خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے اُس وقت ایک رحمت کا جوش تھا اور قرب و فنائیت کا مقام تھا جو وہ چاہتا وہ ملتا۔ فرمایا تو نے آج بڑا کام کیا ہے تو نے ہزاروں فکر کو رفع کر کے دل خوش کیا ہے اس نے کہا کہ مجھے اپنے جیسا کر دو خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ آدمی کو اپنی طاقت کے مطابق آرزو کرنی چاہیئے اس نے کہا کہ نہیں میری تو یہی تمنا ہے کہ اپنے جیسا کر دو۔ خواجہ صاحبؒ نے سمجھایا کہ تو اس کا تحمل نہیں کر سکے گا کیونکہ جو نسبت کی قوت ان کے قلب کے اندر تھی وہ بڑی قوت تھی

اور اس کا اتنا بڑا ظرف نہیں تھا۔ بلکہ بھٹیالا کا چھوٹا سا ظرف۔

یہ اصولی بات ہے کہ جو ظرف صرف ایک پاؤ کا ہو اگر ایک من اس میں رکھو تو وہ ٹوٹ جائیگا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ دوسری چیز مانگ لے مگر اس نے کہا کہ میں تو یہی چیز مانگوں گا۔

فرمایا اچھا اللہ مالک ہے اس کو اپنے حجرے میں لے گئے اور اس کی طرف متوجہ ہوتے اپنی پوری نسبت اسمیں القا کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں نسبت تو آگئی مگر اس طرح سے آئی کہ خواجہ صاحب کی صورت بھی آگئی جب وُہ دروازے سے نکلا خواجہ صاحب کی صورت میں نکلا یعنی دو خواجہ اندر سے نکلے فرق صرف یہ تھا کہ ایک متانت کے ساتھ آرہے ہیں اور ایک لڑکھڑاتا ہوا۔ جھکتا ہوا آرہا ہے اس میں وہی نسبت بھی آگئی اور شکل و صورت بھی آگئی لیکن چند دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اِس لیے آدمی کو اتنی ہی تمنا کرنا چاہیے جتنا اُس کا ظرف ہو۔ طاقت سے زیادہ مانگنا یہ تو فنا کا مانگنا ہے کہ میں باقی ہی نہ رہوں گا۔ لہٰذا گھاس صرف یہ تمنا کرے کہ میرے اندر پھول آجائیں یہ اس کے مناسب ہے پہاڑ کے اُٹھانے کی تمنا بے کار ہے۔

مجلس نمبر ۱۲

۲۵؍رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق ۷؍اکتوبر ۱۹۷۴ء

کلام پاک کی خصوصیات اور اس کے کمالات پر چند واقعات

حضرت نے فرمایا کہ میں سفر کر رہا تھا میرٹھ میں ایک نوجوان ہندو لڑکا ملا مگر اس کی بات مسلمانوں جیسی تھی۔ میں نے معلوم کیا کہ تم ہندو ہو مگر باتیں مسلمانوں جیسی کرتے ہو تو اُس نے کہا کہ میں ہندو تھا لیکن مسلمان ہو گیا ہوں ابھی تک ہم نے اپنے اسلام کو ظاہر نہیں کیا۔

میں نے پوچھا تم مسلمان کیسے ہوئے اسلام کی کون سی خوبی آپ نے دیکھی تو اس نے کہا کہ میری نظر اس پر گئی کہ قرآن شریف میں کوئی لفظ اور جملہ ایسا نہیں ہے جس میں اللہ کا نام نہ ہو یہ وہی دین کر سکتا ہے جو صحیح توحید پھیلائے اور ایک ہی طرف رجوع کرائے کہیں اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کہیں وَاتَّقُوا اللّٰہ کہیں یُعَلِّمُکُمُ اللّٰہ، وَاَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ

جگہ جگہ اللہ کا نام ہے کسی مذہبی کتاب میں نہیں دیکھا کہ اس کثرت سے اللہ کا نام استعمال کیا گیا ہو۔ یہ بات میرے دل میں لگ گئی کہ قرآن کا ہر جملہ خدا ہی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ دوسرے کی طرف نہیں معلوم ہوا کہ ہدایت کے لیئے ذرا سی چیز کافی ہو جاتی ہے اس کے لئے یہی ذریعہ بن گیا۔

حضرت مولانا عبدالماجد صاحبؒ کا واقعہ

حضرت نے فرمایا کہ حضرت مولانا عبدالماجد صاحبؒ دریا بادی ابتداءً بالکل ملحد اور دہریہ تھے نہ دین کو مانتا نہ خدا کے وجود کو ماننا۔ بالکل آزاد تھے سید اکبر حسین جج الہ آبادی جن کا لقب لسان العصر ہے اور واقعی وہ

لسان العصر تھے اُنہوں نے ظرافت کے انداز میں اس قدر حکمت کی باتیں کہی ہیں کہ آدمی کو واقعی ہدایت ہو جاتی ہے ان کا کلام حکمت آمیز ہوتا ہے تو مولانا عبدالماجد صاحب کے سید اکبر حسین صاحب سے بہت اچھے تعلقات تھے اکبر نے دیکھا کہ اس نوجوان کے اندر صلاحیت ہے مگر وہ غلط جگہ پر جاری ہے۔

انھوں نے مولانا سے کہا کہ تم نے کبھی قرآن شریف بھی پڑھا ہے مولانا نے کہا کہ معاذ اللہ لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے کس کتاب کا نام لیا جس میں پرانے قصے ہیں یہ زمانہ روشنی کا ہے۔ سید اکبر حسین صاحب نے کہا کہ یہ میرا مطلب نہیں بلکہ ادب کی حیثیت سے دیکھو۔ انشاء اور ادب کی حیثیت سے پڑھو تو تم کو ادبی قوت معلوم ہو گی۔ اس کو چھوڑ دو کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ کیا ہدایت ہے تم اسالیب بیان پر غور کرو کہ کتنے نفسیات کو کھولا ہے۔

چونکہ یہ مولانا کا موضوع تھا اس لیے یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن اس طرح سے قرآن شریف پڑھا سوٹ بوٹ چڑھا ہوا تھا اور آرام دہ کرسی پر لیٹا ہوا۔ پیر پھیلا کر حمائل شریف مثل ناول کے کتابوں کے لیے ہوئے مطالعہ کر رہا تھا۔ وضو وغیرہ کا سوال ہی نہیں پوری سورۃ فاتحہ دیکھ لی اس کے بعد سورۂ بقرہ پڑھنی شروع کی تو دو تین رکوع کے بعد پیر کو سکوڑ لیا۔ اور سنجیدہ ہو کر دیکھنا شروع کیا کہ اس میں تو بڑی حکمت کی باتیں ہیں اور نفسیات کے پہلو کھولے گئے یہاں تک کہ اُنھوں نے پُورا پارہ پڑھ لیا اور ان کے دل میں یہ چیز جم گئی کہ جس کو ہم حکمت کہتے ہیں وہ حکمت نہیں ہے۔ بلکہ حکمت یہ ہے جو اس کتاب میں ہے پھر یہ کتنی فطری باتیں بیان کی گئی ہیں۔

پھر یہ واقعہ سید اکبر حسین جج سے بیان کیا کہ شروع میں ہم نے اس طرح پڑھا۔ مگر معلوم ہوا کہ اسمیں بڑے کام کی باتیں ہیں تو سید اکبر حسین نے کہا کہ اگر تم

باوضو اور متوجہ ہوکر دیکھو تو اور باتیں کھلیں گی۔

چنانچہ اب انھوں نے باوضو دیکھنا شروع کیا پھر چند پارے کے پڑھنے کے بعد ان کے دل میں یہ بات جم گئی کہ یہ کلام حکیمانہ ہے اور جتنی باتیں ہیں وہ نہایت سچّی اور حق کی باتیں ہیں۔ نہ اس میں تعصب ہے نہ اس میں جانبداری ہے اب ان کے دل میں کچھ سوالات پیدا ہونے شروع ہوئے تو سید اکبر حسین کے پاس آئے کہ مجھے یہ یہ شبہات ہیں انہوں نے کہا کہ میں تو اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ البتہ حضرتِ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع کرو وہ تمہارے اشکالات کو حل کریں گے تو انھوں نے بہت سے سوالات لکھ کر حضرت کی خدمت میں بھیجے حضرت نے جواب میں لکھا کہ یہ لمبی چوڑی باتیں ہیں یہ خط و کتابت سے طے نہیں ہو سکتی ہیں۔ اگر کبھی ادھر آنے کا موقع ہو تو ہم سے ملاقات کر لینا۔ زبانی باتیں... مراسلت کی نسبت زیادہ نفع بخش ہوں گی۔ اور مجھے اتنی فرصت بھی نہیں کہ اتنا لمبا جواب لکھوں۔

چنانچہ ایک دن مولانا عبدالماجد صاحب پہنچ گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ کتنے دن قیام رہے گا۔ انہوں نے کہا تین دن۔ فرمایا کہ میری مجلس میں بیٹھو مگر بولنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ وہ بیٹھ گئے حضرت کی مجلس میں علمی باتیں اور علمی... مذاکرات ہوتی رہیں۔ اور ان کے دل پہ اثر ہونا شروع ہوا۔ اور بیسیوں اشکالات خود بخود حل ہو گئے۔ اس تقریر سے بہت اثر لے کر وہ گھر گئے۔ اس کے بعد سید اکبر حسینؒ نے کہا کہ اگر تم ان سے وابستہ ہو جاؤ تو کچھ اور کیفیت پیدا ہو جائیگی چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی دیوبند تشریف لائے اور مولانا مدنیؒ سے بیعت کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا کہ جب جماعت کے سب سے بڑے بزرگ موجود ہیں تو تم یہاں کیوں آئے حضرت تھانویؒ کے

پاس کیوں نہیں گئے۔

ان حضرات نے کہا کہ وہاں کے قواعد وضوابط بڑے سخت ہیں۔ شاید ہم برداشت نہ کرسکیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ کیسے قواعد وضوابط مولانا مدنیؒ ان حضرات کو خود لے کر تھانہ بھون گئے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ مدظلہٗ العالی نے فرمایا کہ میں خود اس سفر میں موجود تھا۔ پھر فرمایا کہ حضرت تھانویؒ کے یہاں صبح کو چار گھنٹہ کی مجلس ہوتی تھی اس میں مخصوص حضرات شامل ہوتے تھے اس مجلس میں ہم لوگ گئے تو حضرت تھانویؒ نے اس مجلس میں بہت علوم بیان فرمائے ان کا دل بالکل وابستہ ہوگیا۔ جب مجلس ختم ہوگئی تو مولانا مدنیؒ نے فرمایا کہ حضرت میں ان کو لے کر حاضر ہوا ہوں۔ بیعت فرمالیں حضرت نے فرمایا کہ آپ نے خود کیوں بیعت نہ کرلی تو حضرت مدنیؒ اپنی عادت کے مطابق فرمانے لگے۔ کہ حضرت میں ناکارہ ہوں نااہل ہوں کسی کام کا نہیں ہوں بہت نکما ہوں وغیرہ وغیرہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ دیکھئے میں نہ کوئی متکبر ہوں نہ متواضع۔ ایک سادہ سا آدمی ہوں۔ نہ آپ اتنے نالائق ہیں کہ ان کی خدمت نہ کرسکیں اور نہ میں اتنا نالائق ہوں کہ ان کی خدمت نہ کرسکوں۔ لیکن فائدہ آپ سے پہنچے گا۔ کیونکہ ماشاءاللہ آپ بھی خادم قوم ہیں اور یہ بھی خادم قوم ہیں تو پیر مرید میں توافق ہوجائے گا۔ تو آپ لوگ خادم قوم ہیں اور میں نادم قوم ہیں تو یہ میرے ساتھ وابستہ نہ ہوں گے اور ان کو فائدہ بھی نہ ہوگا۔ فائدہ آپ سے پہنچے گا۔ جب تک پیر مرید میں طبائع کا توافق نہ ہو افادہ اور استفادہ نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا مدنیؒ نے پھر وہی فرمایا کہ حضرت میں ناکارہ ہوں نکما ہوں وغیرہ وغیرہ۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اب میں بین بین بات کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بیعت تو آپ کرلیں اور تلقین ہمارے ذمہ کردیں پھر حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ حضرت

میں اِس لائق نہیں تو حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اب میں امر کرتا ہوں تو حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ جب آپ حکم فرماتے ہیں تو میں حکم کی تعمیل کروں گا۔ اور ان کو الگ لیجا کر بیعت فرمایا اور تعلیم سپرد کر دی۔

حضرت تھانویؒ کو پھر وہ لوگ ادھر اتنے متوجہ ہوئے کہ پیر کو بھول گئے پھر یہ کیفیت تھی کہ جتنی دیر حضرت تھانویؒ کی خدمت میں بیٹھتے آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ اور ان کے قلب کی عجیب کیفیت ہوتی۔ اس مجلس سے فارغ ہو کر جب یہ گھر تشریف لے گئے تو مولانا عبدالماجد صاحب نے حضرت تھانویؒ کو خط لکھا کہ میں تو آپ کے کشف کا قائل ہو گیا۔ اسلئے کہ جتنے سوالات ذہن میں لے کر گیا تھا آپ کی مجلس میں انھیں کے جواب میں آپ کی تقریریں ہوئیں میں آپ کے کشف کا قائل ہو گیا۔

حضرت تھانویؒ نے اس کے جواب میں لکھا کہ بھائی مجھے کبھی کشف نہیں ہوا اور نہ میرے اندر کشف کی صلاحیت ہے اس لیے کہ کشف سادہ طبیعت میں زیادہ ہوتا ہے اور میں متحرک ہوں اور جس کی طبیعت میں فکر رہتی ہے اس کے اندر یکسوئی نہیں رہتی جو کشف کے لیے ضروری ہے تو مجھے نہ کبھی کشف ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے یہ تو آپ کا حسنِ ظن ہے۔ اس پر انہوں نے یہ لکھا کہ اب تو میں اور زیادہ قائل ہو گیا اسلئے صاحبِ کشف یہ تھوڑے ہی کہا کرتا ہے کہ مجھ کو کشف ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ صاحبِ کشف ضرور ہیں تو حضرت تھانویؒ نے پھر لکھا کہ اگر آپ کے ذہنی سوالات کے جواب میری زبان پر آئے تو اس کا تعلق کشف سے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے فراست کہیں گے کہ آپ کے دل میں سوال تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب میری زبان سے ادا کرا دیا۔ اسکو فراست ایمانی کہیں گے۔ کشف نہیں گے۔ تو مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا کہ

اگر اس کو فراست مانا جائے تو ایک دو بات میں ہو۔ یہں چالیس سوال لے کر گیا تھا۔ سب کے سب فراست میں کیسے آگئے۔ یہ امر اتفاقی نہیں ہے۔ کشف ہے۔ تو حضرت تھانویؒ نے پھر جواب میں لکھا کہ مجھے تو کشف ہوتا نہیں لیکن جب تم میرے کشف کے قائل ہو تو مجھے بھی انکار کی ضرورت نہیں' ہوتا ہوگا۔' اس کے بعد یہ لکھا کہ کشف کمالات مقصودہ میں سے نہیں اگر آدمی دعویٰ بھی کرے کہ مجھے کشف ہوتا ہے تو وہ متکبر نہیں کہلائے گا۔ اسلئے کہ کشف مقصود نہیں جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ الحمدللہ میری آنکھیں ہیں اس سے دیکھتا ہوں اسے کوئی فخر وغرور نہیں کہے گا تو کشف ایک باطنی آنکھ ہے۔ اگر کسی کو ہو جائے تو یہی کہیں گے کہ باطنی آنکھ کھل گئی اور وہ مقصود کمال نہیں۔

اگر میں دعوای بھی کروں کہ مجھے کشف ہوتا ہے تو وہ کبر میں داخل نہ ہوگا لہٰذا جب آپ نہیں مانتے تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ضرور کشف ہوتا ہوگا اور میری آپ کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص دکان پر جائے اور کوئی چیز خریدے اور دکاندار وہ چیز سامنے رکھ کر یوں کہے کہ یہ چیز ہے اس کے اندر فلاں فلاں عیب ہیں اگر عیب نہ ہوتا تو میں آپ کو دس روپیہ پر دیتا لیکن عیب کی وجہ سے صرف ۶ روپیہ پر دے رہا ہوں گاہک کہنے لگے کہ یہ تو آپ کے کہنے کی بات ہے یہ تو بارہ روپیہ کی ہے مگر دکاندار کہہ رہا ہے کہ یہ کم قیمت کی ہے اس میں عیب ہیں مگر گاہک نہیں مانتا تو دکاندار کہتا ہے کہ بھائی تم ۱۲ روپیہ میں خرید لو جب نہیں مانتے تو ہمارا کیا نقصان اسمیں تو ہمارا فائدہ ہی ہے تو یہی مثال ہے کہ میں تو انکار کرتا ہوں کہ مجھے کشف نہیں ہوتا لیکن آپ نہیں مانتے تو اب میں بھی کہتا ہوں کہ ہوتا ہوگا پھر اتنے متوجہ ہوئے کہ حضرت مدنیؒ نے جو اپنی سوانح حیات لکھی ہے اس پر سخت تنقید کی ہے۔ جیسے کوئی عوام الناس کو ڈانٹا کرتا ہے کہ یہ بھی

غلط یہ بھی غلط پھر ہمہ تن حضرت تھانویؒ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا خط پہنچا اسوقت مولانا عبدالباری صاحب حیدر آباد جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے ڈھائی مہینہ کی چھٹی ہوئی تو انہوں نے حضرت کو لکھا کہ حضرت چھٹی ہو رہی ہے اور جی یہ چاہتا ہے کہ یہ وقت ہم وہیں گذاریں تو آیا دیو بند میں رہ کر یہ وقت گذاریں یا تھانہ بھون میں جو آپ کا مشورہ ہو حضرت نے بڑا عجیب اصولی جواب دیا فرمایا کہ اگر جامعیت مقصود ہے تو دیو بند چلے جاؤ اور اگر جمعیت مقصود ہو تو تھانہ بھون چلے آؤ مولانا ندوی نے لکھا کہ مجھے جمعیت مقصود ہے اسلیئے تھانہ بھون ہی حاضر ہوں گا چنانچہ یہی کیا۔

بیان القرآن کے متعلق علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا واقعہ

بیان القرآن کے بارے میں حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ یہ عجیب و غریب تفسیر ہے اس کے بارے میں حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیریؒ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ بیان فرمایا کہ وہ اُردو کتابیں نہیں پڑھتے تھے زیادہ تر عربی کتابیں دیکھتے تھے اُردو تفسیر وغیرہ کے خلاف تھے لیکن جب تفسیر بیان القرآن آپ کے سامنے آئی تو فرمایا کہ یہ بڑی حیثیت کی تفسیر ہے یہی ان کا جملہ ہے بڑی بڑی تفاسیر سے اس تفسیر نے بے نیاز کر دیا ہے یہ بہت جامع تفسیر ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے بھی بیان القرآن دیکھنا شروع کیا اور پھر اپنے بزرگوں کی بہت سی کتابیں بھی دیکھیں۔ یہاں سے ہمارا ذوق اردو کتابوں کی طرف پلٹا۔ جس وقت یہ تفسیر چھپی اسوقت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ حضرت تھانویؒ سے بیعت نہیں ہوئے تھے ان کو ایک بُعد سا تھا۔ انہوں نے کہا کہ کیا جاہلانہ تفسیر ہے یہ تفسیر کہلانے کے قابل نہیں اسکے متعلق اور بہت سے

عیوب بیان کئے گویا یہ ابتدائے زمانہ کی بات تھی اور جب بیعت ہوگئے اس کے بعد کا جملہ یہ تھا کہ اس تفسیر کو دیکھ کر مجھ پر اپنی جہالت واضح ہوگئی کہ ہم کس جہل میں پڑے تھے۔ مگر اس تفسیر نے ہم کو جہالت سے نکالا۔ اس تفسیر کو دیکھ کر ہمیں اپنی جہل کا علم ہوگیا۔ پھر حضرت تھانوی رح کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے کہ ان میں فنا ہوگئے اخیر میں سید سلیمان ندوی رح رحمۃ اللہ علیہ پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں کی شہریت اختیار کر لی تھی۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ اس زمانے میں تین ماہ تک ہمارا بھی وہاں قیام رہا اور سید صاحب کے بعض سفروں میں ساتھ رہنے کا بھی اتفاق ہوا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ وعظوں اور تقریروں میں عموماً فرماتے تھے کہ ہمارے حضرت نے یوں فرمایا۔ ہمارے حضرت نے یوں فرمایا۔ اور حضرت کی باتیں تقریروں میں نقل کیا کرتے تھے۔ بالکل فنا فی الشیخ ہوگئے تھے۔

حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رح کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رح جہاد میں تشریف لے جارہے تھے سیالکوٹ راستے میں پڑا تو ملّا دراز صاحب جو صدرا کے محشّی ہیں وہ زندہ تھے مولانا شہید اپنے گھوڑے کو کھریرہ کر رہے تھے آپ کا لباس سپاہیانہ ہوتا تھا اور تلوار گلے میں لٹکی ہوتی تھی کوئی دیکھ کر نہیں پہچان سکتا تھا کہ یہ عالم ہیں سادے اور سپاہیانہ لباس میں رہتے تھے وہ گھوڑے کو کھریرہ کر رہے تھے کہ ملّا دراز آگئے ملّا دراز کو ناز تھا منطق و فلسفہ پر۔ اور ان لوگوں کو یہ سمجھتے تھے کہ ان کو کوئی مَس ہی نہیں ہے تو ملّا صاحب نے درمیان تقریر میں کچھ اعتراضات کئے مولانا نے کھڑے کھڑے ان کے جوابات دیئے انہوں نے اس پر اعتراض کیا تو مولانا نے اس کا بھی جواب دیدیا۔ دو دو لفظوں میں جواب دیتے۔ اس پر ملّا صاحب

جھنجھلا اُٹھے اور آواز تیز ہوگئی اور بہت زور کا ایک اور اعتراض کیا۔ مولانا نے دو لفظوں میں جواب دیدیا جھنجلاہٹ میں مُلّا دراز کو غصّہ آیا تو مولانا شہیدؒ کو ایک دھول مارا جس سے مولانا کی پگڑی گر گئی مولانا نے بڑی متانت سے فرمایا کہ مولانا میں نے کوئی گستاخی نہیں کی آپ اعتراض کرتے تھے میں جواب دیتا تھا میں اس کا مستحق نہیں تھا۔ یعنی مارا جاؤں۔ ویسے میں آپ کا خادم ہوں آپ کو ہر طرح کا حق ہے۔

اس پر مولانا دراز صاحبؒ موم ہوئے اور معافی چاہی۔ مولانا شہیدؒ نے فرمایا کہ آپ بڑے بزرگ ہیں معافی کی کیا ضرورت ہے۔ پھر مُلّا دراز اتنے معتقد ہوئے کہ منطق و فلسفہ سب بھول گئے۔

مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا دوسرا واقعہ

مولانا حج کے لیے تشریف لے جا رہے تھے کہ جہاز طوفان میں آگیا خیر وہ طوفان تو چلا گیا مگر میٹھا پانی ختم ہوگیا لوگوں میں بڑی پریشانی ہوئی جو لوگ مولوی صورت تھے ان سے دُعائیں کرائی گئیں۔ سب نے مولانا شہید کی طرف اشارہ کیا کہ ان سے دعا کراؤ لوگوں کا وہم تک بھی نہ تھا کہ یہ کوئی بڑے بزرگ ہیں بلکہ معمولی آدمی سمجھتے تھے۔

سب علماء نے کہا کہ سب کچھ یہی ہیں اُنھیں سے دعا کراؤ۔ سارے ملکر مولانا شہیدؒ کے پاس آئے کہ حضرت ایک ہی دن کا پانی رہ گیا ہے اب تو موت کا سامنا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں دعا کروں گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ اگر اللہ تعالیٰ میٹھا پانی دے دے تو بصرہ قریب آرہا ہے وہاں اُتر کر مسقط کا حلوہ فی کس آدھ سیر بانٹنا پڑے گا سب نے تسلیم کرلیا۔

مولانا نے وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھی اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے

سب نے آمین کہی اس کے بعد فرمایا کہ اپنے ڈول اور بالٹیاں سب لے آؤ۔ حکم کے مطابق سب لے آئے تو منظر یہ دیکھا کہ سمندر میں بہت دُور پر ایک گول دائرہ ہے۔ جس کے پانی کا رنگ بالکل جُدا ہے اور وُہ آہستہ آہستہ جہاز کی طرف آرہا ہے جب جہاز کے قریب آگیا تو مولانا شہیدؒ نے فرمایا کہ اپنے اپنے ڈول بالٹیاں اور ٹنکی بھر لو سب نے بھر لی۔ وہ نہایت میٹھا پانی تھا جب بصرہ آیا تو حضرت نے فرمایا کہ وہ وعدہ بھی یاد ہے سب نے کہا کہ ہم کو یاد ہے سب نے حلوہ... تقسیم کیا اور عمدہ قسم کا حلوہ بنا کر تقسیم کرایا۔

مجلس نمبر ۱۳

۱۲ رمضان شریف ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۴ء

اصل عبادت صرف دو ہیں یعنی نماز و حج بقیہ ان کے تابع ہیں

پہلا سوال یہ تھا کہ حدیث شریف میں رمضان کی خصوصیات میں یہ بھی فرمایا گیا ہے اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ نماز اصل العبادات ہے اس کی جزاء میں حور وقصور دینے کا وعدہ کیا گیا ہے مگر روزہ میں خود ذاتِ حق جزا دینے کو فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اصل العبادات سے غیر اصل العبادات کا مرتبہ بڑھا ہوا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔؟

دوسرا سوال:۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ سارے روزہ داروں کو جزا ایک ہی ساتھ دی جائے گی۔ یا آگے پیچھے۔ اگر ایک ہی ساتھ دی جائے گی تو اعتراض یہ ہے کہ قیامت کے دن پہلا سوال نماز کا ہوگا ہزاروں بے نمازی نماز چھوڑنے کی وجہ سے جہنم جائیں گے حالانکہ جزاء ملنے کے بعد دخول جنت ہے پھر دوزخ جانے کا کیا مطلب؟

اور اگر بے نمازی روزہ دار جزا ملنے پر فوراً جنت میں چلے جائیں گے تو ترکِ صلوٰۃ پر وعید کا کیا مطلب ہوگا۔؟

اور اگر بعض روزہ دار کو جزا پہلے دی جائے گی اور بعض کا بعد میں تو اعتراض یہ ہے کہ چند مزدور ایک ہی کام وفاداری کے ساتھ کریں ان میں سے بعض کو تو فوراً مزدوری دیدی جائے اور بعض کو بعد میں۔ بلکہ خوب مرمت اور پٹائی کے بعد یہ ایک کریم اور سخی مالک کی شان کے خلاف ہے پھر ان کی کریمی کی خصوصیت

ہی کیا رہی۔

جواب:۔ حضرت حکیم الاسلام دامت برکاتہم نے فرمایا کہ نماز میں جو چیز خارج تھی وہ دولت تھی تو اس کو کھونے کے لیے زکوٰۃ رکھی گئی۔ اسطرح زکوٰۃ گویا توابع صلوٰۃ میں سے ہے تو زکوٰۃ کے بغیر نماز کا فریضہ مضبوط طریقے سے ادا نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ دولت کو آدمی اپنے سے کھونے کی فکر نہ کرے اور جتنے صدقات ہیں وہ تابع ہیں زکوٰۃ کے خواہ صدقہ فرض ہو یا واجب ہو یا مستحب۔ یہ سب زکوٰۃ کے فرد ہیں۔

اصل چیز نکلی نماز اور نماز کے توابع میں سے زکوٰۃ ہے یا مبادی نماز میں سے ادھر حج اصل ہے اور حج مجموعہ تروک کا نام ہے۔ یعنی ساری مرغوباتِ نفس کا ترک کر دینا۔ تو مرغوبات نفس میں سے اعلیٰ ترین چیز کھانا پینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی کھانے پینے کی خواہش کرتا ہے۔ لباس اور مکان وغیرہ کی خواہش نہیں کرتا۔ بچہ چلاتا ہے جب دودھ مل جاتا ہے تو خاموش ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی خواہش کھانے پینے کی ہوتی ہے۔ اسلیئے حج کے سلسلے میں سب سے پہلے کھانا پینا ترک کراتے ہیں اس لیے اس سے پہلے رمضان کا روزہ فرض کیا گیا۔

تو درحقیقت رمضان حج کے مقدمات میں سے ہے کہ ایک ماہ پہلے عادت ڈالی، جفاکشی کی، اور مرغوبات کو چھوڑنے کی تو گویا ترک طعام رمضان میں ہو گیا اب اس کے بعد دوسرا درجہ گھر کا ہے کہ یہ بھی آدمی کے لیے عیش کا سامان ہے گھر میں رہتا ہے تو فکر نہیں رہتی۔ اس لیے رمضان کے اخیر عشرہ میں اعتکاف رکھ دیا گیا کہ اب تک کھانا اور بیوی کو ترک کیا تھا۔ اب گھر کو بھی چھوڑو تو یہ اخیر عشرہ میں دوسرا ترک ہوا۔ اور اس میں پہلے سے زیادہ الگ تھلگ رہنے

اور ذکر و فکر کی پابندی ہے۔

جب عشرۂ رمضان پورا ہوگیا اور اعتکاف مکمل ہوگیا تو یکم شوال سے عاشورۂ حج شروع ہوگیا۔ مطلب یہ ہے کہ اب اپنا وطن بھی ترک کرو۔ اسلیئے کہ اپنے وطن میں رہ کر آدمی کو غرور اور گھمنڈ ہوتا ہے کہ یہ میرا وطن ہے میرا شہر ہے۔ میرا گھر ہے تو اب گھر گیا۔ بلکہ وطن بھی ترک کرا دیا۔

اسکے بعد دوسرا درجہ ہے تعیش کے سامانوں میں لباس کا۔ اس سے آدمی وقار حاصل کرتا ہے تو میقات پر پہنچ کر اپنا رات دن کا لباس بھی ترک کرا دیا گیا اب وہ لباس نہیں پہن سکتے جو عام طور پر پہنا کرتے تھے۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ عمرہ ادا کیا۔ بیشک آپ نے اپنا شہر چھوڑ دیا۔ لیکن مکہ بھی تو شہر ہے وہاں بھی سامانِ عیش فراہم ہیں ابھی شہری زندگی باقی ہے اس لیے پانچ دن حج کے رکھے گئے کہ اس شہریت کو بھی چھوڑو اور جاؤ عرفات کے میدان میں۔ تو عرفات میں جاکر خیمہ لگا دیا تو اس طرح سرے سے شہر بھی چھوٹ گیا۔ جنگل و ریگستان میں پڑے ہوئے ہیں لیکن بہر حال ابھی تک خیمے موجود تھے اور آسائش کے سامان بھی ہیں تو عرفات سے مزدلفہ رکھ دیا۔ وہاں کا وقوف واجب قرار دیا۔

وہاں جو وقوف واجب قرار دیا وہ حصہ اکثر صبح صادق کے بعد قرار دیا۔ چنانچہ رات ہی سے لوگ سامان میں لگ جاتے ہیں وہاں پر نہ خیمے نہ ڈیرے۔ اس لیئے کہ دس گھنٹے کے لیے کون شہر بسائے تو ریگستان میں تمام آدمی پہاڑوں کے اوپر پڑے ہوئے ہیں۔

اب آگے نفس رہ گیا ہے تو دسویں تاریخ کو فرمایا گیا کہ جان بھی ہمارے راستے میں دو۔ یہ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ خود آدمی کا نفس نہیں لیا۔ بلکہ نفس کے بدلے میں دوسرا نفس بطور فدیہ کے لے لیا۔ لیکن دراصل وہ تمہارا

ہی نفس قربان ہوگیا۔ تو وہاں جاکر آدمی کا نفس بھی چھوٹ گیا۔ تو حج درحقیقت تروک کا مجموعہ ہے اور تروک میں اصل ترک ہے کھانے پینے کا تو اس طرح سوچا جائے تو روزہ حج کے مبادی میں سے ہوگیا اس واسطے اصل عبادت دو نکل آئیں ایک نماز اور ایک حج اور دو عبادت توابع میں داخل ہوگئیں۔ ایک زکوٰۃ اور ایک روزہ زکوٰۃ تابع ہے نماز کے اور روزہ تابع ہے حج کے۔

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک عقلی عبادت ہے اور ایک عشقی عبادت ہے نماز تو اس لیے ہے کہ حق تعالےٰ کے دربار میں ادب کے ساتھ جاؤ معرفت و شعور کے ساتھ بے ادبی نہ ہو۔ گستاخی نہ ہو غافل نہ ہو۔ ہاتھ بھی ادھر سے اُدھر باندھو۔ نگاہ ادھر اُدھر نہ ہو۔ عقل مستحضر رہے اور حج عشقی عبادت ہے وہاں عقل کا کام نہیں وہاں تو جذبات ہیں۔ چنانچہ گھوم رہے ہیں۔ ادھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ محبوب کے گھر کے اِردگرد چکّر لگا رہے ہیں اور در و دیوار کو چُوم رہے ہیں۔ جو عاشقوں کا کام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو چیزیں نماز میں مستحب ہیں وہ حج میں مکروہ ہیں اور جو حج میں مستحب ہیں وہ نماز میں مکروہ ہیں۔ نماز میں تو یہ حکم ہے کہ لباس صاف ستھرا ہو۔ خوش بُو بھی لگاؤ خدا کے دربار میں بن سنور کر جاؤ۔ مگر حج میں حکم یہ ہے کہ عمدہ لباس بھی چھوڑ دو۔ نہ خوشبُو لگاؤ نہ زینت کرو نہ حجامت بنواؤ۔

الحج العج الثج گرد آلود ہونا اور بکھرے ہوئے بال ہونا۔ تو نماز میں جو چیزیں مستحب تھیں وہ حج کے مکروہات اور ممنوعات میں سے آگئیں نماز میں حکم ہے کہ لَا تَاتُوْھَا وَاَنْتُمْ تَسْعَوْنَ۔ یعنی بچّوں کی طرح سے دوڑ کر مت آؤ۔ وَاْتُوْھَا وَاَنْتُمْ تَمْشُوْنَ۔ متانت اور سنجیدگی سے آؤ۔ مگر حج میں یہ متانت ختم کر دی یہاں یہ حکم ہے کہ کہیں دوڑو کہیں بھاگو۔ کہیں سینہ اُبھار کر چلو۔ یہاں بالکل نماز کا برعکس

ہے عشق کے اندر یہ ساری مرغوب چیزیں ترک ہوتی ہیں اگر عاشق زینت کرے تو وہ عشق ہی کیا ہوا یہاں تو فنائیت ہے۔

اگر عاشق اپنے گھر کی فکر کرنے لگے تو محبوب کی طرف کیسے جائے گا۔ یہاں تو والہانہ انداز کی چیزیں ہیں اور نماز میں عاقلانہ اور معرفت کی چیزیں ہیں۔ ادب بھی ہو سنجیدگی بھی ہو۔ فی الجملہ زینت بھی ہو انھیں دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ عقل و معرفت عشق و محبت۔ اگر کسی میں کورا عشق ہی عشق ہو۔ عقل و معرفت نہ ہو تو وہ جاہلانہ عشق ہوگا۔ اگر صرف عقل ہی عقل ہو اور عشق و محبت کا نام نہ ہو تو یہ فلسفہ ہوگا۔ تو دونوں چیزیں جمع ہونی چاہیئے۔ تبھی جاکر انسانیت مکمل ہوگی۔ انھیں دونوں کو اصل قرار دیا گیا ہے۔ ایک میں عقل کا امتحان ہے اور ایک میں عشق کا امتحان ہے اسلیئے یہ دعوٰی کرنا کہ نماز اصل العبادت ہے یہ دعوٰی غلط ہوگا۔ اصلی عبادت چاروں ہی ہیں یا چاروں میں سے دو ہیں اور دو ان دو کی توابع۔ تو جو سوال کیا گیا تھا کہ نماز اصل العبادت ہے وہ سوال غلط ہوگیا۔

البتہ یوں کہو کہ حقیقی معنیٰ میں عبادت نماز ہے۔ اسلیئے کہ عبادت کی حقیقت غائت تذلل ہے۔ یعنی انتہائی ذلت اختیار کرنا۔ یہ صرف نماز میں پائی جاتی ہے۔ زکوٰۃ حقیقی معنیٰ میں عبادت نہیں ہے۔ بلکہ تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن گئی ہے کیونکہ زکوٰۃ میں عطا ہے یعنی فقراء مساکین کو خیرات دینا۔ تو عطا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اسمیں ذلت نہیں ہے اس میں تشبّہ بالخالق ہے اور روزے کے اندر استغنیٰ ہے کھانے پینے سے۔ اور بیوی سے۔ اور یہ شان ہے اللہ تعالیٰ کی۔ کہ وہ بیوی سے بری اور پاک، کھانے پینے سے بری اور پاک ہے تو یہ تشبّہ بالخالق ہوگیا۔ اس میں ذلت کی کیا بات ہے یہ تو عین عزت ہے تو حقیقی عبادت تو نماز ہے مگر دوسری چیزیں تعمیل حکم کی وجہ سے اور نیت سے عبادت بنتی ہے۔ لیکن نماز

کے اذکار اور اس کی ہیئت میں تذلّل ہے۔ ہاتھ باندھ کر نوکروں کی طرح سے کھڑا ہونا رکوع میں گردن جھکانا یہ بھی اظہارِ ذلّت ہے ناک و پیشانی زمین پر رگڑنا یہ بھی اظہارِ تذلّل ہے۔ پھر ہاتھ باندھنا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا، اور بھیک مانگنا یہ انتہائی تذلّل ہے۔ تو نماز کی ساری ہیئتیں تذلّل کی ہیں۔ تو نماز میں جتنے اذکار ہیں خواہ تلاوت ہو۔ یا دعا ہو۔ ان کا حاصل دو ہی ہیں ایک عظمتِ حق تعالیٰ اور ایک ذلّتِ نفس۔ مثلاً کہتے ہیں اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہ ہم آپ ہی کی بندگی کرتے ہیں آپ ہی کے ہم عبادت گذار ہیں۔ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ہم آپ ہی کے محتاج ہیں۔ آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں نماز شروع کرتے ہوئے پڑھتے ہیں سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ یہ عظمتِ خداوندی ہے۔

الحمد للّٰہ رب العٰلمین ساری تعریفیں اللہ ہی کے لیئے ہیں جو سارے عالم کا پالنہار ہے تو حقیقی معنیٰ میں عبادت نماز ہوئی۔ اور بقیہ ارکانِ عبادت نیت سے بنتے ہیں۔ اور تعمیل حکم کی وجہ سے۔ سچ بولنا عبادت ہے مگر اس میں غائت تذلّل نہیں ہے کیونکہ سچ بولنا یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ۔ لیکن صدق عبادت کیوں بنا اسلیے کہ حکم ہے کہ سچ بولو تو تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت کی شان پیدا ہو گئی۔

الحاصل یہ بلفظ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقی معنیٰ میں عبادت نماز ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اصل عبادت صرف نماز ہے۔ اصل تو چاروں ہیں یا دو اصل ہیں اور دو تابع ہیں۔ مگر مجموعی حیثیت سے اصل چاروں ہیں۔ تو یہ سوال جو مرتب کیا گیا تھا۔ اس مقدمے پر اور جب مقدمہ ہی غلط ہو گیا تو سوال بھی غلط ہو گیا۔

رؤیت حق کی ابتداء اور انتہاء

رہا یہ سوال کہ نماز میں صلہ ملتا ہے حُور و قصور کی صورت میں اور روزے پر اللہ میاں مل جاتے ہیں تو میں عرض کرتا ہوں کہ آپ نے جو کہا ہے کہ حُور و قصور ملتے ہیں تو کیا روزے پر حُور و قصور نہیں ملتے اور دیگر طاعات پر نہیں ملتے۔ مجموعہ اعمال پہ جنت مرتب ہوگی۔ جہاں حُور و قصور ہوں گے۔ تو اس سلسلہ میں نماز ہی کی تخصیص کیا رہی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ نماز چونکہ حقیقی عبادت ہے اس پر ثمرہ کیا مرتب ہوتا ہے تو حقیقی معنیٰ میں جو ثمرہ ہے وہ یہ ہے کہ نماز استعداد پیدا کرتی ہے دیدارِ خداوندی کی۔ قیامت میں جو دیدار ہوگا۔ اس کی مشق یہاں سے ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب آدمی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے تو ظاہر میں اس کی نگاہ چٹائی پر ہے۔ لیکن حقیقت میں وجہ اللہ پر ہے۔ اسی واسطے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن تم حق تعالیٰ کو دیکھو گے اور اس کا دیدار ہوگا اور ایسا دیدار ہوگا کہ جیسے چاندنی رات میں چاند کھل رہا ہو اور ہزاروں آدمی اپنے اپنے مقام سے بکھرے ہوں گے۔ مگر کسی کے دیکھنے میں دوسرا حارج نہیں ہوگا سب دیکھ رہے ہوں گے۔ اسی طرح لوگ حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے تو ایک کی زیارت دوسرے کے لیے حارج نہ ہوگی۔ سب اپنے اپنے مقام پر ہیں اور زیارت ہو رہی ہے اس کے بعد میں فرماتے ہیں۔ ان استطعتم الّا تغلبوا علی العصرین یا علی الفجر یہ الفاظ ہیں کہ اگر تم اس کی طاقت رکھتے ہو کہ دو نمازوں پر غالب نہ آؤ بلکہ ان کو اپنے اوپر غالب کر لو یعنی فجر کی نماز اور عصر کی نماز تو فافعلوا تو کرو۔ ان دو نمازوں سے زیادہ استعداد پیدا ہوتی ہے دیدارِ خداوندی کی۔ اسلیئے کہ انھیں دو نمازوں میں آدمی کا عالمِ غیب قریب آجاتا ہے

ملائکہ علیہم السلام جو اعمال لکھتے ہیں دن کے الگ ہیں رات کے الگ ہیں۔
دِن کے فرشتے جو آتے ہیں وہ صبح کی نماز میں آتے ہیں۔ رات والے ان کو چارٹ دیکر چلے جاتے ہیں تو فجر اور عصر کے وقت گویا عالمِ غیب قریب تر آجاتا ہے اور ملائکہ کا ہجوم ہوتا ہے۔ تو عالمِ غیب کے انکشاف کی یہ ابتداء ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غیب الغیب منکشف ہو جائے گا وہ ذاتِ حق ہے یہیں سے رُویت اور مشاہدے کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ اب کوئی مشاہدہ کرتا ہے عقیدے کی آنکھ سے اور کوئی مشاہدہ کرتا ہے فراست کی آنکھ سے اور کوئی مشاہدہ کرتا ہے کشف کی آنکھ سے اور قیامت کے دن ان آنکھوں سے مشاہدہ ہوگا اس مشاہدے کے درجات الگ ہیں

حیدر آباد کے ایک نابینا کا واقعہ

حیدر آباد میں ایک دفعہ میں تقریر کر رہا تھا اور بیان کے ذیل میں اِس آیت کی گفتگو آئی کہ مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا۔ یعنی جو دُنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔
اتّفاق سے ایک اندھے بیٹھے تھے وہ بہت پریشان ہوئے اور کھڑے ہوگئے کہنے لگے کہ جو دنیا میں اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ تو پھر میں کہیں کا... نہ رہا یہاں بھی اندھا وہاں بھی اندھا۔ وہ عین تقریر میں جوش میں کھڑے ہوگئے تو میں نے ان سے کہا کہ بھائی تم اندھے نہیں ہوئے یہاں آنکھ کی گفتگو نہیں یہاں تو عالمِ غیب کے دیکھنے نہ دیکھنے کی بات ہے وہ اندھے کُفّار، مشرکین ہیں کہ نہ وہ دنیا میں آخرت کو دیکھتے ہیں اور نہ وہاں جاکر دیکھیں گے۔
مومن اندھا نہیں ہے تم عالمِ غیب کو عقیدے کی آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔ فراستِ ایمانی اور مشاہدے کی آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔ قیامت کے دن کھلی آنکھوں دیکھ لوگے تو دیدار یہیں سے ہے۔ تم ظاہری آنکھوں پر مت جاؤ

اندھے تو کفار رہیں تب جاکر ان کو تسلی ہوئی۔ تو نماز سے صرف حور و قصور ہی نہیں ملیں گے۔ بلکہ دیدارِ خداوندی میسر آئے گی۔ اور سب سے بڑی دولت یہی ہے۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ دیدارِ خداوندی جب ہوگا تو اس قدر انوار و برکات ہوں گے کہ چہرے روشن تر ہو جائیں گے۔ یوں معلوم ہوگا کہ جنت کی ساری نعمتیں ہیچ نظر آئیں گی۔ تو نماز سے اللہ تعالیٰ ایسے ملیں گے کہ ان کا دیدار بھی ہو جائے گا۔

انا اجزی بہ۔ یعنی میں ہی اس کے بدلے میں مل جاؤں گا۔ یعنی میں ان کا بدلہ ہو جاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری نصرت میری مدد و اعانت بندے کے شاملِ حال ہوگی خدا کے ملنے کا یہ حاصل ہے تو دیدارِ خداوندی اس سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے یہاں تو نصرتِ خداوندی ہے وہاں تو خود ہی بندہ خدا تک پہنچ جائے گا تو یہ نماز ہی پر مرتب ہوگا تو یہ زیادہ اونچی چیز ہے یا وہ زیادہ اونچی چیز ہے وہ نماز پر مرتب ہوگی۔

دوسرا جواب جو ثمرات مرتب ہوں گے وہ سب کے لیے ایک ہی وقت میں ہوں گے جیسا کہ فرمایا گیا کہ صبح کو روزانہ ایک منادی ندا کرتا ہے کہ "یا باغی الخیر اَقبِل یا باغی الشرّ اَقصِر وللہ عتقاء من النّار۔ یعنی اے خیر کے ڈھونڈنے والے جلدی کرو اور اے شر سے بچنے والے جلدی کرو۔ پھر وقت نہیں ملے گا اللہ کے بہت سے بندے ہیں جن کو جہنم سے آزاد کیا جا رہا ہے۔ تو رمضان میں آزاد کرنے کی بناء یہ ہے کہ قرآن شریف نازل ہوا رمضان میں اسلیئے رمضان کو مناسبت ہے کلامِ خداوندی سے۔ تو جیسے بادشاہوں کے ہاں سالگرہ منائی جاتی ہے تو یہ قرآن شریف کی سالگرہ ہے آج اس کے نزول پر اتنے برس گذر گئے۔ اتنی صدیاں گذر گئیں تو یہ وہ مہینہ ہے جسمیں قرآن اُترا ہے تو یہ قرآن

کریم کے نزول کا سال گرہ ہے۔ جب جشن ہوتے ہیں تو اس وقت خوشی میں جیل سے قیدی آزاد کیئے جاتے ہیں اور انعامات بانٹے جاتے ہیں اور دربار ہوتے ہیں۔ تو جب یہ مہینہ قرآن کا سالگرہ اور جشن کا وقت ٹھہرا تو بلاشبہ بہت سے بندے اسی خوشی میں جہنم سے آزاد کئے جائیں گے۔

تو ظاہر ہے کہ عتقاء من النار وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے روزے رکھے تھے اس لیے فرمایا گیا ہے کہ عذاب خداوندی سے ان کو چھٹکارا دیدیا جاتا ہے تو یہ سب کے لیئے ہے اس میں آگے پیچھے نہیں ہے۔ اور جو روزے آگے پیچھے رکھے تو جزا بھی آگے پیچھے ہے۔ لیکن گناہ کا جو وبال ہے وہ اپنی جگہ پر ہے۔ اور روزہ رکھنے کا جو ثواب ہے وہ اپنی جگہ پر ہے۔ تو اچھے کام پر اچھی جزا ملے گی اور بُرے کام پر بُری جزا ملے گی۔ اس میں آگے پیچھے کا کیا سوال۔

اگر ایک شخص نماز نہیں پڑھ رہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ روزے کا اجر نہیں ملے گا۔ البتہ وہ ناقص ہو جائے گا کیونکہ اس کے ساتھ ایک گناہ شامل ہو گیا۔ اس کے اندر بعضوں کا کامل اجر ملے گا کیونکہ انھوں نے روزے کے ساتھ نمازیں بھی پڑھی ہیں اور بعضوں کو ناقص اجر ملے گا۔ کیونکہ انھوں نے نمازیں ترک کی تھیں۔ اس میں گناہ سر رہا لیکن چونکہ عمل ایک ہی وقت میں ہے اسلیئے جزا بھی ایک ہی وقت میں ملے گی۔ البتہ کسی کو ناقص ملے گی اور کسی کو کامل ملے گی تو ہر عمل اپنی تاثیر دکھلائے گا۔ نماز اپنی تاثیر دکھلائے گی۔ اور روزہ اپنی تاثیر دکھلائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے تاثیر پہ پابندی عائد نہیں کی ہے۔

ایک مثال سے مسئلے کی وضاحت جیسے کسی کو زکام ہو جائے اور حکیم صاحب کہیں کہ یہ نسخہ استعمال کرو اور پرہیز یہ کرو کہ دہی مت کھانا چاول مت کھانا۔ ورنہ نزلہ بڑھ جائے گا۔ مگر مریض یہ بھی

کھا رہا ہے اور دوا بھی کھا رہا ہے تو دوا بھی اپنا اثر دکھلائے گی اور چاول وغیرہ بھی اپنا اثر دکھلائیں گے تو پلاؤ یا چاول نزلہ بڑھائیں گے۔ اور گل بنفشہ نزلہ دفع کریگا۔ تو دونوں میں لڑائی ہوگی تو نقص پیدا ہو جائے گا اور زکام دیر میں جائے گا لیکن اثر دونوں نے دکھلایا۔ کوئی چیز بے اثر نہیں رہی۔ اگر گل بنفشہ اور ملٹھی کے استعمال میں پلاؤ اور شیرینی کا کوئی اثر نہ ہوتا تو حکیم نہ روکتا۔ بلکہ کہتا خوب پلاؤ اور شیرینی کھاؤ۔ لیکن روکتا کیوں ہے اسلئے کہ وہ اپنا اثر دکھلائیگا اور یہ اثر اپنا دکھلائے گا تو متضاد اثرات جمع ہوکر نقص پیدا کر دیں گے۔ صحت دیر میں حاصل ہوگی یہی گناہ اور طاعت کا قصہ ہے کہ طاعت اپنا اثر دکھلائیگا۔ اور گناہ اپنا اثر دکھلائے گا۔ مگر جب دو متضاد چیزیں جمع ہوگئیں تو طاعت کا اثر پھیکا پڑ جائے گا کیونکہ عمل میں نقص پیدا ہوگیا۔

دوسری مثال یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے نماز جمعہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ بعض لوگ وہ ہیں جو پورا جمعہ لے کر واپس ہوتے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو آدھا جمعہ لے کر واپس ہوتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو پون جمعہ لے کر واپس ہوتے ہیں۔ بعض خالی ہاتھ چلے آتے ہیں۔ تو اس کا معیار یہ فرمایا گیا کہ اگر کسی شخص نے غسل کیا اور خوشبو لگاکر صفِ اولیٰ میں بیٹھ گیا تو اس کے لیے جو اجر ہوگا وہ اجر اس کو نہیں ملے گا۔ جو دیر سے پہنچا ہے۔

ایک وہ ہے جو کہ خطبہ میں شریک ہوا اور ایک وہ ہے کہ خطبہ میں بھی شریک نہیں ہوا۔ فقط فرض ادا کرلیا۔ تو ظاہر ہے اس کا وہ اجر نہیں ہوگا جس نے غسل بھی کیا۔ اور خوشبو بھی لگائی۔ اور صفِ اولیٰ میں بھی بیٹھا رہا تو ثواب تو سب کو ملے گا کیونکہ جماعت ایک ساتھ ہے مگر کسی کو پورا کسی کو آدھا اور کسی کو پاؤ اور کوئی خالی ہاتھ چلا آئے گا۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ ؕ

ایک اور سوال حدیث میں جو فرمایا گیا ہے اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کے بدلے مل جاؤں گا۔ تو یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غیر متناہی ہے تو وہ شخص جو روزہ تو رکھتا ہے مگر نماز نہیں پڑھتا پھر بھی اس کی جزاء غیر متناہی ہوگی اور نماز کی جزا متناہی ہے اس سے روزہ دار کا افضل ہونا معلوم ہوتا ہے۔ نمازی سے۔

حکیم الاسلام نے فرمایا کہ فعل کے لیے غیر متناہی ہونا ضروری نہیں وہ تو ذات وصفات غیر متناہی ہیں افعال تو غیر متناہی نہیں۔ عدد کے لحاظ سے غیر متناہی ہوں لیکن جس شخص کے لیے جو فعل ہوگا وہ تو محدود ہے تخلیق ہوئی تو ایک ہی ہوئی دوسرے کے لیے دوسری تخلیق۔ تیسرے کے لیے تیسری تخلیق تو مجموعہ عدد کا تو ہوگا لا محدود۔ اور لا محدود بھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ مخلوقات محدود ہیں خواہ اربوں کھربوں ہوں مگر محدود ہیں تو افعال بھی محدود واقع ہوں گے وہ جو لاتحدیدی ہے وہ ذات وصفات میں ہے افعال میں نہیں لہٰذا کوئی اشکال نہیں رہا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ جس بندے کو پسند فرماتا ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اعلان کرواتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں لہٰذا تم بھی محبت کرو اس طریقے سے یہ بات رفتہ رفتہ زمین تک پہنچتی ہے اور دنیا والے اس بندے سے محبت کرتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس بندے کو برا بھلا بھی کہتے ہیں عوام کیا بعض خواص بھی اس میں شامل معلوم ہوتے ہیں حالانکہ سب کو عزت اور احترام کرنا چاہیئے اس کی وجہ کیا ہے۔

حکیم الاسلام نے فرمایا کہ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام سے کہتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی محبت کرو تو وہ اعلان کرتے ہیں ملائکہ میں فلاں شخص سے میں نے محبت کی تم بھی محبت کر لو تو ملائکہ محبت کرتے ہیں۔ پھر ملائکہ علوی سے وہ محبت منتقل ہوتی ہے ملائکہ سفلی میں جو زمین پر ہیں وہ محبت کرتے ہیں اور ان سے محبت منتقل ہو کر لوگوں کے اندر آتی ہے پھر اسکی مقبولیت دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ بہت سے بُرا بھلا بھی کہتے ہیں۔ تو جو بُرا بھلا کہتے ہیں ان کے دلوں میں بھی عزت ہوتی ہے وہ حسد کی وجہ سے بُرا بھلا کہتے ہیں اور یہاں پہ گفتگو قلوب کی ہے زبان کی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ابوجہل کی نظر میں

جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتے تھے ان کے دلوں میں بھی حضورؐ کی عظمت تھی۔ سب سے بڑا دشمن جو ہے وہ ابوجہل ہے۔ اس کو فرعونِ امت کہا گیا ہے۔ انتہائی عداوت انتہائی بغض وعناد دین سے بھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی غالباً ولید ابن مغیرہ یا عتبہ ابن ولید نے سوال کیا کہ کیا واقعی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا جانتا ہے اس نے کہا کہ حاشا وکلاّ ان سے زیادہ سچا کوئی بھی نہیں تو کہا کہ پھر مانتا کیوں نہیں تو اس نے کہا کہ ہماری ریاست جاتی رہے گی قوم دشمن ہو جائے گی۔ اس وجہ سے ہم نہیں مانتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دل میں بھی آپ کی عزت اور عظمت تھی مگر اقتدار کی وجہ سے ظاہر نہیں کرتا تھا۔ تو جو زبان سے بُرا بھلا کہتے تھے دلوں میں وہ بھی اچھا جانتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کس کو بُرا بھلا کہا گیا ہے

آپ کو ساحر کہا گیا۔ مجنون اور دیوانہ کہا گیا۔ اور ساحرٌ کذاب کہا گیا لیکن دل میں وہ
بھی جانتے تھے کہ بڑھنے والے یہی ہیں۔ ہم گھٹیں گے تو عزت کا تعلق قلوب
سے ہے۔ زبان سے نہیں۔ جنگیں ہوئیں۔ یہود نصاریٰ اور بڑے بڑے قتل
وقتال ہوئے لیکن خود وہ یہود و نصاریٰ جو مسلمانوں کو قتل کرنے والے ہیں
ان کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر کہتے تھے کہ مسلمان
بہت سچے معلوم ہوتے ہیں ان کے معاملات سچے جس کو عہد دیتے ہیں اس کو
کو پورا کرتے ہیں۔ جس کو قول دیتے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں زیادتی نہیں کرتے
عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہیں ڈالتے جنگ ہو رہی ہے مگر عبّاد اور راہبوں
پر ہاتھ نہیں ڈالتے یہ نہایت سچی قوم ہے تو بھائی جب مسلمان سچی قوم ہے
تو صلح کر لو مگر یہاں عزت نفس آڑے بن جاتی ہے کہ کیسے صلح کریں۔
عرض یہ کرنا ہے کہ ان کے دلوں میں بھی مسلمانوں کی عزت تھی لیکن عناد
کی وجہ سے دوسرا معاملہ کرتے تھے سمجھ میں نہیں آتا۔ حدیث میں جہاں عام
مقبولیت کے الفاظ آتے ہیں۔ وہاں اکثریت مراد ہوتی ہے کلیتہً نہیں
ہوتی کیونکہ لاکھوں آدمی ایسے ہیں کہ ان کو پتہ ہی نہیں تو جہاں کہیں ایسا آیا
ہے کہ زمین میں محبت پھیل جاتی ہے تو اس سے اکثریت مراد ہوتی ہے
اور ان لوگوں میں جن میں شعور ہے اور جو کندۂ ناتراش ہیں جن کو کہیں
کا پتہ نہیں وہ اس سے خارج ہیں۔ لہٰذا پہلے محل متعین کر لیا جائے کہ
یہ اقوال سے متعلق ہے یا قلوب سے متعلق ہے یا ارواح سے لہٰذا جب
محل متعین ہو جائے گا تو سوال خود ہی ختم ہو جائے گا محل کے متعین نہ ہونے
سے ادھر ادھر کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

مجلس نمبر۱۴

۲۲ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء ★

دین کے بارے میں آدمی کے چار دشمن ہیں جو دین پر قائم نہیں رہنے دیتے (۱) خود اپنا نفس۔ (۲) شیطان (۳) کفار و مشرکین (۴) منافقین۔

سوال:۔ رمضان شریف کا مہینہ ختم ہو رہا ہے حضور والا سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس ماہ میں فیوض و برکات کی جو کثرت نظر آتی ہے کیا یہ صرف اس مہینے کی خصوصیت کا نتیجہ ہے یا اس میں ہمارے گناہوں کی قلت اور عبادت کی کثرت کو بھی کچھ دخل ہے اگر دیگر ایام میں بھی ہماری یہی حالت رہے جو اس مبارک مہینہ میں ہوتی ہے یعنی ترکِ معصیت اور کثرتِ عبادت تو کیا یہ فیوض و برکات ان دنوں میں بھی جاری رہیں گے؟ دوسری بات یہ ہے کہ رمضان شریف کے اثرات عوام سے تقریباً عید ہی کے دن سے ختم ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور خواص سے چند دن بعد آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان اثرات کو باقی رکھنے کی کیا تدابیر کرنی چاہیئے۔

حضرت حکیم الاسلام دامت برکاتہم العالیہ نے فرمایا کہ اصل میں دونوں چیزیں ہیں یعنی رمضان کی خصوصیت اور گناہوں کی قلت اور عبادت کی کثرت کیونکہ شیطان جن راستوں سے آتا ہے۔ اس کے مداخل متعین ہیں سب سے بڑا حملہ شیطان کی طرف سے دو راستوں ہوتا ہے ایک شہوتِ بطن اور ایک شہوتِ فرج (شرمگاہ) شہوتِ بطن سے تو آدمی مرغوباتِ نفس کو بٹورتا ہے جیسے کھانا پینا۔ اور شہوت فرج جیسے التذاذ بالنساء یعنی عورتوں سے لذت

حاصل کرنا اور اسمیں تعدی اور زیادتی بھی ہوتی ہے مثلاً کھانے پینے کی چیزوں میں اسراف کرنا حلال اور حرام کا فرق نہیں کرتا۔ تو یہاں شیطان کا دخل ہوتا ہے وہ اچھی چیز کو بُرا بنا دیتا ہے اور بُری کو اچھا بنا کر پیش کرتا ہے۔ خطراتِ نفس اور وساوس میں مبتلا رکھتا ہے وہ ان شہوات کو ایسا مزین بنا کر پیش کرتا ہے کہ آدمی آسانی سے اس میں مبتلا ہو جاتا ہے خواہ شہوت بطن ہو یا شہوت فرج۔ اس میں اس کے طریقے مختلف ہیں۔

علماء سے یوں نہیں کہے گا کہ تم نماز چھوڑ دو اور تلاوت کرنا چھوڑ دو کیونکہ اسکو وہ مانتے نہیں بلکہ جس شخص کی عادت تلاوت کرنی کی ہے اس سے یوں کہے گا کہ بلا سوچے سمجھے صرف الفاظ رٹنے سے کیا فائدہ۔ سوچ سمجھ کر پڑھنا چاہیئے اب وہ مثلاً پانچ پاروں کی تلاوت کرتا تھا سوچنا شروع کر دیا تو تین پارے کی کرنے لگا۔ پھر اس میں مزید غور کیا تو تین کی بجائے صرف دو رہ گئے۔ تو شیطان اسی کو غنیمت سمجھتا ہے کہ پانچ پارے چھوڑ کر دو پر آگیا۔ اور اس نے بات ڈالی دین کے پیرائے میں کہ صرف الفاظ رٹنے سے کیا فائدہ۔ بلکہ سوچ سمجھ کر پڑھنا چاہیئے۔ اور آیات کے مدلولات و معانی اور اس کے حکم و مصالح یہ سب ذہن میں ہوں لہٰذا جب اِدھر متوجہ ہو گا تو تلاوت کی اور کمی ہو جائے گی تو عالِم کو علمی طور پر وسوسہ میں ڈالے گا۔ اور اسی راستہ سے اس کو گمراہ کرنے کی سعی کرے گا۔ اور اتنے سے ہی شیطان کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

بنی اسرائیل کے ایک عابد زاہد کا عبرتناک واقعہ

بنی اسرائیل میں ایک بڑا عابد اور زاہد تھا وہ اپنے دین میں مخلص تھا اس کے لوگ معتقد تھے اس کے دین و دیانت پر سب کو اعتماد تھا کوئی پانی پڑھوا رہا ہے کوئی دُعائیں کروا رہا ہے لوگوں کا ہجوم

رہتا تھا۔ اس زمانے میں دو بھائی تھے ان کو سفر درپیش آیا اور ان کی ایک نوجوان بہن تھی اب ان کو یہ سوچ ہوئی کہ ہم سفر میں جارہے ہیں اور کئی برس کا سفر ہے پتہ نہیں کب واپسی ہو۔ بہن کو کس کے پاس چھوڑیں جوان لڑکی ہے اگر عزیزوں کو دے دیں تو ممکن ہے ابتلاء پیش آجائے اخیر میں ان کی رائے یہ ہوئی کہ اس عابد زاہد کے پاس چھوڑ دیں اس کے دین و دیانت پر سبھوں کو اعتماد ہے چنانچہ دونوں بھائی آئے اور عابد سے درخواست کی کہ ہم کو ایک ضروری سفر درپیش ہے اور بہن جوان ہے ہم کسی کے پاس چھوڑ نہیں سکتے۔ آپ کی دیانت پر ہم کو البتہ اعتماد ہے۔

عابد نے کہا کہ نہیں نہیں ہم کو نہیں چاہیئے دونوں بھائی اصرار کر رہے ہیں مگر انھوں نے کہا کہ میں قطعاً تیار نہیں ہوں لیکن جب کئی دن آئے اور بہت... اصرار کیا یہاں تک کہ مجبور کر دیا۔ اس نے کہا کہ میری خانقاہ کے کونے پر ایک حجرہ ہے اس میں چھوڑ دو۔ پھر وہ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس عابد نے یہ کیا کہ کھانا وغیرہ اس کو بھجوا دیتا خود نہیں جاتا تھا۔ پھر عابد خود جاکر اس کی دہلیز پر کھانا رکھ دیتا اور چلا آتا۔

دوسرے دن لڑکی برتن باہر رکھ دیتی یہ اُٹھا لاتے اور رات دن کھانا پہنچانے کا یہی طریقہ ہوتا۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا تھا عابد کا کام صرف یہ تھا کہ وہ کھانا پہنچا دیتا اور برتن اُٹھا لاتا۔ پھر شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ بہرحال اس کی ایک مہمان کی حیثیت ہے اس طرح اچھوت اقوام کی طرح رہنا کہ دُور سے کھانا دیدیا اور برتن لے لیا یہ احترام کے خلاف ہے کم سے کم اس کے پاس تو جاکر کھانا رکھنا چاہیئے اسواسطے کہ وہ بھائیوں سے وہ الگ ہوگئی اور ایک کوٹھری کے اندر تنہا بند ہے

اتنی اجنبیت کا برتاؤ کہ کوئی موانست ظاہر نہ ہو تو اس سے وحشت پیدا ہوگی. یہ شیطان نے وسوسہ ڈالا۔

اب اس عابد نے یہ کیا کہ خود اندر کمرہ میں جاکر کھانا دیتا اور برتن لے کر چلا آتا۔ اور مقصد صرف اتنا تھا کہ موانست ہو اسے وحشت نہ ہو وہ یہ نہ سمجھے کہ مجھ کو اچھوت سمجھ رکھا ہے۔ چند دن یہ سلسلہ چلا اسکے بعد شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ اب بھی تو اچھوت اقوام کی طرح ہے کہ دُور سے کھانا رکھدیا اور چلا آیا دو ایک بات بھی ہونی چاہیئے تاکہ اسکے دل میں گنجائش پیدا ہو اور وہ جو توحش میں ہے کہ کوئی اپنا میرا نہیں ہے کس سے بولوں کس سے بات کروں وہ ختم ہو جائے لہٰذا دو چار بھی تو کر لینا چاہیئے۔

اب عابد صاحب وہاں بیٹھ کر دو چار کلمات موانست کے کہدیتے اور برتن لے کر چلے آتے۔ اس سے کچھ اختلاط بڑھا تو قدرتی طور پر ایک میلان اور رغبت پیدا ہوئی۔ اب وہ دو منٹ کے بجائے دس منٹ بیٹھنے لگا اس میں کچھ بے تکلفی کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ محبت بڑھ گئی تو محبت کے بڑھنے سے میلان شروع ہوا۔ تو پھر شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ دو چار باتیں کرنے سے موانست پیدا نہ ہوگی۔ بلکہ کم سے کم دو چار گھنٹے بیٹھنا چاہیئے۔ تاکہ توحش ختم ہو جائے اور موانست پیدا ہو جائے۔ اب وہ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ اس میں کچھ بے تکلفی کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ ادھر اُدھر کے قصّے وغیرہ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلق بڑھتا رہا۔ یہ جو حدیث میں حکم ہے کہ اجنبیہ کے ساتھ خلوت جائز نہیں ہے اس کی یہی مصلحت ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی ہوتا ہے۔ ممکن ہے بڑھتے بڑھتے بے تکلفی ہو جائے اور پھر بُرائی کا خیال پیدا ہو جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ عابد بُرائی میں مبتلا ہو گیا۔ اب یہ فکر پیدا ہوئی کہ یہ دوسروں سے کہے گی اور جب دوسروں سے کہے گی تو میرا وقار اور وہ جو تقدس بنا ہوا ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جب بات کھلے گی تو لوگوں کا جو رجوع ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ تو اس کی سمجھ میں یہ تدبیر آئی کہ اسکو قتل کر کے کہیں دفن کر دو تاکہ بات چھپی رہ جائے۔

چنانچہ اُسے قتل کر دیا اور خانقاہ کے باہر ایک گڑھے میں لے جا کر دفن کر دیا۔ اس دوران میں مُدّت پوری ہو گئی اور اس کے بھائی آگئے وہ بڑے شوق میں آئے کہ بہن کو لے کر آئیں گے عابد سے پوچھا تو اسنے کہا کہ اس کا انتقال ہو گیا اور قبر بتلادی کہ یہ قبر ہے بات کھلی ہوئی نہیں تھی اسلئے ان... بھائیوں کو بے حد صدمہ ہوا۔

اب شیطان نے ان کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ تم قبر کو جا کر اچھی طرح دیکھ تو لو وہ قبر کوئی ضابطے کی تو بنی تھی نہیں اس پر کچھ مکھیاں بیٹھی ہوئی نظر آئیں تو ان بھائیوں کے دل میں آیا کہ قبر پر مکھیاں نہیں بیٹھتی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ لاش کچھ قریب ہی ہے پھر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تم کھود کر تو دیکھو وہ قبر میں ہے یا ویسے ہی پڑی ہوئی ہے جب کھودا تو لاش نکلی اور وہ مقتول کی تھی۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے تھے اب متعین ہو گیا کہ اس نے قتل کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے پورش کی اور شور مچایا اور لوگوں سے کہا کہ ہم نے اپنی بہن کو عابد کے پاس چھوڑ رکھا تھا اس نے قتل کر دیا ہے اور یہ لاش ہے اور اس کے ٹکڑے ہیں اور مجھ سے کہا کہ کسی مرض میں انتقال ہو گیا۔ حالانکہ یہ مقتولہ ہے۔

غرض وہ بات کھل گئی بہت سے لوگ اس عابد پر جمع ہوئے اور کہا

کہ سچ بتلاؤ بات کیا ہے تو چور کے دل میں چور ہی ہوتا ہے وہ چھپا نہ سکا اور پورا واقعہ بتلا دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس عابد کے پیر میں رسّی باندھ کر سارے شہر میں گھمایا گیا سب تھو تھو کرتے رہے پھر لوگوں نے اس کی خانقاہ کو اکھاڑا اتنا غیض وغضب کا اظہار کیا کہ اس کے آثار بھی مٹا دیے اور اس کی ایک عام شہرت ہو گئی اور پھر اُسے پھانسی دی گئی تو وہ جو تقدس بنا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔ تو شیطان نے عابد سے یہ نہیں کہا کہ تو بدکاری کر۔ بلکہ ایسے اسباب پیدا کر دیے کہ جس سے بدکاری ہو جائے اگر عابد کے دل میں یہ بات ڈالتا کہ کہ تو زناکاری میں مبتلا ہو جا تو وہ مان نہیں سکتا تھا۔ بلکہ دینی پیرایہ میں یہ کہا کہ موانست پیدا ہو گی۔ توحش رفع ہوگا۔ یہ احترام کے خلاف ہے۔ رفتہ رفتہ لاکر اس نتیجہ پر پہنچا دیا۔

اِنَّ الشَّیْطَانَ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا۔ یعنی شیطان دشمن ہے اس کو دشمن ہی سمجھو وہ نہ انسان کا دین دیکھ سکتا ہے اور نہ اس کی عزّت اور وقار دیکھ سکتا ہے تو شیطان کے راستے مختلف ہیں۔ کبھی وہ شہوتِ بطن کے ذریعہ سے آتا ہے تاکہ کھانے پینے میں حرام وحلال کا امتیاز نہ رہے اور حرص بڑھ جائے اور جب حرص بڑھ جاتا ہے تو آدمی جائز اور ناجائز کی پرواہ نہیں کرتا۔ اور یا پھر شہوتِ فرج کے ذریعہ آتا ہے کیونکہ آدمی اس میں مغلوب ہو جاتا ہے۔ اور ایسا طریقہ ڈالتا ہے کہ وہ اس پر مجبور ہوتا ہے۔ دفعتاً یوں نہیں کہے گا کہ تو فلاں سے بدکاری کر۔ بلکہ دینی پیرایہ میں ایسے اسباب پیدا کرے گا کہ آدمی اسی نتیجے پر خود بخود پہنچ جائے۔ تو یہ دو چیزیں شہوتِ بطن اور شہوتِ فرج تباہ کن ہیں۔

اور رمضان شریف میں ان دونوں پر پابندی عائد ہو جاتی ہے اِدھر تو

کھانا پینا بند ہوگیا تو نفس کے اندر وہ جو ثوران اور ہیجان تھا۔ اس میں کمی ہوگئی اسلئے کہ یہ ساری بدعملیاں پیٹ بھرنے کے نتیجے ہیں۔ جب آدمی کا پیٹ ہی نہیں بھرے گا اور قوت کمزور ہو جائے گی تو یہ ہیجان کہاں سے ابھریں گے تو ادھر ان دونوں قوتوں کو کمزور کر دیا۔ شہوتِ بطن پر ایک وقت کا کھانا پینا بند کیا اور شہوت فرج کا جو جائز طریقہ تھا دن میں اسے بھی روک دیا تو ناجائز تک آدمی کیا پہنچے۔

یہی دو راستے تھے ان دونوں پر پہرہ بٹھا دیا۔ اس سے آدمی کے قلب کے اندر ایک تزکیہ پیدا ہوگیا اور اس سے نورانیت پیدا ہوئی یہ سب رمضان کی برکت ہے۔

دین کے بارے میں آدمی کے چار دشمن ہیں

سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ دین کے بارے میں آدمی کے چار دشمن ہیں جو دین پر قائم نہیں رہنے دیتے۔ سب سے پہلے تو دشمن تو انسان کا نفس ہے جو اندر موجود ہے اور وہ بالطبع جاہل ہے اور وہ محل ہے جذبات اور خواہشات کا۔ اسلئے خواہشاتِ نفس اور ہوائے نفس میں مبتلا ہو کر آدمی دین کو چھوڑ دیتا ہے اس کے بارے میں حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ اَعْدَاءَ عَدُوِّكَ الَّذِیْ بَیْنَ جنبیكَ یعنی سب سے بڑا تمہارا دشمن وہ ہے جو تمہارے پہلوؤں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے یعنی تمہارا نفس۔

مثل مشہور ہے کہ "آدمی کا آپا بُرا" یعنی آدمی خود اپنا دشمن ہے تو انھیں خواہشات میں مبتلا ہو کر آدمی دین سے الگ اور بیزار ہوتا ہے تو یہ دشمن اندرونی دشمن ہے۔

اور بیرونی دشمن شیطان ہے جس کے بارے میں ایک جگہ فرمایا گیا

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ

یعنی شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو۔ اس سے دوستی مت کرو یعنی سانپ بچھو سے تو دوستی ہو سکتی ہے مگر شیطان سے نہیں ہو سکتی۔ اسلئے کہ زیادہ

سے زیادہ کاٹ کھائیں گے مگر شیطان انسان کی جان اور اس کی عزت اور آبرو کا دشمن ہے اور اس کے مال کا بھی دشمن ہے وہ ہمیشہ ایسی ہی چیزیں پیدا کرتا ہے کہ جس سے آدمی ذلیل ہو جائے تیسرے دشمن کفار ہیں جو دین کے بارے میں شکوک اور طرح طرح کے وساوس واعتراضات پیدا کرتے ہیں۔ جب آدمی کے اندر علم کم ہوتا ہے تو وہ ان اعتراضات وشکوک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور معاذ اللہ وہ دین میں کچھ خرابی محسوس کرنے لگتا ہے۔

اور چوتھے دشمن منافقین ہیں کہ نام تو اسلام کا لیتے ہیں اور پھر اسلام کی تخریب کرتے ہیں اسی لیے ان کو اعداء اللہ کہا گیا ہے تو جب یہ اللہ کے دشمن تو دین کے بھی دشمن ہیں۔ اور جب دین کے دشمن ہیں تو دینداروں کے بھی دشمن ہیں اسلیئے وہ دینداروں کو نہیں چاہتے کہ وہ کسی طرح سے اپنے دین پر قائم رہیں تو ان میں حسد اور عناد وبغض ہے۔ اس لیے وہ نہیں چاہیے کہ مسلمانوں کو کوئی وقار یا اقتدار نصیب ہوا ور دین ان کا باقی رہے وہ رات دن اس کی تخریب کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

ان چار دشمنوں کے آلۂ کار

انسان کے چار دشمن ہیں اور ہر دشمن کے آلۂ کار بھی ہیں۔ ایک دشمن نفس ہے اس کا آلۂ کار ہوائے نفس ہے۔ یعنی وہ خواہشات جن سے وہ برائی میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسرا دشمن شیطان ہے اس کا آلۂ کار تصویر اور تزئین ہے اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ہ کہ برائیوں کو ایسا خوشنما اور لذیذ بنا کر پیش کرتا ہے کہ آدمی خوامخواہ اس میں مبتلا ہو جائے اگر کبھی توبہ کی طرف توجہ ہوئی اور آدمی نے چاہا کہ توبہ کرے تو شیطان وسوسہ ڈالتا ہے کہ ابھی توبہ کرنے کا وقت آیا نہیں ہے بعد میں دیکھی جائے گی کیا ضروری ہے کہ

آج ہی توبہ ہو۔ آج نکل گیا کل آیا تو پھر وسوسہ ڈالا کہ ابھی تو موت کے آثار معلوم نہیں ہوتے ہیں ابھی تو نوجوانی ہے رنگ رلیاں منانے کے دن ہیں جب موت کے آثار ظاہر ہوں گے تو توبہ کریں گے۔

اسی طرح آجکل کے وعدہ میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ توبہ نصیب نہیں ہوتی اور موت آجاتی ہے۔ اور کفار کا آلۂ کار ہے تشکیک یعنی دلوں کے اندر شکوک وشبہات پیدا کردینا اور اصل دین سے بدظن بنا دینا۔ اور ایسی چیزیں لاکر پیش کرنا کہ جو عوام کے سمجھنے کی نہیں ہیں تو ان توہمات میں مبتلا کردینا۔ معاذ اللہ دین میں خرابی ہے اور منافقین جو اسلام کا نام لے کر تحریف کرتے ہیں ان کا آلۂ کار ہے۔ تلبیس ایسی لطیف اور جاہلانہ تاویلات کہ جس سے جاہل بدعقیدگی میں مبتلا ہو جائے تو منافقین کا آلۂ کار تلبیس ہے یعنی باطل کو حق کی صورت میں پیش کرنا۔ لہٰذا جن لوگوں میں معرفت کی کمی ہوتی ہے وہ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو یہ چار دشمن ہیں جو دین پر قائم رہنے نہیں دینا چاہتے۔

تو ماہ رمضان المبارک میں ان چاروں پر پابندی عائد ہو جاتی ہے نفس کی خواہشات تو اسی وقت ظاہر ہوں گی۔ جب کہ پیٹ بھرا ہوا ہو۔ اسی واسطے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اگر آدمی نوجوان ہو اور پاس میں کچھ نہ ہو یعنی نکاح نہ کر سکتا ہو اور اندیشہ ہو کہ بدکاری میں مبتلا ہو جائے گا تو روزے رکھے کیونکہ روزے رکھنے سے وہ جو قوت شہوانی کا ہیجان ہوتا ہے وہ گھٹ جاتا ہے یا تو اعتدال پیدا ہو جاتا ہے یا قوت شہوانی مضمحل ہو جاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں بدی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

اب شیطان رہ گیا جو بیرونی دشمن ہے اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ صُفِّدَتِ الشَّیَاطِیْنُ یعنی رمضان میں شیاطین بند کر دیئے جاتے ہیں یعنی ان کو

چھوٹ نہیں رہتی کہ جس طرح چاہیں تشویش پیدا کریں۔ اسواسطے کہ شیطان جو اثر ڈالتا ہے وہ انسان کے جذبات کو آلۂ کار بناتا ہے اور جب جذبات ہی مضمحل ہوگئے تو وہ لاکھ وسوسہ ڈالے وہ جذبہ اُبھرے ہی گا نہیں۔ اور جب آدمی بھوکا پیاسا ہے تو مجلس آرائی کہاں سے ہوگی۔ اور منافقین سے بھی سابقہ کم پڑے گا تو اس کا بھی راستہ بند ہوا تو رمضان آکر چاروں دشمنوں کو مغلوب کر دیتا ہے اور جب یہ مغلوب ہوگئے تو نفس کمزور ہوگیا اور نفس جتنا کمزور ہوگا روح میں اتنی ہی قوت پیدا ہوگی۔ جب نفس کی خواہشات میں کمزوری آتی ہے تو آدمی روحانیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور عبادت اور طاعت کرتا ہے۔

جیسا مثل مشہور ہے کہ رمضان کے نمازی مشہور ہیں۔ سال بھر نماز نہیں پڑھیں گے مگر رمضان میں چار ٹکرے ضرور مارلیں گے۔ اس واسطے کہ اُدھر سے تو راستے بند ہوگئے تو ادھر ہی کی سوجھتی ہے تو نفس جتنا ہی مضمحل ہوگا روح میں اتنی ہی قوت پیدا ہوگی۔ اور نفس جتنا ہی قوی ہوگا روح اتنا ہی کمزور ہو جائیگی ان میں ایسا ہی جوڑ ہے کہ جیسے ترازو کے دو پلڑے ایک کو جھکاؤ تو دوسرا اوپر آجائے گا۔ اور اس کو جھکاؤ تو دوسرا اوپر آجائے گا تو نفس کی خواہشات اگر غالب ہوں گی تو روح کے تقاضے مغلوب ہو جائیں گے اور روح کے تقاضے اگر غالب ہوں گے تو نفس کے تقاضے کمزور ہو جائیں گے۔

مرزا غالب کا ایک واقعہ

غالب صاحب اپنے اوائل عمر میں آزاد سے تھے روزہ نہیں رکھتے تھے اور لوگ کہتے ہیں کہ شراب بھی پیتے تھے لیکن بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ انھوں نے بعد میں توبہ کرلی تھی خدا کرے ایسا ہوا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ اور بارہ بجے دن میں مومن خاں جو شاعر تھے یہ بہت دینداریں سے تھے اور عالم بھی تھے یہ غالب

سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئے ایک دن جو کمرہ کھول کر داخل ہوئے تو غالب کھانا کھا رہے تھے۔ مومن نے کہا کہ اُستاذ یہ کیا کر رہے ہیں یہ تو رمضان کا مہینہ ہے غالب نے کہا کہ کچھ نہیں شیطان غالب ہے۔ ذو معنیٰ لفظ۔

مومن خاں نے کہا کہ ہم نے تو علماء کی زبان سے یہی سنا ہے کہ شیطان قید کر دیا جاتا ہے۔ غالب نے کہا کہ شریعت کا یہ مسئلہ بالکل حق ہے مگر اتفاق سے میری ہی کوٹھری میں قید کیا جاتا ہے اور اس سے سابقہ پڑتا ہے تو مطلب یہ ہے کہ شیطان آکر جبھی اثر ڈالتا ہے کہ اندر تاثر کا مادہ موجود ہو اور اندر تاثر اسی وقت ہوگا جبکہ اندر خواہشات غالب ہوں۔ اب اگر کوئی شیطان کی پیروی کرتے کرتے خود ہی شیطان بن جائے وہ دیگر بات ہے۔

شیطان کا ایک مذاق آمیز واقعہ

دن کا وقت تھا لوگوں نے دیکھا کہ بیچ سڑک پر ایک شخص کمبل اوڑھے سو رہا ہے لوگوں نے کہا کہ یہ کون بے وقوف ہے جو بیچ سڑک پر سو رہا ہے گاڑیاں جا رہی ہیں گھوڑے تانگے جا رہے ہیں اس کو موت کا ڈر نہیں کہ پڑا ہوا سو رہا ہے یہ کیا لغو حرکت ہے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شیطان ہے۔ لوگوں نے کہا کہ تیرا کام تو بہکانا دھوکا دینا ہے تو کیوں سو رہا ہے اس نے کہا کہ ہم نے انسانوں میں ایسے نمائندے تیار کر دیئے ہیں کہ ہم کو زیادہ محنت کی ضرورت نہیں پڑتی وہ خود ہمارا کام کرتے ہیں وہ خود شیطان بن گئے ہیں ہم نے اتنی تاثیر ڈال دی ہے کہ اب وہ دین کی طرف آتے ہی نہیں تو جو خود شیطان بن جائے وہ بات دوسری ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ یعنی جب تمہارے اوپر رمضان آجائے تو تم روزہ رکھو۔ یہ نہیں کہا کہ جب تم رمضان پر پہنچ جاؤ تو روزہ رکھو۔ اگر یہ ہوتا کہ آدمی پہنچتا تو وہ اپنی کوٹھری

میں بند رہتا ہے اور روزہ تک نہ پہنچا تو رمضان خود آتا ہے اور جب آتا ہے تو اس کے اثرات سے خواہشات مغلوب ہو جاتی ہیں۔ اور اس مغلوبیت سے شیطان کا اثر بھی کم ہوتا ہے تو رمضان کی پہلی برکت تو یہ ہوئی کہ ایک تقاضہ مغلوب ہوا اور دوسرا تقاضا ابھر گیا۔

شریعتِ اسلام کا منشاء یہ ہے کہ جب ایک مہینہ تک وقت کی پابندی کے ساتھ کھانا پینا بند کردو اور نمازیں وقت پر پابندی کے ساتھ پڑھو اور جو اس کے آداب ہیں انھیں بجالاؤ۔ تو معلوم ہوا کہ ایسی زندگی ممکن ہے محال نہیں ہے اگر ایسی زندگی ممکن نہ ہوتی تو اس مہینے میں بھی نہ ہوتی اور جب ممکن اور زیرِ عمل آچکی۔ تو شوال اور ذی قعدہ میں اس کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔

مطلب یہ ہے کہ ان اثرات کو باقی رکھو جو رمضان نے تمہارے اندر... پیدا کیا ہے۔ اور ان سے کام لو اور یہ موقوف ہے اپنی ہمت پر۔ اسی واسطے شریعت نے جہاں ایک مہینے کا روزہ فرض کیا وہاں کچھ نفلی اور مستحبات روزے بھی رکھے ہیں کہ ہر مہینے میں کم سے کم تین روزے تیرہویں اور چودھویں اور پندرھویں کو رکھے۔ اور شریعت کا وعدہ ہے کہ الحسنۃ بعشر امثالہا یعنی ایک نیکی دس نیکی کے برابر ہوگی۔ مطلب یہ ہوا کہ تین دن کے روزے کا ثواب ایک مہینہ کا مل گیا۔ تو تین ہی دن روزہ رکھنے سے پورے مہینے کے روزہ کا ثواب مل گیا۔ اس سے رمضان کے اثرات کی تجدید ہوتی رہے گی۔

جب سستی پیدا ہوئی تو پھر اگلے مہینے میں تین روزے رکھ لیے اگر سال بھر اسی طرح گذار دیا جائے تو رمضان کے اثرات کی تجدید ہوتی رہے گا اور وہ اثرات باقی رہیں گے تو دکھلایا یہ گیا کہ ایک مہینہ جب تم نے عمل کیا اور اس کے اثرات وبرکات دیکھے تو انھیں محفوظ رکھو یہ ناممکن چیز نہیں کہ تم یہ کہہ کر ٹال

دو کہ یہ تو مشکل اور محال ہے ۔ اگر محال ہوتا تو رمضان میں بھی پورا کرنا محال ہوتا اور اگر بالفرض کسی نے ایسا بھی نہ کیا تو پھر بھی کچھ نہ کچھ رمضان کے اثرات اس پر رہتے ہیں ۔

حدیث شریف میں ہے کہ رمضان اِلیٰ رَمضانٍ کفارۃٌ لِمَا بَیْنَھُمَا ۔ یعنی ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک جو بدیاں ہیں وہ دونوں رمضان مٹا دیتے ہیں ۔ مگر اس میں بھی شرط ہے وہ یہ ہے کہ دل میں رمضان کی لگن ہے جب رمضان گزر جائے تو آدمی یہی سوچتا رہے کہ بڑا برکت کا مہینہ ہاتھ سے چلا گیا خدا کرے کہ پھر آجائے اور کسی طرح سے گیارہ مہینے پورے ہوں اور پھر رمضان شریف آجائے ۔ جب یہ نیت اور لگن ہوگی تو اس کے اثرات باقی رہیں گے اور اگلے اثرات اس کے لیے مبادی اور مقدمات بن جائیں گے اور یہ دونوں چیزیں ملکر بیچ کے گناہ کو مٹا دیں گی ۔

معلوم ہوا کہ رمضان کی برکات سے بدیاں مٹتی ہیں تو ایک برکت تو یہ ہوئی کہ آدمی صالح بن گیا ۔ اور دوسری برکت یہ ہوئی کہ درمیان کے گناہ اگلے سال کے رمضان کے آنے تک مٹ جائیں گے ۔ مگر ان برکات کو قائم رکھنا یہ آدمی کی توجہ پر موقوف ہے ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ وہ برکتیں اُترتی رہیں اور ہم دھکیلتے رہیں اور پھر وہ آجائیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں ۔

کیا ہم اپنی رحمت تمہاری کمر سے چپکا دیں گے اور تم بھاگے چلے جا رہے ہو گے بلکہ تم محتاج ہو تم کو ہزار دفعہ ضرورت ہو تو توجہ کرو دینے کے لیے ہم تیار ہیں مگر توجہ کرنا تمہارے لیے شرط ہے ۔ انسان کی ہر قوت میں یہی ہے آنکھ کے اندر دیکھنے کی طاقت ہے لیکن خود بخود نہیں دیکھے گی ۔ بلکہ جب آدمی کسی چیز کے دیکھنے کی کوشش کرے گا ۔ جبھی وہ چیز آنکھ کے سامنے آئے گی ۔ اگر

آنکھ بند کئے ہوئے بیٹھا ہو تو آنکھ کے اندر لاکھ قوّت ہو آنکھ کے اندر کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ کانوں میں سننے کی طاقت ہے مگر کان لگانا شرط ہے۔ کان لگاؤ جبھی تو بات سُننے میں آئے گی۔ اگر کان ہی نہ لگاؤ تو کوئی بات سُننے میں نہیں آئیگی بدن کے اندر قوت لامسہ ہے۔ چیزوں کی نرمی گرمی اور سختی سب محسوس کرتا ہی مگر شرط یہ ہے کہ ہاتھ لگاؤ۔ لیکن اگر ہاتھ ہی نہ لگاؤ تو وہ قوت اپنے اندر رکھی رہے گی۔ ہر قوت کا خاصہ یہی ہے کہ اس کے استعمال کی طرف توجہ ہو۔

بہرحال یہ ظاہر ہے کہ رمضان نے برکات پیدا کر دیئے مگر ان کا بقا آپ کی توجہ پر موقوف ہو گا۔ ایسا نہیں ہو گا کہ آپ نہ چاہیں اور زبردستی وہ برکتیں ٹھونس دی جائیں۔

لہٰذا اس کی برکت صرف اسی مہینے تک محدود نہیں ہے بلکہ آگے بھی چلتی ہے اس کا بقا اور عدمِ بقا آپ کی ہمت پر موقوف ہے لہٰذا جو سوال کیا گیا کہ آیا یہ رمضان کی خاصیت ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی گناہ سے بچتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ کثرتِ عبادت خود رمضان کی خاصیت ہے وہی رمضان کی خاصیت ہے برکات نے اسمیں کثرتِ عبادت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اور کثرتِ عبادت نے کثرتِ معصیت کو ترک دیا۔ باقی یہ کہ یہ برکت رمضان میں کیوں ہے تو یہ حق تعالیٰ کی دی ہوئی ہے اسلیئے ایک اصول بیان کر دیا گیا قرآن کریم میں کہ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ یعنی اللہ تعالیٰ چیزوں کو پیدا کرتا ہے اور ان میں سے کسی چیز کو چھانٹ لیتا ہے تو راتیں بنائی ان میں سے لیلۃ القدر کا انتخاب کر لیا وہ اپنی رات بنالی اور دن بنائے ان میں سے جمعہ کا انتخاب کر لیا۔ مہینے پیدا کیئے ان میں سے رمضان کو چھانٹ لیا۔ آسمان کو پیدا کیا ان میں سے ساتویں آسمان کو چھانٹ لیا کہ وہ بنیاد ہے جنّت کی اور زمین پیدا کی ان میں سے خانۂ کعبہ کو اپنے لیے انتخاب کر لیا وہ تجلّی گاہ ربّانی

ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے۔ لہٰذا اسکی قدر کرنی چاہیئے۔

رمضان شریف میں برکت کا ہونا لازمی ہے۔ برکات ذاتی بھی ہیں۔ اور واقعات بھی ایسے ہیں کہ جس سے برکتیں بڑھ گئیں۔ مثلاً نزول قرآن ہے اس میں لیلۃ القدر ہے پھر اس میں ملائکہ کا نزول ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب لیلۃ القدر ہوتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام لاکھوں ملائکہ کے جلوس کے ساتھ دنیا میں اُترتے ہیں اور جو حضرات اس رات عبادت میں مشغول ہوتے ہیں ان کے قلوب پر سکون واطمینان اور ٹھنڈک و بشاشت اُتارتے ہیں یہ رمضان کی خصوصیت ہے دیگر مہینوں میں یہ خصوصیت نہیں ہے

اِسکو دوسرے لفظوں میں آج کل کی اصطلاح میں یوں کہا جائے کہ بادشاہوں کی جب سالگرہ کا دن آتا ہے تو دربار منعقد ہوتے ہیں نذریں قبول کی جاتی ہیں انعامات دیئے جاتے ہیں جاگیریں تقسیم ہوتی ہیں ہزاروں قیدی رہا کیئے جاتے ہیں۔ عہدے الگ دیئے جاتے ہیں۔ بادشاہ کی طرف سے اجازت ہوتی ہے کہ ہر کس و ناکس آئے اور اپنی اپنی مراد مانگے کیونکہ یہ سالگرہ کا دن ہے۔

رمضان شریف درحقیقت قرآن مجید کا سال گرہ کا دن ہے۔ قرآن رمضان المبارک میں اُترا ہے تو ہر رمضان میں سالگرہ ہوتا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام پورے شان وشوکت سے اُترتے ہیں اور ملائکہ کو لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے وَلِلّٰہِ عُتَقَاءُ مِّنَ النَّارِ۔ ہزاروں آدمی جہنم سے بری کیئے جاتے ہیں۔ جن جن قلوب میں صلاحیت ہے۔ اللہ ان صلاحیتوں کو دیکھتے ہیں اور ہزاروں کو جہنم کے عذاب سے بری کر دیتے ہیں۔ رمضان شریف میں ایک منادی ملائکہ میں سے اعلان کرتا ہے یَا بَاغِیُ الْخَیْرِ اَقْبِلْ یَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَقْصِرْ اے خیر کے طلب کرنے والے جلد آ خیر طلب کر۔ کیونکہ یہ موقع ہے

خیر کے طلب کرنے کا۔ اے شر سے بچنے والے رُک جا شر سے یہ موقع ہے شر سے بچنے کا۔ معلوم نہیں یہ مہینہ تیرے اوپر آئے یا نہ آئے اس مہینے کی خصوصیت ہے کہ کتنے لوگ جن پر عذاب ثابت ہوچکا ہے وہ بھی آزاد کر دیئے جاتے ہیں۔

تو رمضان سالگرہ کا دن ہے اور سالگرہ میں یہی ہوتا ہے کہ انعامات تقسیم ہوں قیدیوں کو رہا کر دیا جائے تو دنیا والوں میں تو انعام ظاہری ہوتا ہے دولت اور جائیداد کا اور اللہ کے یہاں انعام ہوتا ہے قلبی دولت کا یعنی اطمینان وسکینت عطا کرنا کرنا اور غمِ دنیا کا دل سے نکال ڈالنا۔ یہ انعاماتِ خداوندی ہیں جو باطنی ہیں اور اہلِ باطن پر آتی ہیں۔ دنیا میں جیسے دربار منعقد ہوتے ہیں۔ فوجیں سلامی دیتی ہیں۔ اور وہاں معنوی دربار منعقد ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے جنود میں ملائکہ ہیں وہ اُترتے ہیں۔ مگر وہ غیبی چیزیں ہیں ان کا تعلق اہلِ باطن ہوتا ہے جو اہلِ باطن پر اُترتی ہیں۔ اور وہ اسکو محسوس کرتے ہیں۔ اگر کوئی بہت ہی بے حس ہو تو الگ بات ہے ورنہ اس کو خود حس ہوتی ہے کہ میں کتنی برکات میں ہوں اور قلب میں کیسا سکون ہے اس کو اطمینان ہوتا ہے یہ ذکر اللہ کی برکت ہوتی ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ

تو رمضان شریف میں مختلف قسم کی برکات ہیں۔ ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ الْإِفْطَارِ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ الرَّحْمٰنِ ؕ روزہ دار کو دو فرحتیں نصیب ہوتی ہیں مادی فرحت تو یہ ہے کہ جب افطار کرتے ہیں تو مسرت کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ دن بھر کے بھوکے ہوتے ہیں جب افطار سامنے آتا ہے تو نہایت فرحت حاصل ہوتی ہے اگر بھوک نہ ہو اور کھانا کھائے تو غذا بدن کو لگتی نہیں اور اگر کافی بھوک ہو اور

پھر کھائے تو بدن کو لگتی ہے اور رات کو نماز تراویح کے لیئے جب کھڑے ہوتے ہیں اور کلامِ خداوندی سُنتے ہیں تو اس وقت قلب کی دوسری کیفیت ہوتی ہے تو مادی فرحت بھی ہے اور روحانی فرحت بھی۔

اب ان کا باقی رکھنا یہ آدمی کی ہمت پر ہے۔ مثلاً بادشاہ نے جاگیر دیدی تو جاگیر کا سنبھالنا تو آپ کا کام ہوگا کہ اس کے لیئے نظم کرے تاکہ عمر بھر فائدہ اُٹھائے اور اگر عیاشی میں ساری جائداد اُڑادی تو چند دن میں جائداد ختم ہوجائے گی۔ اور وہ بھوکا مرے گا تو بادشاہ نے جاگیر دیدی لیکن جاگیر کا سنبھالنا یہ جاگیر دار کا کام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بادشاہ کی طرف سے عتاب ہوجائے کہ ہم نے ایک دولت دی تھی اور تم نے ضائع کردی تو ضائع کرنے پر اُلٹا مواخذہ کا ہی خطرہ ہے۔

اسلیئے رمضان شریف کے مہینے میں جس قدر ممکن ہو تلاوت کی جائے اور اہل اللہ کے حالات کا مطالعہ کیا جائے اور نوافل کی کثرت اور توجہ الی اللہ یہی رمضان کے مشاغل ہیں سو اگر ایسا کیا جائے تو رمضان کی برکات حاصل ہوں گی۔ اور اگر نہ کیا تو رمضان آیا اور چلا گیا آدمی جیسا تھا۔ ویسا ہی رہا کیونکہ اس نے رمضانؔ کی قدر نہ کی تو یہ سب موقوف ہے انسان کی خود اپنی توجہ پر مگر کُلی حکم نہیں لگانا چاہیئے کیونکہ عوام میں ہزاروں ایسے ہیں کہ ان کے قلوب صالح ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے کہ ان پر رمضان بار ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح سے ماہ رمضان ٹلے۔

اور یہی وجہ ہے کہ عوام عید کے چاند کی ہزاروں شہادتیں لاتے ہیں مگر رمضان کی شہادت بہت کم لاتے ہیں۔ لہٰذا عوام میں کلی حکم نہیں لگا سکتے کیونکہ بہت سے عوام ایسے بھی ہیں جن کے قلوب خواص سے بہتر ہوتے ہیں اخلاص اور توجہ الی اللہ کے لحاظ سے۔ دیکھنے میں معلوم ہوتے ہیں کہ عامی

آدمی ہیں مگر ان کا قلب صالح ہوتا ہے، اور ایک بہت بڑا عالم ہے ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑا عالم ہے مگر قلب میں صلاحیت نہیں ہوتی تو یہ سب باطنی چیزیں ہیں اکثریت تو ان کی ایسی ہی ہوتی ہے لیکن دنیا میں اکثریت بُروں کی ہوتی ہے اور پاکیزہ نفس لوگوں کی تعداد تو کم ہوتی ہے تو ساری دنیا میں انقٰی قلوب تو انبیاء علیہم السلام کے ہیں اور اربوں انسانوں میں سے اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار چھانٹ لیا۔ پھر انبیاء کے بعد علماء اقلیت میں ہیں باقی اکثریت میں ہیں تو تقوٰی کے لحاظ سے متقی کم ہیں غیر متقی زیادہ ہیں تو دنیا کی خاصیت ہے کہ اکثریت فساد کی ہوتی ہے اور اقلیت صلاح کی ہوتی ہے اسی لیے فرمایا گیا کہ لَا تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اکثریت کے پیچھے مت پڑو وہ تم کو گمراہ کر کے رہیں گے۔ ان اقلیت کے پیچھے جاؤ کہ جن کے قلوب میں صلاحیت ہے خیر ہے حق ہے اُن کی طرف جُھکو عوام کی بھیڑ کی طرف مت جھکو تو دنیا کی اکثریت میں چھلکا زیادہ ہوتا ہے اور مغز و خلاصہ کم ہوتا ہے اگر خیر کا غلبہ ہو جائے تو ہر زمانہ خیر القرون بن جائے تو دُنیا جنت ہو جائے گی پھر جنت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔

اقبال نے ایک موقع پر کہا ہے کہ آج کل کی جمہوریت بنیاد ہے سارے فسادات کا۔ اور اسے لوگ اسلام کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اسلام کی جمہوریت کہاں اور عوام کی بھیڑ کہاں دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں۔

اقبالؒ کہتا ہے ؎

بترس از طرز جمہوری اسیر پیر دانا شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید۔

یعنی اصطلاحی جمہوریت سے ڈرو اور بچتے رہو اور کسی پیر دانا کا دامن

پکڑ لو جو تم کو غیر کے راستے پر چلائے۔

یہ عوام کی بھیڑ خیر کے راستے پر نہیں چلائے گی۔ دو سو گدھے اگر جمع ہو جائیں تو ان سے فکر انسانی حاصل نہیں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کہیں دو سو گدھے جمع ہوں ان کی طرف مت دیکھو اور اگر اس کے مقابلہ میں ایک انسان ہو تو اسکی طرف دیکھو۔ دنیا میں اقلیت کم ہوتی ہے لیکن اکثریت بالکل بے کار نہیں ہوتی۔

جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا کہ اگر چالیس مسلمان ایک جگہ جمع ہو جائیں، تو ان میں کوئی نہ کوئی ایک مسلمان ضرور مقبول خدا ہوتا ہے اگر کفار یا منافقین لاکھوں جمع ہوں تو ان میں کوئی بھی مقبول خدا نہیں ہوتا۔ مقبولیت کے لیئے مسلمان ہونا شرط ہے۔

مجلس نمبر ۱۵

۲۳ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۴ء

فضائل شبِ قدر اور نزولِ قرآن

آج کی رات میں بادل کی کثرت تھی۔ نمازِ تراویح اگرچہ باہر ہی پڑھی گئی لیکن بارش کا شبہ تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج شب قدر ہے۔

حکیم الاسلام مدظلہ نے اپنے معمول کے مطابق اہلِ علم کے سوالات کا محققانہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ہماری دلی خواہش تھی کہ آج کی مجلس میں حضرت والا سے شبِ قدر کے متعلق سوالات کئے جائیں ہم نے بعض احباب سے مشورہ بھی کیا انھوں نے ہماری رائے سے اتفاق کیا۔ حالت یہ تھی کہ بادل کی کثرت کی وجہ سے کبھی بوند پڑتی کبھی بند ہو جاتی۔ مگر ابھی تک پورا مجمع اور حضرت والا صحن میں ہی تشریف فرما تھے۔ موقع پاکر ہم نے اپنا مقصد ظاہر کر دیا کہ حضور والا! ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ آج شب قدر کے متعلق کچھ بیان فرما دیں حضرت حکیم الاسلام مدظلہ سارے سوالات کو چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے اور فرمایا کہ ہاں آج شب قدر کے آثار محسوس ہو رہے اتنے میں بوندیں تیزی سے پڑنے لگیں۔ پھر آپ اندر کمرے میں تشریف لے گئے اور ساتھ ہی پورا مجمع بھی۔ حضرت والا نے بیان کرنا شروع فرمایا۔

حضرت حکیم الاسلام دامت برکاتہم نے فرمایا کہ شب قدر کی بڑی فضیلت ہے اس کے بارے میں قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ لَیْلَۃُ الْقَدْرِ

خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ یعنی ایک رات ہزار راتوں سے زیادہ افضل ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہزار سال کی مخلصانہ عبادت سے جو مقام حاصل ہوتا ہے۔ لیلۃ القدر میں اس کی برکت و فضیلت سے ایک رات میں آدمی اس مقام کو پالیتا ہے۔ اس لیے کہ یہ مبارک اور مقبول رات ہے اور قاعدہ بھی ہے کہ جب ظرف مقبول ہوتا ہے تو مظروف بھی مقبول ہو جاتا ہے اور ظرف دو ہی ہیں یا تو ظرفِ زمان یا ظرفِ مکان۔ بعضے چیزیں زمانے میں واقع ہوتی ہیں اور بعضے چیزیں مکان میں واقع ہوتی ہیں اگر زمانہ مقدس ہے تو اس میں جو خیر کا عمل ہوگا وہ دوسرے زمانے کی نسبت سے ہزاروں درجہ بڑھا ہوا ہوگا۔

اسی طرح اگر مکانِ مقدس ہے اور اس میں نیکی کی جائے تو وہ نیکی دوسرے مکانوں کی نیکی کے بنسبت ہزاروں درجہ بڑھی ہوئی ہوگی۔ یہی عبادت آپ یہاں کریں اور یہی عبادت جاکر بیت اللہ میں کریں تو بیت اللہ کی نماز ایک لاکھ نماز کے برابر ہوتی ہے۔ اور یہاں ایک نماز ایک ہی نماز کے برابر ہوگی۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ یہاں ایک لاکھ نماز بھی پڑھیں اور اسی کی وجہ سے کسی مقام پر پہنچیں تو بیت اللہ میں ایک ہی نماز پڑھنے سے وہ روحانیت کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ اور یہ وجدانی چیز ہے آدمی خود محسوس کرتا ہے مثلاً حج کے موقعہ پر بہت سے خلافِ طبع امور پیش آتے ہیں شہر اپنا نہیں۔ زبان نہیں جانتے اجنبیت کی وجہ سے ساری تکلیفیں اٹھاتے ہیں مگر جہاں حرم میں قدم رکھا تو ایسا سکون معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی تکلیف ہی نہیں ہوئی تھی بیت اللہ پر نظر پڑی اور ساری تکلیفیں ختم ہوئیں تو وجدانی طور پہ ہر شخص محسوس کرتا ہے۔

آخر بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی یہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوتی۔ اور مکّے کی صورت دیکھی تو ایک روحانیت اُبھری پھر تواضع اور انکسار و محبّت اور جوش یہ سارے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور جب بیت اللہ میں پہنچتے ہیں تو ان جذبات کی کوئی انتہاء نہیں رہتی اور ہر شخص محسوس کرتا ہے لیکن مقامات کو عارف ہی پہچانتے ہیں کہ کیا مقام حاصل ہوا عوام بھی محسوس کرتے ہیں کہ اب تک ہم کیسے تھے اور حرم میں داخل ہونے کے بعد کیسے ہو گئے وہی نماز آپ بازار میں پڑھیں جس کو شر البقاع کہا گیا ہے یعنی بد ترین جگہ۔ اگر وہاں عبادت کی جائے تو وہ اخلاص و معرفت نصیب نہیں ہوگی جو مسجد میں ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ مکان کے فرق کی وجہ سے عمل میں فرق پڑ جاتا ہے۔

اور یہی حالت زمانوں میں ہے اگر ایک عبادت آپ جمعہ کی رات میں کریں اس کا درجہ بڑھا ہوگا دیگر راتوں سے اور وہی عبادت آپ لیلۃ القدر میں کریں تو اس کے مراتب بہت بڑھ جائیں گے۔ جو اور راتوں میں عبادت سے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ وہ زمانہ مقدّس ہے تو جیسا ظرف ہوگا ویسا ہی مظروف ہوگا۔ اگر ظرف تکونا ہے تو جتنا پانی بھریں گے وہ تکونا ہی نظر آئے گا۔ چوکورا اور گول نہیں بنے گا۔ کیونکہ ظرف کی ساخت ہی ایسی ہی ہے اور اگر ظرف سلیقہ کا بنا ہوا ہے تو جو چیز اس میں بھریں گے۔ وہ بھی ویسا ہی نظر آئے گی۔

مثلاً شیشہ ہے اگر سفید ہے تو جو چیز اس میں بھریں گے وہ سفید ہی معلوم ہوگی۔ اور اگر سبز ہے تو ساری چیز سبز ہی نظر آئے گی خواہ وہ شے سفید ہی ہو کیونکہ اس ظرف کا اثر ہے تو جب مادیات اور حسیات میں یہ چیز ہے تو روحانیت میں کیوں نہ ہوگی۔ تو لیلۃ القدر میں جو طاعت کی جائیگی جس کے بارے میں قرآن نے صراحت کی ہے لَیْلَۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ

مشغول۔ اگر آپ ایک ہزار مہینہ عبادت کریں اور ایک عبادت اس رات میں کریں تو یہ عبادت وہی ثمرہ پیدا کرے گی۔ جو ایک ہزار مہینے عبادت کرنے سے ثمرہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کھلی ہوئی فضیلت ہے۔

شبِ قدر کی دوسری فضیلت

اور شبِ قدر کی دوسری فضیلت یہ ہے کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اس رات میں جبریل علیہ السلام اُترتے ہیں فِی قُبْقُبَۃٍ مِّنَ الْمَلَائِکَۃِ ایک بڑے جلوس کے ساتھ آتے ہیں کروڑوں ملائکہ ساتھ میں ہوتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ کسی مجلس میں اگر ایک اہل اللہ آجائے تو مجلس کے رنگ میں فرق پڑجائے گا اور توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے گی۔ اور جب اربوں کھربوں اہل اللہ ہوں گے تو ظاہر بات ہے کہ زمین کی نورانیت کتنی بڑھ جائے گی۔ تو ان ملائکہ کے آنے سے قلوب کے اندر سکینت اور بشاشت اور انشراح پیدا ہوتا ہے۔ یہ لیلۃ القدر کے ساتھ مخصوص ہے جو دوسری راتوں میں نہیں ہے۔

لیلۃ القدر کی تیسری فضیلت

اور تیسری بات یہ ہے کہ گویا عالمِ غیب سے آدمی کا سابقہ پڑتا ہے۔ دیگر راتوں میں آپ نماز پڑھیں گے تو آپ دنیا میں ہیں لیکن لیلۃ القدر میں جب اربوں کھربوں ملائکہ کا ہجوم ہوتا ہے جو اہل اللہ ہیں اور وہ بھی معصیت سے پاک صاف۔ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ ۝ وہ اللہ کے مقبول بندے ہیں لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝ وہ نہ عصیان کو جانیں نہ معصیت کو جانیں بلکہ کمالِ اخلاص اور کمالِ معرفت کے حامل اور جب ایسے اہل اللہ ہوں اور کروڑوں ہوں تو کیا ان کا اثر نہیں پڑے گا تو اس وقت لیلۃ القدر میں آدمی کو عالمِ غیب سے قرب ہو جاتا ہے۔ تو کُل تین فضیلتیں ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ ظرفِ مقدس دوم ملائکہ کی

صحبت۔ تیسرے ان کی نورانیت کا اضافہ جس سے قلوب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے اور قلب کی نورانیت حسی نہیں ہے جیسا کہ آفتاب کا نور ہے کہ چاندنا نظر آنے لگے۔ بلکہ معنوی نورانیت ہے کہ قلب میں سکون و فرحت اور بشاشت اور توجہ الی اللہ کا نزول ہوتا ہے۔ قلب کی نورانیت کا ہر شخص تجربہ کر لے۔ اگر اسی رات میں خلوص کے ساتھ عبادت کرے اور توجہ الی اللہ ہو تو اضعافاً مضاعفاً طاعت کا ثواب بڑھ جائے گا۔ پھر وہ رات خود مقدس ہے اور واقع ہوئی مقدس مہینے کی رات میں کیونکہ رمضان کا مہینہ بھی تو خود مقدس ہے وہ سید الشہور ہے اس کے اندر شیاطین بھی بند ہیں۔ نفس پر بھی پابندیاں ہیں۔ اور تزکیہ نفس کے سارے سامان موجود ہیں لہٰذا جب ان سامانوں کے ساتھ لیلۃ القدر میں عبادت ہوگی۔ تو لازمی طور پہ توجہ الی اللہ کامل ہوگی۔ دنیا کی طرف توجہ نہیں ہوگی۔

اور ظاہر بات ہے کہ عبادت کا وزن اخلاص ہی سے ہوتا ہے۔ جب اخلاص کامل ہوا تو عبادت بھی کامل ہوگی۔ تو رمضان اور رمضان میں لیلۃ القدر۔ اور لیلۃ القدر میں ملائکہ کا اجتماع، اور عالمِ غیب کا قریب آجانا۔ یہ تمام اثرات ہیں کہ جن سے برکات کا ظہور ہوتا ہے

دیگر راتوں میں آپ توجہ کریں گے عالمِ غیب کی طرف کوشش کریں گے کہ اُدھر توجہ ہو۔ مگر عالمِ غیب آپ کے پاس نہیں آئے گا۔ بلکہ آپ خود جائیں گے اگر آپ میں طاقت ہے تو پہنچ جائیں گے۔ اور اگر طاقت نہیں ہے تو نہیں پہنچیں گے اگر تھوڑی طاقت ہے تو ذرا قریب ہو گئے لیکن جب سارا عالمِ غیب ہی نیچے اتر آیا ہو تو اگر روحانیت کا کمزور آدمی بھی ہے تو اس کے اندر طاقت پیدا ہو جائے گی۔ یہ لیلۃ القدر کی بات ہے۔

شبِ قدر کے چھپا لینے کی وجہ

ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ رات پوشیدہ کیوں رکھی گئی اس کی وجہ کیا ہے۔ اگر متعین ہو جاتی تو عبادت میں سہولت ہوتی۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ، نے فرمایا کہ تاکہ آپ ہر رات میں یہ توجہ کریں کہ ممکن ہو اب ہو اگر آپ کو تبلا دی جاتی کہ فلاں تاریخ میں آئے گی تو چُپ چاپ بیٹھے رہتے کہ جب وہ رات آئے گی تو عبادت کریں گے۔ اسلیے چھپا لی گئی تاکہ آپ سُست نہ ہو جائیں۔ اور بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔ اور معطل نہ بن جائیں۔

اِس لیئے اس تعطل کو رفع کرنے کے لیے اس رات کو چھپا دیا گیا مگر چھپانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زیادہ چھپا دی گئی ہے بلکہ فی الجملہ چھپا دی گئی ہے کیوں کہ اس قدر متعین ہے کہ رمضان میں وہ رات ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے سال میں تلاش کی زحمت سے آپ بچ گئے۔ اور رمضان میں بھی ظن غالب بتایا کہ عشرہ اخیرہ میں ہے ادھر بیس دن رمضان میں عبادت کرتے کرتے قلب میں صلاحیت پیدا ہوئی اور اس کے بعد آگیا عشرہ اخیرہ اور ساری راتوں میں صرف ایک رات شبِ قدر کی رکھی تاکہ طاعت میں اور قوت پیدا ہو جائے۔

متعین کرنے میں سارے رمضان آدمی بے توجہ رہتا۔ کہ جب وقت آئیگا عبادت کرلیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ موت کا وقت کسی کو نہیں بتایا گیا تاکہ پوری زندگی میں موت کی استعداد پیدا کرتا رہے۔ اور آخرت کے لیے سامان کرتا رہے اگر یہ تبلا دیتے کہ ساٹھ برس کے بعد اتنے بج کر اتنے منٹ پر موت آئیگی تو اسمیں دو خرابیاں تھیں۔ اوّل تو یہ کہ آدمی کی زندگی اجیرن ہو جاتی اب وہ گن رہا ہے کہ اب موت کے اتنے دن رہ گئے ہیں کھانا پینا سب بے مزہ ہو جاتا۔ اور نظام عالم برباد ہو جاتا۔ اسلیئے موت کا وقت نہیں تبلایا

دوسرے اسلیے موت کا وقت نہیں بتلایا تاکہ عمر کو عبادت میں استعمال کرو۔ ممکن ہے اس وقت موت آجائے اور ممکن ہے دس گھنٹے کے بعد آئے ایسا نہ ہو کہ ہمیں اس وقت غافل ہوں اور موت آجائے تو غفلت باقی نہیں رہے گی۔

معلوم ہوا کہ چھپانے میں بیداری پیدا ہوتی ہے اور متعین کرنے میں بیداری باقی نہیں رہتی۔ اب ایک ہے فرائض ان کے اوقات متعین کر دیئے۔ کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے واجب ہے جھک مار کر کرنا پڑے گا۔ اور جو چیز واجب نہیں ہے ان کو چھپا دیا تاکہ اس کو تلاش کرو۔ اسی لیے شب قدر چھپا دی گئی تاکہ پورے رمضان اس کی تلاش میں رہو اور بیدار رہو۔

اگر بالفرض کسی نے کچھ بھی نہیں کیا تو کم سے کم اس پر کوئی وبال تو نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ فرض اور واجب نہیں۔ بے توجہی رہی تو رہی آپ نے قصداً اپنا نقصان کیا۔ فرائض میں اوقات کی تعیین کر دی گئی اسلیئے کہ وہ ہر شخص پر واجب ہے اگر فرائض متعین نہ ہوتے تو عمل کرنا مشکل ہو جاتا کوئی کوئی نماز صبح کے وقت پڑھ لیتا۔ کوئی شام کے وقت اسے تفرقہ پیدا ہوتا اسلیئے ان کی تعیین کر دی اور جو نوافل و مستحبات ہیں وہ افضل ہیں ان کی تعیین نہیں کی تاکہ بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔ ایک رات کے اوپر۔ بلکہ پورے عشرۂ اخیرہ میں جم کر عبادت کریں یہ تو بنی آدم ہی کی خیر خواہی کے لئے کیا۔ ورنہ اللہ کے خزانے میں کمی کیا ہے۔

جبریل علیہ السلام کا شب قدر میں قریب آنا اور اہل اللہ کا ان سے فیوض و برکات حاصل کرنا

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حدیث شریف میں آیا کہ شب قدر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام مسلمانوں کے گھر آکر ان سے ملاقات کرتے ہیں تو ملاقات کرنے کا کیا مطلب وہ کس طرح سے ملاقات کرتے ہیں۔

حضرت اقدس حکیم الاسلام مدظلہٗ نے فرمایا کہ کیا کبھی آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ اتنا کہتے ہی ساری مجلس ہنس پڑی۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ ان کے آنے سے ہر انسان کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن انسانوں کے مراتب مختلف ہیں۔ جو صاحبِ معرفت ہیں اور بصیرتِ قلب رکھتے ہیں ان کو ان انوار کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ خصوصی ملاقات ہوتی ہے لیکن جن کے اندر معرفت نہیں ہے وہ عمومی طور پر احساس کرتے ہیں کہ ہمارے قلوب کے اندر برکت آرہی ہے یہ آپ کا فعل ہے جبرئیل علیہ السلام کا فعل نہیں ہے وہ تو دُنیا میں آ گئے۔

رہا ان سے زیادہ فائدہ کون اُٹھاتا ہے تو بصیرت والے فائدہ اٹھاتے ہیں بے بصیرت والے نہیں جو زیادہ فائدہ اٹھائیں گے۔ جبریل علیہ السلام ان سے زیادہ قریب ہوجائیں گے۔ اور جو کم اٹھائیں گے ان سے بُعد رہے گا اور جو بالکل نہیں اٹھائیں گے ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔

جبریل علیہ السلام کسی خاص شخصیت سے ملنے نہیں آتے۔ اب یہ اشخاص پر موقوف ہے کہ کون ان سے ملنا چاہتا ہے اور کون نہیں ملنا چاہتا۔ اگر ملنا چاہے تو مل لے جن کے قلب کے اندر بڑا ادراک اور بڑی بصیرت ہے وہ جبریل علیہ السلام کے انوار کو محسوس کرتے ہیں اور ان کی طرف جھکتے ہیں تو گویا یہی ان کی ملاقات ہے جیسے آفتاب سب پر اپنی روشنی ڈالتا ہے اب ایک شخص وہ ہے کہ اسکی روشنی سے فائدہ اُٹھا رہا ہے اور ایک شخص وہ ہے جو گھر کے اندر ہے وہ فائدہ نہیں اُٹھاتا تو جس نے دھوپ سے فائدہ اُٹھایا وہ آفتاب سے قریب ہوگیا۔ اور جس نے نہیں اُٹھایا وہ آفتاب سے بعید کہا جائے گا مگر آفتاب سب کے لیے آتا ہے وہ کسی خاص شخص کے گھر میں نہیں آتا بلکہ زید، عمر، بکر سب پر اپنی روشنی ڈالتا ہے جس کا جی چاہے روشنی حاصل کرے اور جس کا جی چاہے

نہ کرے ۔

شبِ قدر کی مخصوص عبادت

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت اس رات میں کیا کوئی مخصوص عبادت ہے ۔ حضرت حکیم الاسلام دام مجدہ نے فرمایا کہ عبادات میں تو کوئی تخصیص نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ نوافل میں جتنا قرب ہوتا ہے ۔ دوسری طاعت میں اتنا قرب نہیں ہوتا ۔ لہٰذا نوافل کی کثرت زیادہ مناسب ہے ۔ اب تلاوتِ قرآن ایک بڑی عبادت ہے لیکن نفل اس عبادت کو بھی شامل ہے کیونکہ اس میں کلام پاک کی تلاوت بھی ہے اور نوافل بھی ہے ایک شخص تو وہ ہے کہ فقط تلاوت کر رہا ہے اس سے برکات حاصل ہوں گی ۔ لیکن تمام برکت اسی وقت ہوگی جبکہ نماز کے اندر تلاوت ہو تو جتنا قرب نوافل سے ہوتا ہے اتنا صرف تلاوت سے نہیں ہوتا اور یہ تلاوت اور نفل میں تقابل نہیں ہے کیونکہ نفل میں خود تلاوت موجود ہے

حضرات صحابہ رضؓ کی ترقی کی وجہ

حضرات صحابہ کی جو ترقی ہوئی ہے وہ دو چیزوں سے ہوئی ہے ایک کثرتِ صلوٰۃ اور ایک کثرتِ جہاد ۔ جہاد میں تو انھوں نے نفس کو مار ڈالا اور کچل ڈالا اور نماز میں توجہ الی اللہ اور تعلق مع اللہ پیدا کیا تو صحابہ کی جو سب سے بڑی عبادت تھی وہ یا تو جہاد یا کثرتِ صلوٰۃ اسی سے ان کی ترقی ہوئی اور اسی میں وہ کامیاب ہوئے اور ان سب سے بڑھ کر سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی مجلس میں حاضری یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مخصوص دولت تھی ۔

مجلس نمبر ۱۶

۲۶ شوال ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۷۴ء

مدار نجات ایمان ہے اعمال نہیں مگر اعمال سے ایمان کا ثبوت فراہم ہوتا ہے

ایک صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ نے فرمایا حاصل یہ ہے کہ ایمان مدار نجات ہے اعمال مدار نجات نہیں ہیں بلکہ ترقی درجات کے لیئے ہیں۔ اگر ایمان نہیں ہے تو مدار ختم ہوگیا۔ لیکن اگر مدار نجات موجود ہے یعنی ایمان اور پھر کوتاہیاں ہیں تو وہ بخشا جائے گا۔ یا تو فضلِ خداوندی سے بخشا جائے گا۔ یا عدل سے۔ دو ہی صورتیں ہیں ایک وہ ہے کہ عمر بھر کفر میں مبتلا رہا۔ لیکن مرنے سے پانچ.... منٹ پہلے اسلام قبول کر لیا اور عمل کی نوبت ہی نہیں آئی کہ کچھ عمل کرے لیکن بلاشبہ وہ بھی ناجی ہے اسلیے کہ اَلْاِسْلَامُ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَہٗ، پچھلی ساری چیزیں اسلام ختم کر دیتا ہے تو اس میں مدار نجات آگیا اگرچہ عمل کرنے کا وقت نہیں ملا اور فوراً مر گیا۔ اسلیے اس کی نجات ہوگی۔

اور ایک شخص وہ ہے کہ عمر بھر عبادت میں لگا رہا لیکن معاذ اللہ مرنے سے چند منٹ پہلے وہ مرتد ہوگیا اور اسلام چھوڑ دیا تو اسکی جس قدر نیکیاں تھیں سب غارت ہوگئیں وہ قابل نجات نہیں کیونکہ نجات کا مدار ایمان تھا وہ اس کے اندر نہیں رہا اسلیئے اس کی نجات کا سوال باقی نہیں رہا۔ ایمان کارگر نہیں ہوگا۔

جس حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ

یعنی جس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا وہ جنت میں داخل ہوگیا۔

ابنِ سیرین جو تابعین میں سے ہیں انھوں نے اس کی تشریح فرمائی ہے ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمل لغو ہے جس نے کلمہ پڑھ لیا جنتی ہوگیا۔ عمل کی ضرورت نہیں ہے مگر ایسا نہیں ہے انھوں نے اس کا جواب دیا کہ بلاشبہ لا الٰہ مفتاح ہے جنت کی لیکن لیس المفتاح اِلَّا وَلَہٗ الْاَسْنَان۔ کوئی کنجی ایسی نہیں کہ جس کے دندانے نہ ہوں۔ دندانے ہی تو تالے کو کھولتے ہیں اگر کنجی صاف ہے تو تالا نہیں کھلے گا تو وہ دندانے اعمال ہیں تو من قال لا الٰہ الا اللہ یہ عمل کے لغو کرنے کیلئے نہیں فرمایا گیا۔ بلکہ یہ ظاہر کرنے کے لیے فرمایا گیا کہ مدار نجات لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے وہ آج ہو جائے یا ہزار برس کے بعد ہو۔ مگر انجام کار نجات ضرور ہوگی عمل لغو نہیں ہے۔

اسی طرح سے کفر مدار عذاب ہے اگرچہ اس نے لاکھوں نیکیاں کی ہوں۔ لیکن انجام کار اس کے لئے جہنم ہے تو معلوم ہوا کہ حدیث میں مدار بتایا گیا ہے اس میں عمل کی بحث ہی نہیں ہے اس کی بحث دوسری روایات میں ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑ دینا جائز نہیں ہے

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ یہ اعلان کردو کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگیا۔ جب حضرت ابوہریرہؓ اعلان کرنے گئے تو حضرت عمرؓ نے ان کی چھاتی پر ہاتھ مارا اور وہ گر گئے۔ اور فرمایا کہ اگر تم نے یہ اعلان کیا تو لوگ عمل چھوڑ دیں گے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

حضرت حکیم الاسلام دامت برکاتہم نے فرمایا کہ یہ انتظام کی بات تھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اعلان کردو۔ بلکہ یہ فرمایا

کہ جو پہلے ملے اس سے کہدو اور پہلے اتفاق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملے۔ ان سے انھوں نے کہدیا تو حضرت عمرؓ نے زور سے ان کی چھاتی پہ مکا مارا وہ الٹے گر گئے۔ اب وہ روتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عمل پورا ہو گیا کہ جو پہلے ملے اور ممکن ہے حضور کو اعجاز سے یا خدا کی طرف سے اطلاع ہوئی ہو کہ پہلے حضرت عمرؓ ملیں گے اور وہ خود سنبھال لیں گے چنانچہ انھوں نے سنبھال لیا اور آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر اس طرح سے اعلان ہوگا تو لوگ بھروسہ کر بیٹھیں گے کہ بس لا الٰہ الا اللہ پڑھ لینا کافی ہے۔ کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ تو قوم نئی نئی اسلام لائی ہے۔ اگر پہلے ہی عمل معطل ہو گیا تو کوئی عمل نہیں کر سکے گا۔ اس واسطے آپ ایسے اعلان سے روک دیں یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب لوگ بھروسہ کر بیٹھیں گے تو اعلان مت کرو۔ اعلان تو ہو گیا مگر آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اعلان کردو بلکہ یہ فرمایا تھا کہ جو پہلے ملے اس سے کہدو تو پہلے ملنے والے نے یہ اشکال پیش کیا تو آپ نے قبول فرمالیا۔ اس سے بھی اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ لا الٰہ الا اللہ پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑ دینا جائز نہیں ہے کہ اب تو میں کلمہ پڑھ چکا ہوں نجات ہی نجات ہے خواہ عمل کریں یا نہ کریں۔

پس معلوم ہوا کہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ عمل کرنا بھی ضروری ہے اور جن روایات میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے عرض کیا کہ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ اگرچہ اس نے زنا اور چوری کیا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ زنا اور چوری کیے پھر حضرت ابوذر غفاریؓ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ

تو حضورؐ نے فرمایا کہ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ ۔ پھر یہی فرمایا تو دوبار حضرت ابوذر غفاریؓ نے یہی کہا اور حضورؐ نے یہی جواب دیا۔ پھر تیسری بار آپ نے فرمایا کہ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ۔ چاہے ابوذرؓ کی ناک مٹی میں مل جائے تب بھی وہ نجات پائے گا۔ تو یہ نجات کا مدار تبلایا گیا ہے عمل کا لغو ہونا نہیں بتایا یہ دوسری روایات سے معلوم ہوں گی۔

کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دیگا جبتک اللہ کا فضل شامل حال نہ ہو

ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ جو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بخشیں گے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کی بخشش کا دار و مدار بھی رحمت ہی پر ہے تو آپ نے فرمایا کہ میرا بھی دار و مدار رحمتِ خداوندی پر ہے۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ نے فرمایا کہ وہ لفظ فضل کا ہے رحمت کا نہیں آپ نے فرمایا کہ لَنْ یُّنْجِیَ اَحَدًا کُمْ عَمَلُہٗ یعنی کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دے گا۔ جب تک خدا کا فضل شامل حال نہ ہو۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ کا عمل آپ کو نجات نہیں دے گا۔ تو آپ نے فرمایا لَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ جب تک اللہ تعالیٰ رحمت اور فضل نہ فرمائے میری نجات بھی نہیں۔ تو اصل حدیث یہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمل موجب نہیں یعنی اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں کہ جب انسں اچھے اعمال کیئے تو اللہ مجبور ہے کہ اسے جنت میں داخل کر دیں۔ بلکہ اپنے فضل سے داخل کریں گے۔

اب یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نجات کا مدار فضل پر ہے تو عمل کرنے سے فائدہ کیا کسی کو کیا خبر کہ فضل ہوگا یا نہیں بس اتنا عقیدہ کافی ہے کہ فضل ہوگا

میں کہتا ہوں کہ عمل کرنا خود فضل کی دلیل ہے عمل نہ کرنا یہ دلیل ہے کہ فضلِ خداوندی اس کے اوپر نہیں ہے تو دنیا ہی سے فضل شروع ہو جاتا ہے فقط آخرت میں فضل نہیں ہوگا۔ جس کو عمل کی توفیق دیدے گئی۔ وہ فضل کے تحت آگیا۔

رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی پر رحمت فرمائیں اور اسکے سارے گناہ مٹادیں ان کو حق ہے وہ مختار ہیں لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ مگر حق تعالیٰ شانہ، جب فضل و رحمت فرمائیں گے تو وہ مختار مطلق ہیں جو چاہیں کریں۔ لیکن پھر بھی کوئی وجہ ہوگی۔ خواہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

مثلاً کسی نے لا الٰہ الا اللہ اتنے خلوص سے پڑھا کہ ساری بدیاں اس سے ملتی چلی گئیں۔ تو وہاں ایمان کا وزن دیکھا جائے گا کہ کس درجہ کا وزن ہے مگر اس کو اللہ ہی جانتا ہے دوسرے نہیں جان سکتے ہیں۔ ہم تو ظاہر میں یہی سمجھتے ہیں کہ ایک شخص لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہے وہ مسلمان ہے لیکن کس درجہ کا لا الٰہ الا اللہ ہے وہ ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں بعض کا لا الٰہ الا اللہ اس درجہ کا ہوگا کہ انبیاء اور ملائکہ بھی نہیں پہچان سکیں گے۔ کہ اس کے اندر ایمان ہے مگر حق تعالیٰ پہچان لیں گے کہ اس کے اندر ایمان کی رمق ہے۔ چنانچہ وہ حدیث جس میں آیا ہے کہ اہلِ جہنم کی شفاعت کر کے ان کو جہنم سے نکالا جائے گا تو لاکھوں اور کروڑوں آدمی جہنم سے نکلیں گے۔ اور انبیاء اور ملائکہ دوزخ میں اندر جا جا کر نکالیں گے اور حق تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جائے گا کہ جس میں ذرہ بھر بھی ایمان دیکھو اسے نکال لو۔ پھر فرمائیں گے کہ جس کے اندر معمولی ذرہ برابر بھی ایمان دیکھو اُسے بھی نکال لو۔ ادنیٰ ادنیٰ حَبَّۃِ خردل۔ پھر فرمائیں گے کہ جس کے اندر رائی کے ادنیٰ برابر ایمان ہو اُسے بھی نکالو تو ان کو بھی نکالیں گے۔ اب ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام مطمئن ہو جائیں گے کہ اب کوئی اہل جنت میں سے جہنم میں باقی نہیں رہا اِس

اسوقت حق تعالیٰ فرمائیں گے۔ کہ شفاعۃ النبیون و شفاعۃ الملائکۃ وما بقی الرحمٰن۔ نبیوں نے شفاعت کر لی۔ اور ملائکہ نے بھی شفاعت کر لی اب رحمٰن باقی ہے کہ وہ خود اپنی بارگاہ میں شفاعت کرے۔

تو حق تعالیٰ کی پل بھر رحمت ہوگی پھر اربوں، کھربوں دوزخ سے نکلیں گے یہ وہ لوگ ہوں گے کہ ان کے دلوں میں لا الٰہ الا اللہ کی کوئی رمق ہوگی جس کو نہ انبیاء پہچان سکے اور نہ ملائکہ پہچان سکے۔ صرف حق تعالیٰ ہی جانیں گے کہ ان کے اندر کچھ ایمان کی رمق ہے تو ایمان کے اتنے درجات ہیں کہ بعض کو انبیاء اور ملائکہ بھی نہیں پہچانیں گے۔ صرف حق تعالیٰ ہی پہچانیں گے کہ کس درجہ کا ایمان ہے۔

ملکانہ راجپوت کا اسلام

میرے والد صاحب مرحوم مشکوٰۃ شریف پڑھا رہے تھے جب یہ حدیث آئی تو میں نے کہا کہ دنیا میں کوئی ایسی نظیر بھی موجود ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ اسکے ایمان کو نہ پہچانتے ہوں اور صرف حق تعالیٰ ہی پہچانتے ہوں۔

انھوں نے فرمایا کہ ملکانہ راجپوتوں کو دیکھ لو یہ ملکانہ راجپوت جو آگرہ کے قریب آباد ہیں ان کے سارے کام ہندوانہ ہیں۔ جوڑا باندھیں۔ سر پہ چوٹی رکھیں چوکا لگائیں۔ گوبر سے لیپ کر روٹی پکا دیں اور چھری رکھی ہوئی ہے کہ تین سو برس پہلے گرداس پر کچھ پڑھ گئے تھے اسی سے جانور ذبح کئے جاتے ہیں آگے نہ ان کو اللہ کی خبر نہ رسول کی خبر، اگر ان سے پوچھو تم کون ہو تو کہتے ہیں مسلمان۔ کیا معنی مسلمان کے۔ ان کو خود بھی پتہ نہیں۔ فرمایا کہ یہ صاف نظیر موجود ہے اگر ہزاروں علماء اور مفتی جمع ہو جائیں ان کے اسلام کو نہیں پہچان سکتے ہیں مگر اللہ جانتا ہے کہ کچھ اسلام کی رمق ہے ورنہ وہ کیوں دعوی کرتے کہ ہم مسلمان ہیں تو یہ دنیا کی نظیر ہے۔ بعض تو ایسے مخفی ایمان والے ہوں گے جن کو حق تعالیٰ ہی پہچان سکتے

ہیں کہ اس کے اندر ایمان ہے۔

ان کو دوزخ سے نکالیں گے اور ان گنت مخلوق نکلے گی جہنم سے۔ اب گویا جہنم خالی ہو جائے گی۔ اہلِ ایمان سے۔ صرف اہلِ کفر رہ جائیں گے۔ گنہگار مسلمانوں کو جب جنت میں داخل کیا جائے گا تو ان کے گلے میں تختیاں لٹکا دی جائیں گی اور اس پر لکھا ہو گا۔ هٰؤُلَآءِ عُتَقَاءُ الرَّحْمٰنِ۔ یہ اللہ کے آزاد کردہ بندے ہیں۔ ان کو اہلِ جنت دیکھ کر کہیں گے۔ هٰؤُلَآءِ اَهْلُ النَّارِ کہ یہ لوگ جہنمی ہیں یہ معاملہ کافی دنوں تک چلے گا۔ لیکن ان کو غیرت آئیگی تو وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ اے اللہ! جب آپ نے اپنی رحمت سے مقامِ کریم سے داخل کر دیا ہے تو یہ عار بھی ہمارے اوپر سے اُٹھا دیجئے۔ پھر وہ تختیاں نکال دی جائیں گی۔ اور وہ عام اہلِ جنت میں شامل ہو جائیں گے۔

ایمان کے درجات

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ایک باب قائم کیا۔ کُفْرٌ دُوْنَ کُفْرٍ اِیْمَانٌ دُوْنَ اِیْمَانٍ۔ ایمان کے درجات ہیں اعلیٰ ادنیٰ اور کم سے کم۔ اسی طرح کفر کے بھی درجات ہیں۔ اعلیٰ، ادنیٰ اور کم سے کم۔ بعض کو تو صرف حق تعالیٰ ہی پہچان سکتے ہیں۔ مگر ان کا نام موحد ہی ہے ان کو کافر نہیں کہیں گے۔ جس قدر بدعملیاں ہیں یہ سب کُفر کے شعبے ہیں کُفر ایک پھیلاؤ ہے۔ اس کے ماتحت لاکھوں بدعملی کی جزئیات چھپی ہوئی ہیں۔

اسی طرح ایمان ایک پھیلاؤ ہے۔ ساری نیکیاں اس کے ماتحت آئی ہوئی ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو "بِر اور تقوٰی" سے تعبیر کیا گیا ہے اور بدعملی کو اِثم اور عُدْوَان سے تعبیر کیا گیا ہے کہ بعض چیزیں بِر اور تقوی کی ہیں اور بعض چیزیں اثم اور عُدوان ہیں۔ بِر اور تقوٰی کے بہت مراتب ہیں کوئی بہت اعلیٰ اور کوئی اس سے کم، اور کوئی بالکل گرا ہوا۔

اسی طرح سے عدوان اور گناہ کے بھی مراتب ہیں کہ بعض بہت بڑے، اور بعض بیچ کے درجے کے۔ اور بعض بہت ہلکے۔ بعض روایتوں میں جو فرمایا گیا ہے مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ یعنی جس نے قصداً نماز چھوڑی اس نے کفر کیا۔ اب یہاں پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ بدعملی سے مسلمان کافر بن جاتا ہے حالانکہ بدعملی سے مسلمان کافر نہیں بنتا تو یہ کیسے فرمایا گیا فَقَدْ كَفَرَ

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک معنیٰ یہ ہے کہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ فصار کافراً جس نے قصداً نماز ترک کردی وہ کافر ہوگیا تو یہ نہیں کہا گیا بلکہ فقد کفر کہا گیا یعنی اس نے کفر کی حرکت کی۔ ایک مسلم جتنی بھی بدعملیاں کرے گا تو کہا جائیگا کہ کافر کی سی حرکت کر رہا ہے مگر کافر نہیں کہیں گے یا ایک کافر سینکڑوں نیک کام کرتا ہے تو کہا جائے گا کہ اسلام کا کام انجام دے رہا ہے۔ مگر لفظ مسلم اس کے لیے نہیں بولیں گے۔ مسلم اس وقت کہیں گے جب اس کے عقائد اور فکر سب اسلام کے تابع ہوجائیں۔ اور جب تک عقیدہ اور فکر میں تبدیلی نہیں آتی ہے کہیں گے کہ اسلامی بات کی۔ اسی طرح مسلم اگر بدعملی کرتا ہے تو کہیں گے کہ کافرانہ حرکت کر رہا ہے۔ مگر کافر نہیں کہیں گے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی طالب علم اپنے کپڑے دھونے لگے تو یوں کہیں گے کہ کپڑے دھو رہا ہے مگر اس کو دھوبی نہیں کہیں گے کہ دھوبی بن گیا تو دھوبی بن جانا علامت ہے اس پیشے کو اختیار کرنے کی۔ جس کی وجہ سے دھوبی کہلاتا ہے تو ایک ہے دھوبی بن جانا اور ایک ہے دھوبیوں کا کام کرنا۔

اسی طرح ایک ہے کافر بن جانا اور ایک ہے کفر کی حرکات کرنا تو کافر ایمان کی حرکت کر سکتا ہے اور مسلم کفر کی حرکت کر سکتا ہے حدیث کا مطلب یہی ہے۔

ایمان خوف اور اُمید کے درمیان کا نام ہے

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ نے فرمایا کہ مرجیہ کا ایک فرقہ ہے اس کے ہاں نجات ہی نجات ہے بس کلمہ پڑھ لیا جنتی ہوگیا۔ انھوں نے رجا کی صرف ایک حدیث لے لی حالانکہ پچاسوں حدیثیں ہیں جو اس کی تشریح کر رہی ہیں۔ ان سے قطع نظر کرلی۔ تو بعضے مرجئین گئے اور بعضے بالکل آئسہ بن گئے کہ اگر عمل نہیں کرے گا تو وہ جہنمی ہے اس پر جہنم واجب ہے تو وہ مایوس ہوکر بیٹھ گئے تو شرعاً نہ اتنی رجا مطلوب ہے اور نہ اتنی مایوسی مطلوب ہے اس سے بچایا گیا۔

ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس مت ہو۔ تو اس میں رجاء سکھلائی گئی ہے کہ امید رکھو اور دوسری جگہ فرمایا گیا۔ وَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ؕ

یعنی اللہ تعالیٰ کی جو خفیہ تدبیر ہے اس سے غافل مت ہو۔ معلوم نہیں انجام کیا ہوتا ہے۔ ڈرتے رہو تو اس میں ڈر بتلایا گیا تو ایمان اس خوف و امید کے درمیان کا نام ہے۔ نہ محض اُمیدیں باندھنے کا نام ایمان ہے اور نہ مایوس ہو جانے کا نام ایمان ہے۔ خوف بھی ہو اور امید بھی ہو۔ دونوں چیزیں لگی ہوئی ہوں تب ایمان بنتا ہے۔

تو اس قسم کی روایات دوسری قسم کی روایات سے کاٹ کر بعض تو بن گئے مرجیہ اور بعض بن گئے آئسہ۔ ایک امید میں پڑ گئے ایک مایوسی میں مبتلا ہو گئے یہ دونوں ہی راستے اسلام کے نہیں ہیں بلکہ ساری روایات کو دیکھ کر مجموعہ نکالا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایمان رجا اور خوف کے درمیان میں ہے اس لیے کہ جو غلام ہر وقت امید ہی میں لگا ہو۔ وہ معطل ہو جائے گا وہ تو یہ کہے گا۔

کہ آقا رحیم وکریم ہے معاف ہی کر دے گا۔ ہم کچھ بھی کریں تو جو امید میں غرق ہے وہ کبھی کام نہیں کرے گا۔

اور جو مایوس ہے وہ بھی کام نہیں کرے گا اور کہے گا کہ میں کتنا ہی کرلوں آقا کی جوتیاں ہی پڑیں گیں تو محنت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ کام وہی کرے گا جس کو ایک طرف امید لگی ہوئی ہو کہ تنخواہ بھی ملے گی۔ انعامات بھی ملیں گے۔ اور ایک طرف ڈر بھی لگا ہوا ہے کہ اگر میں نہ کروں گا تو میرا انجام کیا ہوگا۔ تو وہی آدمی کام کرے گا۔ کیونکہ ایمان چاہتا ہے کہ عمل کرو اس لیے ایمان کا بین بین راستہ رکھا گیا ہے تاکہ عمل کریں۔ اسی لیے شریعت نے ہر چیز میں اعتدال کو پسند کیا ہے زیادہ خوف سے بھی روکا گیا ہے اس میں بھی اعتدال ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَشْیَتَکَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنِیْ وَبَیْنَ مَعَاصِیْ

اے اللہ! میں آپ کا خوف چاہتا ہے مگر اتنا کہ میرے اور میرے گناہ کے درمیان وہ حائل ہو جائے اتنا خوف نہیں چاہتا ہوں کہ مایوس ہو کر بیٹھ جاؤں صرف اتنا خوف چاہتا ہوں کہ گناہوں سے بچ جاؤں۔

اور اتنی امید بھی نہیں چاہتا کہ بدعمل بن جاؤں اور عمل سے دست کش ہو کر بیٹھ رہوں جس کو ایک دعا میں آپ نے فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ کُلِّ عَمَلٍ یُخْزِیْنِیْ وَمِنْ کُلِّ عَمَلٍ یُلْھِیْنِیْ

اے اللہ! میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں ہر ایسے عمل سے جو مجھے رسوا کردے اور ایسے عمل سے جو مجھے لہو ولعب میں مبتلا کردے۔

یعنی میں ایسی امید نہیں چاہتا کہ جو لہو ولعب وہیں ڈال دے اور عمل سے معطل کردے۔ بلکہ میں آپ سے ایسی امید چاہتا ہوں جو عمل کی آمادگی پیدا کرے

توشریعت نے مطلق خوف سے بھی بچایا ہے اور مُطلق رجا (اُمید) سے بھی بچایا ہے۔ بین بین ایمان کو رکھا ہے۔ یہی ہے صراطِ مستقیم جو بال سے زیادہ باریک ہے اور تلوار سے زیادہ تیز۔ ذرا ادھر ہوا تو جہنم میں گیا۔

اسی لیئے شریعت کو صورتِ مثالی پُل صراط کی دی گئی ہے اور اس کی شان بیان کی گئی ہے کہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز۔ یہ علامت ہے استقامت کی۔ اتنا سیدھا راستہ ہے کہ اس کے عرض میں ٹیڑھا پن ہے ہی نہیں بالکل سیدھا راستہ ہے اس کو استقامت سے تعبیر کیا گیا ہے اور چونکہ نازک مرحلہ ہے ذرا سی غلطی ہوئی نیچے گرا۔ اس کو کہا تلوار سے زیادہ تیز۔ تو دنیا میں جو لوگ صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں وہ گویا پُل صراط کو طے کر رہے ہیں۔

مجلس نمبر ۱۷

۲۵ صفر المظفر ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۹۷۵ء

ہر انسان محض اپنی عبادت سے جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ فضلِ خداوندی شاملِ حال نہ ہو

سوال:۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت جب ہم جنت کی باتیں سنتے ہیں تو بے خوف ہو جاتے ہیں اور اس قدر امید ہو جاتی ہے کہ انشاء اللہ بخش دیئے جائیں گے۔ اور جب وعیدات کی حدیثیں سننے میں آتی ہیں تو دل لرزتا ہے اور گھبراہٹ ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ وہاں پر بڑے سے بڑا عمل بھی کار آمد نہ ہوگا۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ آدمی کتنا ہی عمل کرے مگر نجات فضل ہی سے ہوگی۔ کیوں کہ عمل سے حق کی ادائیگی نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ کے حقوق لامحدود ہیں اور ہمارے اعمال محدود ہیں اگر آدمی کتنی بڑی زندگی پائے اور عمل کرتا رہے تو پھر بھی حق نہیں ادا کر سکتا۔ اسی کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا لَا یُنْجِی اَحَدَکُمْ عَمَلُکُمْ تم میں سے کسی کو تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ جب تک فضلِ خداوندی اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہو۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلا سکتا۔ آپ نے فرمایا لَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلا سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنا فضل نہ فرمائیں اور اپنی رحمت میں ڈھانپ نہ لیں تو حقیقت یہی ہے کہ نجات کا تعلق فضل ہی سے ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی فضل

پر اعتماد کر کے عمل ہی کو چھوڑ دے کہ فضل ہو ہی جائے گا۔ خبر کیا ہے کہ فضل ہو ہی جائے گا کیونکہ فضل جب ہو کہ متعین ہو جائے کہ یقیناً فضل ہو ہی جائے گا۔

دوسری طرف اگر مایوس ہو کر عمل ہی چھوڑ دے یہ غلط ہے یہ فضل ہی ہوتا ہے کہ جب ادھر سے فضل ہوتا ہے تو بندہ عمل کرنا شروع کر دیتا ہے تو فضل یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عمل کر رہا ہے تو فضل متوجہ ہے لہذا بندہ مایوس نہ ہو مگر نجات کا تعلق فضل ہی سے ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک عابد کی عبرتناک حکایت

شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے یہ روایت کتاب الآخرۃ میں لکھی ہے یہ فضل کے بارے میں ہے کہ امم سابقہ میں ایک شخص بہت ہی بڑا عبادت گزار زاہد اور عابد تھا۔ سارے کام چھوڑ کر ہر وقت عبادت میں لگا رہتا تھا۔ لیکن بیوی بچوں کا مسئلہ بھی سامنے تھا اس کی خواہش ہوئی کہ ان تمام جھگڑوں کو چھوڑ کر ہر وقت عبادت میں مشغول رہے اس نے بیوی کو الگ کیا کہ ساری جائیداد دے دلا کر سمندر کے وسط میں ایک ٹیلہ تھا وہاں پر آکر کٹی ڈال دیا۔ اور ہمہ وقت عبادت میں مشغول ہو گیا۔

حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اسی کڑوے سمندر سے ایک میٹھا چشمہ جاری کر دیا۔ ایک نالی سے ٹھنڈا پانی نکلنے لگا اور ایک انار کا درخت اُگا دیا اس عابد کا کام یہ تھا کہ روزانہ ایک انار کھا لیتا اور ایک کٹورا پانی پی لیتا اور عبادت میں مشغول ہو جاتا۔ یعنی رات و دن عبادت ہی میں مشغول رہتا۔ اسی طرح اس نے پانچ سو برس خالص و مخلص عبادت کیا۔ جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ مجھے سجدے کی حالت میں وفات دیجئے تاکہ میں عبادت ہی میں ختم ہو جاؤں اور یہ بھی درخواست کیا کہ میرے بدن کو

آپ قیامت تک سجدے کی حالت میں محفوظ رکھیں تاکہ میں قیامت کے دن صورتاً بھی سجدہ گذار اٹھوں اللہ تعالیٰ نے اُن کی دونوں درخواستوں کو منظور فرمالی ان کی وفات ہوئی۔ اور اسی حالت میں بدن کو محفوظ فرمایا۔

مؤرخین ارشاد فرماتے ہیں کہ اب بھی وہ محفوظ ہے لیکن وہاں پر اللہ تعالےٰ نے ایسے گنجان درخت اُگا دیئے ہیں کہ لوگ ہیبت زدہ ہیں وہاں پر جاتے نہیں۔ بہر حال انتقال کے بعد اسی حالت میں حق تعالیٰ کے سامنے اسی کی پیشی ہوئی یا قیامت کے دن ہوگی۔

حدیث دونوں کلموں کو عام ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ بندہ میں نے اپنے فضل و کرم سے تجھے بخشدیا اور مقام کریم عنایت کیا تو جنت میں جا۔

اس عابد کے دل میں ایک وسوسہ گذرے گا کہ پانچ سو برس ہم نے خالص عبادت کیا مگر اب بھی اپنے فضل ہی سے بخش رہے ہیں کم سے کم دلداری کے لیے یہی فرما دیتے کہ ہم نے تیری عبادت کے بدلے میں جنت دیا تو میں خوش ہوجاتا کہ محنت ٹھکانے لگی۔ اب اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے عبادت ہی نہیں کیا صرف فضل ہی سے بخشا گیا۔ یہ وسوسہ عابد کے دل میں آیا۔ اللہ تعالیٰ تو عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہیں۔

یعنی لوگوں کے دلوں کی کھٹک کو بھی جانتے ہیں۔ ملائکہ سے فرمائیں گے اس کو دوزخ میں ڈالنا نہیں ہے البتہ لے جاؤ اتنی دُور اس کو کھڑا کرو جہنم پانچ سو برس کا راستہ وہاں سے ہو۔ ملائکہ اس کو اس جگہ پر لے گئے۔ جب وہ مقام پر پہنچا تو جہنم سے ایک لپٹ آئی اور ایک دم۔ سر سے پیر تک خشک ہوگیا اور اس نے پیاس پیاس چلانا شروع کیا تو غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اسمیں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ عابد نے عرض کیا کہ یہ مجھے دیدو تو آواز آئی

کہ یہ پانی قیمت سے ملے گا۔ عابد نے کہا کہ اس کی قیمت کیا ہے تو کہا گیا کہ جس نے پانچ سو برس خالص عبادت کی ہو اگر وہ اس کے بدلے میں لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ عابد نے کہا کہ وہ میرے پاس ہے لے لو۔ اس کو پانی کا کٹورا دیا وہ پیا اور جان بچی پھر حق تعالیٰ کا حکم ہوا کہ اس کو واپس لاؤ۔ فرشتے واپس لے گئے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بندے تیری پانچ سو برس کی عبادت کے صلے سے ہم نے ادا ہو گئے۔ اور وہ تیرا ہی تجویز کردہ تھا کہ پانچ سو برس کی عبادت کے بدلے خوشی سے ایک کٹورا پانی پر راضی ہو گیا اور وہ دیدیا گیا۔ اب معاملہ برابر سرابر ہو گیا۔ اب حساب دے تو کتنی عبادت دنیا سے لے کر آیا ہے۔ جو تجھے روز ایک انار دیتے تھے۔ اس کے ہر دانے کا حساب دو۔ اس کے بدلے میں کتنی عبادت لے کر آئے ہو اور پانی کے لاکھوں پیالے تم نے پیا ہے ایک ایک قطرہ کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا عبادت کر کے لائے ہو اور ہم نے جو آنکھوں میں نور نگاہ بخشا تھا۔ اس کا ایک ایک تار تھا کہ تو اس سے دنیا کی چیزوں کو دیکھتا تھا۔ اس کے ہر تار کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا عبادت کر کے لایا ہے اور ہم نے جو سانس کی نعمت دی تھی جس سے تو زندگی گزار رہا تھا ہر ہر سانس کا حساب دے اس کے بدلے میں کیا عبادت کر کے لایا ہے۔

یہ سنکر عابد تھرا گیا اور عرض کیا کہ اے اللہ! بیشک آپ کے فضل ہی سے نجات ہے کسی کے عمل سے نہیں پھر وہ اس مقام پر پہنچے جس مقام پر پہنچنا تھا حقیقت یہ ہے کہ انسان خواہ پانچ ہزار برس عمل کرے مگر فضل ہی کام دے گا محض عمل کام نہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول کر لیں تو سب سے بڑی نعمت ہے اگر اس کو عمل کہہ دیں تو یہ بھی بڑی نعمت ہے یہ تو عمل کی صورت دی گئی ہے۔

بہرحال کامیاب زندگی وہ ہے جو خوف و رضا کے درمیان گزاری جائے تو عمر تو گذاری جائے خوف میں اور اخیر عمر میں رضا کا غلبہ ہونا چاہیئے تاکہ اس بندے اور شوق پیدا ہو۔

اسلیئے فرمایا گیا ہے کہ جو قوم پائے گی اپنے حسن ظن کی بنا پر پائے گی اللہ تعالیٰ سے جیسا ہی جس کا حسن ظن ہوگا ویسا ہی وہ پائے گا۔ اور جو مایوس ہیں ان کے سامنے وہی مایوسی ہی آئے گی۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ۔

اور کفّار کے بارے میں فرمایا گیا ذٰلِکُمْ ظَنُّکُمُ الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّکُمْ.... اَرْدٰکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ہ یعنی یہ تمہاری بدگمانی ہے جو تم نے اللہ تعالیٰ سے باندھی تھی۔ اسی نے تم کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔

مجلس نمبر ۱۸

۲۶ رصفر ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۰ رمارچ ۱۹۷۵ء

کلام اللہ کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے پر امام ابن حنبلؒ کا واقعہ اور شیخ عبدالعزیزؒ مکی کا معتزلہ سے مناظرہ

سوال: ایک مجلس میں حضور والا نے کلام اللہ کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے پر شیخ عبدالعزیزؒ مکی کے معتزلہ سے مناظرہ کا تذکرہ فرمایا تھا۔ ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ اس مضمون کو دوبارہ ارشاد فرمائیں۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ پرانے زمانے میں ایک کتاب چھپی تھی جس کا نام کتاب الحیدہ ہے۔ یہ کتاب مصر میں چھپی تھی اس میں حضرت شیخ عبدالعزیز کا معتزلہ سے مناظرہ تفصیل سے لکھا ہوا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ معتزلہ نے خلق قرآن کا مسئلہ ایک فتنے کی صورت میں اُٹھایا ان کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم مخلوق ہے اور اہل سنت والجماعت کا دعویٰ یہ تھا کہ کلام اللہ مخلوق نہیں ہے بلکہ ذات سے صادر ہوتی ہے۔ مثلاً میں یہ کلام کروں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ خَلَقْتُ کَلَامِیْ میں نے کلام کو پیدا کیا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ تَکَلَّمْتُ یعنی میں کلام کر رہا ہوں مجھ سے کلام سرزد ہو رہا ہے تو کلام متکلم کی مخلوق نہیں ہوتا۔ بلکہ متکلم سے صادر ہوتا ہے اسی طرح کلامِ خداوندی صفت قدیمہ ہے ازل سے لے کر ابد تک وہ ذاتِ حق کے ساتھ قائم ہے۔ اس کو متکلمین کلام نفسی کہتے ہیں۔ یعنی وہ ہر وقت ذاتِ حق کے ساتھ موجود ہے اور کلام لفظی یہ سرزد ہوتا ہے تو کلام کرنے سے یہ ظہور ہو گا اس کلام نفسی کا۔

اور ایک حدیث سے بھی اسی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بارے میں ارشاد فرمایا تَبَرَّکُوا بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّہٗ کَلَامُ اللّٰہِ وَخَرَجَ مِنْہُ۔ کلام سے برکت حاصل کرو اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے تو ظاہر ہے کہ جو چیز ذات بابرکات کے اندر سے نکل کر آئے گی وہ مخلوق نہیں ہوگی۔ مخلوق تو ایک بیرونی اور معدوم چیز ہوتی ہے اس پر وجود کا پرتو ڈال دیا وہ پیدا ہوگئی لیکن حق تعالیٰ کی ذات تو وجود ہے وہاں عدم کا نشان بھی نہیں۔

لہٰذا ان کے اندر سے جو چیز نکلے گی وہ وجود ہوگی وہاں پر عدم کا سوال ہی نہیں۔ لہٰذا ان کے اندر سے جو چیز نکلے گی وہ خود وجود ہوگی عدم نہیں۔ اسلیئے فرمایا گیا فَاِنَّہٗ کَلَامُ اللّٰہِ وَخَرَجَ مِنْہُ کلام تو اندر کا جذبہ ہوتا ہے اس کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ الفاظ فانی ہوتے ہیں یا باقی رہتے ہیں حضرت حکیم الاسلام نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اس کی دو سرے ہیں ایک تو منجانب اللہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ مسئلہ خود متکلمین میں زیر بحث ہے کہ کلام اللہ محلِ حوادث ہے یا نہیں تو حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ محلِ حوادث ہے اور بعض کہتے ہیں کہ محلِ حوادث نہیں ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ صفتِ قدیمہ ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کے تعلقات حادث ہیں تو جو اللہ تعالیٰ آپ کو مخاطب کر کے کلام فرماتے ہیں وہ کلام آپ کی نسبت سے حادث ہوگا۔ لیکن صفت قدیمہ کے لحاظ سے وہ قدیم ہوگا تو اس سے کلام کے اندرونی ہونے میں فرق نہیں پڑتا۔

بہر حال حق تعالیٰ کا کلام مخلوق نہیں ہے بلکہ اُن سے صادر ہوتا ہے جیسے

تخلیق کی صفت ایک ازلی اور ابدی ہے جو قائم بالذات ہے اور ایک اس کے روابط ہیں یہ مخلوق ہوا تو صفت تخلیق اس کے ساتھ متعلق ہو گئی تو یہ روابط حادث ہیں لیکن اصل صفت حق کے ساتھ قائم ہے۔

یہی صورت کلام کی ہے اسی لیے اہلِ حق کا دعویٰ ہے کہ کلام اللہ مخلوق نہیں ہے بلکہ صادر من اللہ ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ مخلوق ہے اللہ تعالیٰ اسکو پیدا کرتا ہے وہ پیدا ہو گیا تو یہ بحث اہل سنت والجماعت اور معتزلہ کے درمیان میں چلی اور خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں معتزلہ غالب ہو گئے اور چھا گئے یہاں تک کہ مامون خود ہی معتزلی بن گیا۔ اور اس کا اس قدر غلبہ ہوا کہ بادشاہ وقت نے اس کو حیات و ممات کا مدار قرار دیدیا کہ جو عالم کلام اللہ کے مخلوق ہونے کا اقرار کرے وہ باقی رہے ورنہ اس کو قتل کر دے۔ ہزاروں علماء قتل ہو گئے۔

امام احمد ابن حنبلؒ کا واقعہ جب یہ مسئلہ اُٹھا تو امام احمد بن حنبلؒ نے حق کا اعلان کیا یہ زمانہ مامون رشید کا تھا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ کلام اللہ مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ صادر من اللہ ہے اس پر امام صاحب کو جیل بھیجا گیا اور جیل میں بڑے بڑے مظالم ان پر کئے گئے یہاں تک کہ روزانہ اسی کوڑے مارے جاتے تھے کپڑے نکلوا دیتے تھے اور اسی کوڑے مارتے تھے آپ کا بدن لہولہان ہو جاتا۔ اگلے دن پھر اسی طرح سے کیا جاتا۔ اسی طرح جیل میں ایک عرصہ گذر گیا۔

اور امامؒ کی شان یہ تھی کہ جب پہلا کوڑا پڑتا تو آپ کہتے بسم اللہ اور جب دوسرا کوڑا پڑتا تو کہتے اللہ اکبر اور جب تیسرا کوڑا پڑتا تو فرماتے القرآن کلام اللہ۔ غیر مخلوق، غیر مخلوق۔ اور یہ کہتے کہتے بے ہوش ہو جاتے۔

ایک دن لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت آپ روزانہ جیل میں مصیبت اُٹھا رہے ہیں اور تعلیم و تدریس و افادہ کا بالکل کام بند ہو گیا ہے اور فیضان ختم ہو گیا۔ آپ کوئی لفظ ذومعنیٰ بطور توریہ کے فرمادیں تاکہ یہ مصیبت دور ہو جائے اور تعلیم دین کا سلسلہ پھر چالو ہو جائے۔

امام صاحب نے فرمایا کہ جیل کے باہر جا کر دیکھو کیا ہو رہا ہے جب وہ لوگ باہر گئے تو دیکھا لاکھوں آدمی قلم دوات لیئے ہوئے جیل کے اردگرد پڑے ہوئے ہیں کہ جو امام صاحب فرمائیں گے۔ ہم اسی کو اپنا مذہب بنائیں گے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں توریہ کر کے جان بچالوں تو یہ سمجھ جائیں گے کہ کلام اللہ کے غیر مخلوق ہونے کا میں نے اقرار کر لیا ہے تو میری جان تو بچ جائے گی۔ لیکن لاکھوں کا ایمان چلا جائے۔ اور میری جان اتنی عزیز نہیں ہے جتنا ان کا ایمان عزیز ہے تو میں اپنی جان کی وجہ سے ان کا ایمان کیسے خراب کروں گا۔

بالآخر وہ کوڑے کھاتے رہے لیکن مدت کے بعد جب خود مامون الرشید تائب ہوا تو وہ جیل سے چھوٹ گئے۔ اور پھر تعلیم و تعلّم کے مسئلے میں لگ گئے۔ اور بعد میں آپ کا انتقال ہوا۔

بعض بزرگوں نے آپ کو خواب میں دیکھا تو معلوم کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا آپ نے فرمایا کہ عرش کے سامنے ایک کرسی بچھائی گئی اور مجھ کو اس پر بٹھایا گیا اور فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ ان کے اوپر قیامت تک موتی نچھاور کرتے رہو اور یہ فرمایا گیا کہ اے احمد! میری وجہ سے تم اپنے منہ پر سینکڑوں کوڑے کھائے اب تمہارے لیے قیامت تک ہمارا چہرہ تمہارے لیے مباح ہے۔ اسکی لذت حاصل کرتے رہو اور دیدار کرتے رہو

شیخ عبدالعزیز مکیؒ کا واقعہ اور معتزلہ سے مناظرہ

حضرت شیخ عبدالعزیز مکیؒ

یہ بہت بڑے عالم اور عارف باللہ تھے انھوں نے ارادہ کیا کہ کم سے کم میں ایک مرتبہ مامون رشید کے سامنے کلمۂ حق تو واضح کر دوں اور اس سے جاکر یہ کہوں کہ تم نے ہزاروں علماء کو قتل کرادیا اور اس مسئلے کو لوگوں کی حیات و ممات کا ذریعہ قرار دیدیا ہے حالانکہ قرآن و حدیث کسی میں بھی اس کو قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اگر کوئی توحید کا انکار کرے تو واجب القتل ہے۔ اسی طرح جو عقائد حقہ ہیں اگر ان کا کوئی انکار کرے وہ بھی واجب القتل ہے۔ لیکن یہ کہاں ہے کہ اگر خلق قرآن کا اقرار کرو تو خیریت ہے ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے۔

یہ ان کا مقصد تھا اس کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ترکیب یہ کی کہ اپنے بیٹے سے یہ فرمایا کہ جامع مسجد میں جہاں لاکھوں مسلمان نماز پڑھنے آتے ہیں میں کھڑے ہو کر اعلان کروں گا تم اس پر کھڑے ہو جانا اور سوال کرنا کہ مَاقَوْلُكُمْ فِيْ خَلْقِ الْقُرْآن۔

یعنی خلق قرآن کے بارے میں تمہارا کیا قول ہے اس پر میں تقریر کروں گا تو یقیناً میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ پھر مجھے مامون کے دربار میں پیش کیا جائیگا تو وہاں پر مامون کے سامنے مجھے کلمۂ حق کے اعلان کا موقع ملے گا۔

شیخ نے مامون تک پہنچنے کا یہ ذریعہ بنایا چنانچہ دونوں حضرات مکے سے چلے اور اسی ترتیب کے مطابق جامع مسجد میں نماز کے بعد اعلان کیا گیا کہ شیخ عبدالعزیز مکیؒ سے کچھ سوالات کئے جائیں گے۔ لوگ ٹھہر گئے صاحب زادے نے کھڑے ہو کر سوال کیا کہ خلق قرآن کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز مکیؒ نے ایک زوردار تقریر کی اور فرمایا کہ یہ قطعاً مخلوق

نہیں ہے بلکہ صادر من اللہ ہے اور یہ لوگ جو خلق قرآن کا دعویٰ کر رہے ہیں بالکل جھوٹے ہیں اور دین پر تہمت اور افتراء باندھ رہے ہیں۔ جب تقریر پوری ہو گئی تو پولیس پہنچ گئی اور ان کو گرفتار کر لیا اور لوگوں میں بھگدڑ پڑ گئی لوگ بھاگ گئے اور ان کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیئے۔ وہاں کا جیلر جو تھا وہ فی الجملہ کچھ دیندار تھا۔ وہ شیخ عبدالعزیز مکی سے آ کر ملا اور کہا کہ کیوں اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہو ابھی مثل میرے ہاتھ میں ہے اس میں کچھ ردّ و بدل کر سکتا ہوں آپ مکے جاؤ اس جھگڑے میں کیوں پڑ رہے ہو۔

شیخ عبدالعزیز مکی نے فرمایا کہ میں آیا ہی ہوں اسی غرض سے کہ کلمۂ حق کا اعلان کروں اس کے بعد جیلر سے ان سے کچھ بحث کیا شیخ نے اس کے جوابات دیئے اس نے حق کا اقرار کیا اور کہا کہ مجھے پہلے ہی سے ہمدردی تھی اور اب اور زیادہ ہمدردی ہو گئی۔

لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کچھ توریہ وغیرہ استعمال کر کے نکل جائیں میں خود نمٹ لوں گا۔ مگر شیخ عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہی ہوں کہ مامون کے دربار میں پہنچوں۔ اور اسی گرفتاری کی حالت میں۔ اس نے کہا کہ خیر! اس کو آپ جانیں یہ اسی طرح گرفتار رہے۔ اور مامون تک یہ بات پہنچائی گئی۔ جیلر نے مامون کو آمادہ کیا کہ شیخ عبدالعزیز بہت بڑے عالم ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ انھیں دربار میں طلب کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اسی مسئلے کو پوری طرح سمجھوں اور سمجھاؤں میری رائے یہی ہے کہ آپ معتزلہ کے علماء کو جمع کریں اور پورا دربار لگے اور اس میں شیخ عبدالعزیز مکی کو بلایا جائے مامون نے اس مشورہ کو تسلیم کر لیا اور تاریخ متعین کر دی۔ جب وہ تاریخ آئی تو شیخ عبدالعزیزؒ کو ایسے مکان میں بٹھایا گیا جو لب سڑک تھا اور وہ سڑک شاہی

دربار میں جاتی تھی اور یہ ترکیب اس لیے کی گئی کہ دربار میں جانے والے کرّوفر و رُعب کے ساتھ اسی سڑک سے جائیں گے۔ یہ منظر دیکھ کر شیخ عبدالعزیزؒ پر رُعب طاری ہوجائے۔ اور اپنے خیال سے رُک جائیں۔

جب وقت آیا تو سب سے پہلے اسی راستے سے فوجی دستے گذرے تلواریں لٹکی ہوئی سونے اور چاندی کے ان کے حلقے تھے گویا بڑے چمک دمک کے ساتھ ایک لشکر گذرا اور شیخ پر یہ اثر ڈالنا تھا کہ ان سب کی موجودگی میں تم کو کلام کرنا پڑے گا یہ نہیں کہ چند آدمیوں کے سامنے تم نے مسئلہ بیان کردیا اس کے بعد ایک سُبل ملازمین کا دستہ گذرا وہ بھی زرق و برق تھے اس کے بعد علماء کی جماعت گذری ان کے جُبّے و عمامے سبز تھے وہ بھی ایک شان کے ساتھ گذرے اس کے بعد عمائد شہر کے دستے گذرے گویا ڈیڑھ دو گھنٹے اسی طرح سے لوگ گذرتے رہے اور مقصد یہ تھا کہ ان سب کی موجودگی میں تم کو کلام کرنا ہے مگر شیخ کا عزم مضبوط ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ وقت آیا اور پولیس پہنچی اور کہا کہ امیرالمومنین کے دربار میں آپ کی حاضری ہے۔ ان کو اسی قیدی کی حالت میں دربار میں لے جایا گیا۔

شاہی محل کے ارد گرد سات شہر بنائے گئے اور ہر ہر شہر پناہ کے درمیان بڑی بڑی کوٹھی اور محلات اور وسیع میدان تھے۔

جب شیخ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ غلاموں کی ایک قطار ننگی تلوار لئے ہوئے کھڑی ہے اور شیخ عبدالعزیز سے کہا گیا کہ خلیفۃ المومنین کی یہ پہلی ڈیوڑھی ہے یہاں پر دو رکعت نماز پڑھیے انھوں نے دو رکعت نماز ادا کیا۔

وہ غلام تحقیر اور ترچھی نگاہوں سے شیخ کو دیکھ رہے تھے اور اس درجہ مرعوب کررہے تھے کہ یہ بولنے کے قابل نہ رہے پھر دوسری ڈیوڑھی آئی تو

پولیس نے کہا کہ یہاں پر بھی دو رکعت نماز پڑھیئے۔ وہاں کے غلام دوسرے رنگ میں زرق برق تھے۔ اسی طرح سے سات ڈیوڑھیاں پاس کرائی گئیں یہاں تک کہ شاہی دربار کا وہ محل آگیا جو مامون الرشید کا شاہی دربار تھا وہ اتنا بڑا ہال تھا کہ جتنے لوگ گئے تھے سب اس میں کھپے ہوئے تھے ہال کے ستونوں پر ریشم کے کپڑے لپٹے ہوئے تھے۔

دربار بڑے بڑے قالین وریشم وغیرہ سے سجا ہوا تھا۔ جب شیخ داخل ہوئے تو شیخ سیاہ فام تھے۔ ان کی صورت وشکل کوئی اچھی نہیں تھی۔ لیکن علمی کمال بڑا اونچا تھا تو ان کو دیکھ کر لوگوں نے تحقیر آمیز نعرے لگانا شروع کیا اور بعضوں نے تو تھو تھو کیا۔ مگر شیخ نے ان کی طرف توجہ نہیں کیا۔ بعض نے تحقیر آمیز کلمات بھی کہے۔

شیخ عبدالعزیزؒ فرماتے تھے کہ اس وقت میرے دل میں تھوڑی سی مرعوبیت پیدا ہوئی اور وجہ یہ تھی کہ ان تحقیر کنندوں کے سامنے میں کیا کہوں اور ان کو کس طرح سمجھاؤں یہ نفسیاتی بات ہے کہ جس مجلس میں تحقیر کرنے والے ہوں تو کہنے والے کی ہمت نہیں بڑھتی۔ بہرحال شیخ عبدالعزیزؒ مکی کو بٹھایا گیا پھر نقیبوں نے آواز دی کہ امیرالمومنین اپنے محل سے چل پڑے ہیں تمام لوگ ادب سے بیٹھ گئے یہاں تک کہ پردہ اٹھا اور مامون الرشید نمایاں ہوئے۔

شیخ کہتے ہیں کہ جس طرح سے شیر ہوتا ہے بہت ہی وجیہ اور قوی ہیکل اور رعب دار اس کا چہرہ تھا۔ تمام لوگوں نے کھڑے ہو کر اس کی تعظیم کی۔ پورے دربار میں ایک سناٹا اور سکوت چھا گیا۔ مامون نے بیٹھتے ہی کہا کہ کون ہے عبدالعزیز۔ لوگوں نے کہا کہ یہ ہیں اس نے کہا کہ اُدْنُ مِنِّیْ یعنی میرے قریب آؤ وہ قریب گئے۔

مامون نے کہا کہ کیا نام ہے تمہارا۔ شیخ نے فرمایا عبدالعزیز۔ کہاں سے آئے ہو۔ شیخ نے کہا مکے سے۔ کیوں آئے ہو۔ شیخ کے اندر جراءت حق پیدا ہوئی اور کہا کہ اس لیے آیا ہوں کہ آپ نے ایک عام گمراہی کا راستہ کھول رکھا ہے اور ہزاروں علماء کو ایک فرضی مسئلے پر قتل کرا دیا جو حیات و ممات کا معیار نہیں تھا۔ آپ کو ان کے قتل کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے نہ کتاب اللہ سے نہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اوپر ایسے دنیا پرست علماء چھا گئے کہ جنھوں نے ایک وہمی اور فرضی مسئلے کو لوگوں کی زندگی کا معیار بنا دیا ہے اور ہزاروں کو ناحق قتل کرا دیا۔ ان سب کا خون آپ کے گردن پر ہے ان سب کا قیامت کے دن آپ کو جواب دینا پڑے گا۔ یہ کہہ کر بہت ہی ڈانٹ ڈپٹ کے تقریر کی۔

بہر حال سختی کے ساتھ ایسا ڈانٹے جیسا کوئی اپنے شاگرد کو ڈانٹا کرتا ہے لیکن مامون چپ چاپ بیٹھ کر سنتا رہا۔ جب شیخ عبدالعزیز بول چکے تو مامون کہتا ہے کہ اے عبدالعزیز تو نے اپنی حدود سے گذر کر کلام کیا ہے تو نے نہ اس دربار کی عظمت کو پہچانا نہ خلافت کی عظمت کو پہچانا۔ لیکن میں ان سب چیزوں پر صبر کرتا ہوں کیوں کہ تو ایک مخلص آدمی معلوم ہوتا ہے اور تیرا مقصد کوئی ذاتی وجاہت کمانا نہیں ہے۔ اسلیئے میرے دل میں اس کی قدر ہے۔ تیرا طرز کلام اور اس قدر آنے کا مقتضی تو یہ تھا کہ میں تجھے قتل کا حکم دیتا لیکن چونکہ تیری نیت صاف ہے اور تو سوچتا ہے کہ مسئلے کی تحقیق ہو جائے۔ اس لیے میں ان ساری چیزوں سے درگذر کرتا ہوں۔ تو کلام کرنے میں بالکل آزاد ہے۔ لہٰذا آزادی سے اپنے مسئلے کو ثابت کر مگر یہ دیکھو آپ کا مقابلہ بڑے بڑے علماء سے ہے اگر تو جیت گیا تو پوری حکومت پر فتح پائے گا۔ اور اگر تو ہار گیا تو تیرا انجام اتنا برا ہو گیا کہ ایسا انجام کسی کا نہ ہوا ہو گا۔ بہر حال تم کو سنبھل کر بولنا ہے

مامون نے بہت ہی فصیح اور بلیغ انداز میں تقریر کی۔

معتزلہ کے علماء اور شیخ عبدالعزیز مکیؒ کا مناظرہ

اس کے بعد شیخ عبدالعزیز مکیؒ اور معتزلہ کے علماء سے گفت گو شروع ہوئی۔ شیخ عبدالعزیزؒ نے ایک طرف مامون کو اور ایک طرف درباریوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگوں نے میرے متعلق یہ کہا اور یہ کہا مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ لیکن ان کو یہ خیال کر لینا چاہیئے کہ اگر یہ عالی شان دربار کا کمرہ کہیں سے خراب یا خستہ ہو اور اس پر کوئی شخص اس کی تحقیر کرے تو یہ تحقیر عمارت کی نہیں بلکہ معمار کی ہوگی کہ اس معمار کو اتنی عقل نہ آئی کہ اتنی عالی شان مکان میں یہ کھوٹ اور خرابی رکھ دیا۔

لہٰذا میرے سیاہ رنگ اور بدصورتی کی ملامت کرنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ میرے خالق نے میری ایسی صورت کیوں بنائی۔ درحقیقت یہ مجھ پر طعن و ملامت نہیں ہے بلکہ خالقِ اشیاء کے اوپر طعن اور ملامت ہے۔

مجھے تعجب یہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے علماء اور فہیم لوگ اپنے خالق اور مالک پر طعن کرتے ہیں اس انداز سے بیان فرمایا کہ پورے دربار پر ان کی تقریر کا رُعب طاری ہوگیا۔ اور وہ حقارت عظمت سے بدل گئی اور ان کے سامنے سارے لوگ جُھک گئے۔ اس کے بعد معتزلہ کے علماء سے بحث شروع ہوئی۔ معتزلہ نے خلقِ قرآن پر دلائل دینے شروع کئے اور شیخ عبدالعزیز مکیؒ نے جوابات دینے شروع کئے پھر معتزلہ نے اس پر اعتراض کیا اور شیخ نے جواب دیا۔

راوی بیان کرتا ہے کہ جب معتزلہ کے علماء تقریر کرتے تھے تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اتنی لاجواب دلیل خلقِ قرآن پر معتزلہ نے پیش کیا ہے کہ اب عبدالعزیزؒ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ اور جب شیخ عبدالعزیز تردیدی تقریر

کرتے تھے تو معلوم یہ ہوتا تھا کہ اب اس کا کوئی جواب معتزلہ کے پاس نہ ہوگا پھر جب معتزلہ اس پر تکبیر کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ پختہ دلیل کوئی نہ ہوگی لیکن اس کے جواب میں جب شیخ عبدالعزیز بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے بہترین دلیل معتزلہ پیش نہیں کرسکتے تھے ان کے بیان پر معلوم ہوتا تھا کہ معتزلہ سب کے سب احمق ہیں۔

اسی طرح سے بہت دیر تک سلسلہ چلتا رہا۔ اور رات کا بہت سا حصہ اس میں گذر گیا نہ یہ بند ہوں اور نہ وہ بند ہوں۔ اخیر میں معتزلی علماء نے کہا کہ اے عبدالعزیز اب تم سنبھل کر بیٹھ جاؤ۔ ہم قرآن کے مخلوق ہونے پر ایک ایسی دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں تم اس کا جواب دے سکو تم کو لامحالہ جھکنا پڑے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم تم سے سوال کرتے ہیں کہ یہ قرآن شئے ہے یا لاشئی ہے۔ شیخ عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ معاذ اللہ! یہ لاشئی کیوں ہے یہ شئی ہے تو معتزلہ نے کہا کہ جب یہ شئی ہے تو تم نے مان لیا کہ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ یعنی اللہ تعالیٰ ہر شئے کا خالق ہے تو شئی میں قرآن بھی داخل ہے۔ تمہارے ہی قول سے ثابت ہوگیا کہ قرآن مخلوق ہے۔

لہٰذا قرآن کا مخلوق ہونا نصِ قطعی سے ثابت ہوگیا۔ شیخ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت میرے دل میں ایک جھجک سی پیدا ہوئی کہ اب میں کیا جواب دوں اور تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ اس وقت ہم نے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا کہ میرے قلب میں کوئی اس کا جواب القا فرما دیں جو واضح اور صاف ہو اور منطقی انداز میں نہ ہو کہ جس سے لوگ اُلجھ جائیں اس وقت حق تعالیٰ نے میرے قلب میں یہ جواب القاء فرمایا۔ میں نے معتزلی علماء سے کہا کہ اب تم بھی سنبھل کر بیٹھ جاؤ میں بھی ایک آخری بات کہتا ہوں کہ جس کا جواب

ممکن نہیں ہے کہ تم دے سکو اور وہ یہ ہے کہ میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے نفس ہے یا نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے کہ اللہ کے نفس نہیں ہے کیونکہ قرآن میں خود ہی فرمایا۔ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تم کو اپنے نفس سے ڈراتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لیے نصِ قطعی سے نفس ثابت ہے معتزلہ نے کہا کہ اللہ کے لئے نفس ہے تو شیخ عبدالعزیزؒ نے فرمایا یہ بھی قرآن میں ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یعنی ہر نفس کے لیے موت ہے تو کیا تم معاذاللہ اس اصول سے حق تعالیٰ کے لیئے موت ثابت کردو گے۔ لہٰذا تم جو بھی اس کے متعلق جواب دو گے تمہارے سوال کا ہمارا وہی جواب ہوگا۔ اس پر سارے معتزلی علماء خاموش ہوگئے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا جب تھوڑی دیر اسی خاموشی کے عالم میں گذرا تو مامون رشید نے اعلان کیا کہ اب حق بالکل واضح ہوگیا۔ اور شیخ عبدالعزیز اپنے مخالفین پر غالب آگئے ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ خواہ میری رائے بدلے یا نہ بدلے لیکن خلقِ قرآن کے مسئلے میں عبدالعزیز مکیؒ نے معتزلہ کو اس قدر خاموش اور ساکت کردیا ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے اسکے بعد دربار برخواست کیا اور کہا کہ عبدالعزیز آج تم سے زیادہ ہمارے نزدیک کوئی معزز نہیں ہے اور خدام کو حکم دیا کہ عبدالعزیز کو محل کے خاص مہمان خانے میں ٹھہراؤ پھر ان کو دس بیس ہزار درہم بطور انعام بھی دیا۔ اور بہت سا سامان دیا پھر بہت ہی اعزاز واکرام سے ان کو رخصت کیا۔

عبدالعزیز مکیؒ فرماتے ہیں کہ جب میں محل سے باہر نکلا تو لاکھوں آدمیوں کا مجمع لگا ہوا تھا اور وہ لوگ اس کے منتظر تھے کہ یہ ہار سار کا موقع ہے کیا ہونے والا ہے جب سب کو خبر ملی کہ شیخ عبدالعزیز سارے معتزلی علماء کو

لاجواب کر کے غالب ہو گئے تو لوگوں کے جوش و خوشی کی یہ کیفیت تھی کہ لوگوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھالیا اور ایک میل تک ہمارا قدم زمین پر نہیں پڑا اور لوگوں کی عجیب حالت تھی۔ جب میں قیام گاہ پہنچا تو کئی روز تک ہزاروں کا مجمع آتا اور مناظرے کی کیفیت کو سُنتا۔ اور میں بیان کرتا پورا ایک ماہ گذر گیا میں بھی بیان کرتا کہتے تھک گیا۔ تو فرصت کے وقت میں مناظرے کی ساری کیفیت ہم نے قلم بند کیا۔ اس کا نام "کتاب الھیمنہ" رکھا پھر اس کو شائع کئے اور لوگوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا اس مناظرے کا اثر یہ ہوا کہ قتل و غارت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اور علماء حقانی کے اندر طاقت پیدا ہو گئی اور معتزلی علماء جھک گئے۔

مامون الرشید کا تائب ہونا

اس کا اثر مامون پر خود پڑا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ آخر عمر میں مامون تائب ہو گیا اور بہت نادم تھا کہ بلا وجہ ہمارے ہاتھ سے ہزاروں ناحق خون ہوئے حتّٰی کہ جب اسکی موت کا وقت آیا ہے تو اس نے کہا کہ مجھے اس تخت شاہی سے اُتار کر مٹی کے اوپر ڈال دو اور اس پر کوئی کپڑا بھی نہ رکھو مرتے دم اس کا یہ کلمہ تھا کہ یَا مَنْ لَا یَزَالُ مُلْکُہٗ اِرْحَمْ مَنْ زَالَ مُلْکُہٗ ۔ اے وہ ذات جس کا ملک کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے رحم کر ایسے شخص پر جس کا ملک ختم ہونے والا ہے تو تواضع و انکسار اخیر عمر میں پیدا ہو گئے تھے اور اس میں ندامت کے آثار بھی نمایاں ہوئے اور وہ تائب بھی ہوا۔

اس کے بعد خلق قرآن کا مسئلہ درہم برہم ہو گیا۔ البتہ مامون الرشید کے بعد عدم خلق قرآن کا مسئلہ علماء میں زیر بحث رہا۔

آریہ دھرم کے چند حضرات سے حکیم الاسلام کی مسئلہ تناسخ پر گفتگو

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے

فرمایا کہ میں نہ مناظرے کے قابل ہوں اور نہ میں نے کبھی اس کا اقدام کیا۔ لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ۔ بعض لوگ بحاث ہوتے ہیں کہ وہ تعمیری چیزوں کو بھی بحث اور مناظرے میں لے آتے ہیں اور بعض اس کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی مجھے مناظرہ کرنا نہیں آتا لیکن لیکن جب مخالف سے گفتگو کرتے تھے تو با اصول مناظرہ ہو جاتا۔

اس پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آگیا ہے وہ مناظرہ تو نہیں ہے البتہ مناظرہ کی شکل ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ یہ ہے کہ میں مسجد میں مشکوٰۃ شریف کا درس دے رہا تھا۔ چار پانچ آریہ مبلغ۔ دارالعلوم دیکھنے آئے تھے۔ وہ دیکھتے دیکھتے مسجد میں پہنچے اور درس میں آکر بیٹھ گئے۔

اندازہ یہ ہے کہ میں کوئی کلامی مسئلہ بیان کر رہا تھا ذات وصفات کا اسمیں تذکرہ تھا وہ سنتے رہے ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے سمع قبول سے سُنا اور تقریر سے متاثر بھی ہوئے ان میں تعصّب نہیں محسوس ہوتا تھا۔ بیان کے بعد انہوں نے تناسخ کا مسئلہ چھیڑا اور مجھ سے سوال کیا کہ دیکھیئے کہ یہ ایک طبعی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ظلم نہیں ہے یہ مسلمہ ہے۔ پھر بھی جب کسی کو دُکھ آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دور مابعد الدور بدلہ ہوگا۔ پھر اس میں جوان اور بالغ ہی نہیں بلکہ بچے بھی شامل ہیں جنہوں نے کوئی گناہ اور بُرائی نہیں کی تو یقیناً یہ اسکی علامت ہے کہ پہلے کوئی وجود ہوا ہے کہ جس کے اندر غلطیاں اور گناہ سرزد ہوئے ہیں۔

اور اس کا یہ ثمرہ ہے جو دکھ پہنچ رہا ہے ورنہ حق تعالیٰ ظالم نہیں ہیں وہ ظلم سے بری ہیں۔ لہٰذا اس کا حل بجز تناسخ کے نہیں ہو سکتا میں نے کہا کہ اسکے بارے میں پہلے الزامی بات عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کے کہنے کے مطابق یہ معلوم ہوا کہ مسئلہ تناسخ مبنی ہے شبہ کے اوپر اور اگر یہ شبہات نہ ہوں تو تناسخ کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہو اور شبہ ایک قسم کی جہالت ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا عقیدہ جہالت پر مبنی ہے علم پر نہیں ہے اصل عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے اس پر کوئی شبہ نہ ہو کیونکہ شبہات کا معاملہ بعد میں ہوتا ہے۔ مخلوق کو حقائق کے اُترنے سے پہلے شبہات لاحق نہیں ہوتے کہ ان شبہات کے جواب میں حق تعالیٰ کوئی عقیدہ پیش فرمائیں۔ عقیدہ تو آدم علیہ السلام ہی سے چلا آرہا ہے۔

اور نقل صحیح کے ساتھ سارے انبیاء علیہم السلام اس کو کہتے چلے آئے لہٰذا اس کا حل یہ نکلا کہ آپ کا یہ مسئلہ تعلیم الٰہی پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ ان شبہات پر مبنی ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ آپ کا عقیدہ جہالت پر مبنی ہے اس پر آپ کو غور کرنا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو اس سے یہ شبہ لاحق ہو رہا ہے کہ بڑے بڑے آدمی ظلم کرتے ہیں اور اُن کو دُکھ پہنچا ہے تو ممکن ہے پہلے سے وجود ہو۔ مگر یہ چھوٹے چھوٹے بچے کوئی گناہ اور ظلم نہیں کرتے پھر بھی وہ بیماریوں میں اور مختلف قسم کی تکلیفوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی بلوائی عام ہو تو بچے قتل بھی کیئے جاتے ہیں تو یقیناً کوئی پچھلا جنم ہو گا۔ جس میں انہوں نے ظلم اور زیادتی کی ہوگی جس کی وجہ سے اس جنم میں سزا دی جا رہی ہے گویا آپ کا یہ شبہ ہے میں نے کہا کہ اس شبہ کا معمولی سا حل یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ اتنی دور جائیں

اور اس میں گنہگاری ثابت کریں۔ جس کا آپ کو علم نہیں۔ محض وہم اور قیاس سے ثابت کریں اس سے بہتر یہ ہے کہ ان تمام حوادث کو مادے کی خاصیت مانیں اسلیے کہ ساری دنیا مادی ہے اور مادہ کی ذاتی کیفیت تغیر ہے وہ ایک حالت پر ٹھہرتا نہیں آج پتے ہرے ہیں تو کل خشک ہو گئے آج زمین میں خشکی ہے تو کل تری آگئی تو اشیاء عالم میں تغیر ہونا یہ مادّے کی خصوصیات میں سے ہے اور جو مادے سے بالاتر ہیں وہ تغیرات سے پاک ہیں۔ البتہ جو چیز مادی بنے گی اس میں تغیرات کا ہونا لازمی ہے۔

یہ دنیا متغیر ہے اور اَلْعَالَمُ مُتَغَيِّرٌ کا قول فلاسفہ کے یہاں مسلمہ قول ہے تو جب ان تمام مصائب و آفات کا سبب قریب موجود ہے جو مادے کی خاصیت ہے۔ تو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ لاکھوں برس پہلے جنم درجنم مانتے رہیں نہ جس کی کوئی سند ہے اور نہ عقل ہی اس کا ساتھ دیتی ہے اور اس کو آپ عقیدہ بنائیں۔ اور عقیدے کو جہالت پر مبنی کریں اور قیاسات سے عقیدہ بنائیں اور اس پہ دنیا کو چلائیں تو یہ کوئی عقیدہ ہی نہیں جس کی بنیاد جہالت ہو اب اگر آپ یہ سوال کریں کہ سببِ قریب میں تغیر کیوں ہے اور مادہ تغیر کیوں ہے تو ہم کہتے ہیں کہ مادے کی صورتِ نوعیہ کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں تغیر ہو۔ جیسے روحانیت نوعیہ کا تقاضا ہے کہ وہ دوامی اور ابدی ہو تو جب مادہ کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہی یہی ہے تو حق تعالیٰ نے اسے تغیر کیلئے پیدا ہی فرمایا ہے اگر مادّے میں تغیر نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ اس کی خاصیت سلب کر لیتے تو مادہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرتا کہ آپ نے مجھے پیدا کیا اور میری خاصیت سلب کر لیے مجھے اپنی خاصیت دکھانے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ جیسے آگ کو پیدا کریں اور جلانے کی خاصیت کو سلب کر لیں تو آگ

شکوہ کریگی کہ میری ذاتی خاصیت ہی جلانا ہے۔ جب آپ نے مجھے اسی غرض کے لیے پیدا فرمایا تو خاصیت سلب کیوں کرلی۔

اسی طرح پانی کی ذاتی خاصیت ٹھنڈا ہے، اگر یہ خاصیت چھین کر جلانے کی خاصیت دیدی جائے تو پانی زبانِ حال سے بارگاہِ حق میں شکایت کریگا کہ آپ تو مبدءِ فیّاض ہیں ہر چیز کو آپ اس کے مناسب حال وجود دیتے ہیں مجھے وجود بھی دیا لیکن میرے اندر سے وہ چیز نکال دی جو میری ذاتی خاصیت تھی تو فی الحقیقت ذاتی خاصیت ذات کا جزء ہوتی ہے۔

جب کسی ذات کو پیدا کریں گے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی ہوں گے۔ اگر یہ آثار و خواص نکال دیئے جائیں تو شئے اپنے خواص کو چھوڑ کر شئے ہی باقی نہیں لہذا شئے کو حق ہے کہ وہ حق تعالیٰ سے شکایت کرے لہٰذا جب مادہ پیدا ہوگا تو اس کے ساتھ تغیر بھی لازمی ہے اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ تغیر رکھا۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کے یہاں مخلوقات کی دو نوعیں ہوگئیں۔

ایک یہ کہ وہ متغیر ہو دوسرے یہ کہ وہ لَا تَبْدِیلَ ہو تو متغیر کو لاتبدیل نہیں بنائیں گے اور لاتبدیل کو متغیر نہیں بنائیں گے۔ ورنہ ہر ایک کو شکایت کا موقع ملے گا۔ اور حق تعالیٰ کی بارگاہ ظلم و ستم سے بڑی بعید ہے کہ وہ ایسا کام کریں۔ جس سے ساری مخلوقات شاکی ہو جائے تو میں نے کہا کہ جب سببِ قریب موجود ہے تو آپ لاکھوں برس کا سبب بعید کیوں تلاش کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ نے یہ تغیر مانا بھی اور ایک تشنہ جوں مانا۔ اور اس میں تغیر ہوا۔ اور اس سے پچھلے معنیٰ اس تغیر کے پاداش میں ہوا۔ اور پھر اس سے پیچھے ہو تو یہ تسلسل ہے جو خود محال ہے تو آپ

تسلسل محال کے قائل ہو گئے اور اس پر عقیدہ کی بنیاد رکھی تو عقیدہ خود ہی محال بن گیا وہ ممکن کیسے رہا۔ اس پر وہ لوگ بالکل خاموش ہو گئے لیکن یہ بھی کہنے لگے کہ یہ تفصیل طلب بات ہے اور اس میں طویل گفتگو کی ضرورت ہے اور یہ اس کا موقع نہیں میں نے کہا کہ اس کو آپ جانیں میں نے تو چھیڑا نہیں تھا آپ نے خود ہی مسئلے کو اٹھایا ہے۔ بہرحال میری نہ مناظرے کی عادت ہے اور نہ سلیقہ ہے۔

مجلس نمبر ۱۹
۲۹ رصفر المظفر ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۴ / مارچ ۱۹۷۵ء

انبیاء علیہم السّلام کی استغفار اور توبہ کی وجہ

سوال:۔ انبیاء علیہم السّلام معصوم ہوتے ہیں پھر بھی وہ توبہ اور استغفار کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے اور بعض انبیاءؑ نے بغیر خطا اور نسیان سرزد ہوئے توبہ اور استغفار کیا ہے مثلاً موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ فَلَمَّا اَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا ایک معروف مقولہ ہے کہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ ابرار کی جو نیکیاں ہیں مقربین انھیں گناہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ مقربین کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آدم علیہ السلام نے معاذ اللہ معصیت نہیں کی تھی۔ بلکہ خطاء اجتہادی اور خطاء فکری تھی۔ یہ نہیں تھا کہ معاذ اللہ جان بوجھ کر حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی تھی اسی وجہ سے جب شیطان نے آدم علیہ السلام کو بہکایا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے تو اس کے کھانے کی ممانعت کر دی گئی ہے اس نے اس کی تاویل کرنی شروع کر دی کہ یہ ممانعت موید نہیں بلکہ موقت ہے اس وقت اس کی ممانعت کی گئی تھی کہ جنت میں استقرار پکڑنے کے قابل نہیں تھے۔ اور اب وہاں کی آب و ہوا آپ میں سرایت کر گئی ہے اب آپ اس کو کھا سکیں گے۔ اب وہ ممانعت نہیں ہے مگر اس تاویل میں بھی آدم علیہ السلام کو تامل رہا لیکن حضرت حوّا نے کہا کہ ایک دو دانہ کھا لینے

سے کیا حرج ہے تو کچھ حوا علیہا السلام نے سہارا دیا اور ادھر شیطان نے قسمیں کھانا شروع کر دیا وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ۝

ظاہر بات ہے کہ آدم علیہ السلام کا قلب مبارک پاک ہے نافرمانی کا شائبہ بھی نہیں تھا لیکن جب بارگاہِ خداوندی میں اور ان کے قرب میں ایک شخص قسمیں کھائے تو سچے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹ کیسے بول سکتا ہے۔ جبکہ یہ اللہ کے نام کی قسم کھا رہا ہے تو حقانی لوگ اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں ایسے یہ بات ان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی کہ کوئی اللہ کے نام پر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

لہٰذا جب اس قسم کی باتیں سامنے آئیں تو انھوں نے گیہوں کے دانے کھا لیے تو ظاہر بات ہے کہ یہ خطاءِ فکری ہوئی۔ معاذ اللہ! یہ معصیت نہیں ہوئی اور اجتہادی خطاء پر بھی اجر کا وعدہ ہے لیکن حق تعالیٰ نے کمالِ قرب کی وجہ سے عصیان سے تعبیر کیا اور فرمایا وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ط کہ آدمؑ نے نافرمانی کی۔ اسلیے آدم علیہ السلام کا خلافِ اولیٰ کام کرنا معصیت میں شمار کیا گیا لیکن عوام کے لیے تو اجتہادی خطاء ہے اور قابلِ اجر ہے ایسے ہی حضرت یونسؑ علیہ السلام کے بارے میں وعدہ دیا گیا کہ فلاں دن عذاب آجائے گا لیکن آدھے دن سے جب زیادہ گذر گیا تو علاماتِ عذاب ظاہر نہیں ہوئے تو بہت پریشان ہوئے کہ کہیں میں ان کی نگاہوں میں جھوٹا نہ ہو جاؤں۔ اسلیئے وہ رُوپوش ہو گئے مگر چونکہ ان سے وعدہ دیدیا گیا تھا اسلیے ان کے جانے کے بعد عذاب کے آثار ظاہر کر دیئے گئے۔ عذاب کے آثار دیکھ کر قوم یونس علیہ السلام کو تنبیہ ہوئی اور سب نے توبہ کیا اور یونسؑ علیہ السلام کی تلاش کرنی شروع کر دی کہ وہ کہاں گئے مگر وہ نہیں ملے

قوم بہت پریشانی ہوئی تو اللہ تعالیٰ عذاب دور فرما دیئے۔

بہر حال یہ کوئی معصیت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود حق تعالیٰ نے سخت الفاظ سے تعبیر کیا اور فرمایا۔ حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْــٴَـسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا یعنی رسول مایوس ہو گئے اور ان کو یہ گمان ہو گیا کہ ہم نے ان سے غلط بات کہی ہے تو ظاہر بات ہے کہ حضرت یونس علیہ السّلام کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ نے ہم سے جھوٹ بات کہی ہے۔

لیکن حق تعالیٰ نے شدتِ قُرب کی وجہ سے ان کے اس تامّل کو بھی کذب سے تعبیر فرمایا جیسے کسی کا دشمن تلوار لے کر کھڑا ہو تو آدمی اس کو بُرا نہیں مانتا کیونکہ دشمن کا کام ہی ہے کہ اپنے مخالف کو ڈرائے اور تکلیف پہنچائے اور سوچتا ہے کہ جب موقع آئے گا تو اس کو بُری طرح سے گرفت کریں گے لیکن اپنا بیٹا اگر ترچھی نگاہ سے بھی باپ کو دیکھ لے تو شدتِ تعلق کی وجہ سے مارنے پیٹنے کو تیار ہو جاتا ہے کہ بیٹا ہو کر ایسی حرکت کرتا ہے۔

تو انبیاء علیہم السّلام سے زیادہ مقرّب کون ہو سکتا ہے اگر یہ خلافِ اولیٰ کا تصوّر بھی کریں گے تو حق تعالیٰ اس کو گناہ فرمائیں گے کہ آپ اور یہ حرکت تو یہ اسی قبیل سے ہے۔

عوام اور خواص کی توبہ میں فرق

توبہ صرف معصیت ہی پر نہیں کی جاتی بلکہ ہر ایک کی توبہ الگ الگ ہے عوام کی توبہ تو یہ ہے کہ کوئی کبیرہ گناہ کر لیا تو آئندہ اس کو کرنے سے توبہ کر لیا اور خواص کی توبہ یہ ہے کہ اگر وہ گناہ صغیرہ بھی کرتے ہیں تو پھر بھی توبہ کرتے ہیں اور اخص الخواص کی توبہ یہ ہے کہ اگر وہ خلافِ اولیٰ بھی کرتے ہیں تو اسکو گناہ سمجھتے ہیں اور اس پر توبہ کرتے ہیں یہ ہر ایک کے مقام کی بات ہے۔

رہی یہ بات کہ موسٰی علیہ السلام نے اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ جو فرمایا یہ ظاہر ہے کہ وہ اپنی اُمّت میں اوّل مومن تھے لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں کسی گناہ میں مبتلا ہو جاؤں کیوں کہ میں خاص کر آپ ہی کا ہوں پھر بھی توبہ کرتا ہوں کہ جس چیز کے دیکھنے کی میرے اندر طاقت نہیں تھی۔ میں نے آپ سے اس کے دیکھنے کی درخواست کیوں کیا۔

جُمعہ کی فضیلت اور خصوصیات

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت جمعہ کے دن آدم علیہ السّلام جنّت سے نکالے گئے اور زمین پر اُتارے گئے گویا یہ عتاب کی وجہ سے ہوا ہے تو اس کو جمعہ کی فضیلت میں کیوں شمار کرتے ہیں۔

حکیم الاسلام مدظلہٗ العالی نے فرمایا کہ یہ سبب ہوا اور سبب کے معنیٰ ظرف کے تو نہیں ہیں سبب تو واقعۂ آدم ہوا اور ظرف جمعہ کا دن تھا اور یہ سبب جمعہ کے دن پیش آیا۔ بہرحال جمعہ کے دن کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ جتنے عظام امور ہیں وہ سب اسی میں ہوئے ہیں۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش اسی دن میں ہوئی اور آدم علیہ السّلام کی توبہ بھی اسی دن قبول ہوئی اور قیامت بھی اسی دن آئے گی ان کے علاوہ بہت سے اہم امور جمعہ ہی کے دن ہوئے ہیں۔ چونکہ جمعہ ظرف ہے اہم امور کا۔ اسلیئے اس کو فضیلت حاصل ہوئی۔

سائل نے پھر سوال کیا کہ ہبوطِ آدم علیہ السّلام اہم امور میں سے کیسے ہوگا حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ نے فرمایا کہ کیا یہ اہم امور میں سے نہیں ہے۔ یہی تو ذریعہ بنا دُنیا کے آباد ہونے کا۔ اور انبیاء اور صلحاء کی پیدائش کا دُنیا میں حق آنے اور ہدایت پھیلنے کا۔ اگر وہ نہ آتے تو یہ سارے امور ختم ہو جاتے

تو آدم ؑ کی خطا کو ذریعہ بنا دیا گیا ہزاروں برکات کا۔

اگر نبی کی زبان سے کوئی جملہ خطا کی صورت میں نکلے تو یہ معاملہ ان کی ذات کے ساتھ ہے لیکن حق تعالیٰ ان کے فعل کی اتنی رعایت فرماتے ہیں کہ اس کو ذریعہ بنا دیتے ہیں ہزاروں خیر و برکت کا۔ کیونکہ وہ ان کا کلمہ ان کے پاک منہ سے نکلتا ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے ایک چرواہے کو ڈانٹ دیا تھا وہ بیچارہ شوق و محبت میں کہہ رہا تھا کہ یا اللہ ! اگر تو میرے پاس ہوتا تو میں تیرے کپڑے سلتا اور سر میں تیل لگاتا وغیرہ وغیرہ۔

یہ الفاظ محبت میں کہہ رہا تھا لیکن چونکہ ظاہر میں بے ادبی تھی اسلیئے موسیٰ علیہ السلام نے ڈانٹا اور ایک طمانچہ بھی رسید کیا وہ بے چارہ ڈر کر بھاگ گیا۔ موسیٰ ؑ پر عتاب ہوا کہ

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا ٭ بندۂ مارا چرا کردی جدا

تو برائے وصل کردی آمدی ٭ نے برائے فصل کردن آمدی

یعنی موسیٰ علیہ السلام کے پاس خدا کی طرف سے وحی آئی کہ آپ نے میرے بندے کو کیوں جدا کر دیا آپ تو بندوں کو ہم سے ملانے کے لیے ہیں جدا کرنے کے لئے آئے نہیں۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام اس سے معافی مانگنے گئے چرواہے نے کہا کہ آپ معافی مانگتے ہیں آپ کے طمانچے کی برکت سے ہمارے سارے ... مقامات طے ہو گئے یعنی ولایت کاملہ حاصل ہو گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے حق میں خطا کیا لیکن یہ فعل پاک ذات اور معصوم نبی سے سرزد ہوا اس لیئے اس کی پاکی بغیر اثر کیئے نہ رہی اور وہ ولی کامل ہو گیا۔

تو آدم علیہ السلام کا ہبوط ہوا اور مان لیجئے کہ تھوڑی سی تعزیر بھی مقصود

تھی لیکن یہ تعزیر درحقیقت تعمیر تھی کیونکہ یہی ذریعہ بننے والی تھی۔ ہزاروں امورِ عظام کا تو ان کی ایک خطا ہماری ساری نیکیوں سے بہتر ہے۔ اسلئے فضائل جمعہ میں سے ہبوطِ آدمؑ کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

عصمتِ انبیاء علیہم السّلام

حضرت حکیم الاسلام نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ انبیاء کے اندر کے شر اور خیر دونوں قسم کے مادے ہوتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قلب کے دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے اور بائیں جانب شیطان ہوتا ہے فرشتہ خیر کی طرف لاتا ہے اور شیطان شر کی طرف اس پر حضرت عائشہؓ صدیقہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کی بھی بائیں جانب شیطان ہے آپ نے فرمایا کہ ہے وَلٰکِنَّ اللہَ اَعَانَنِیْ عَلَیْہِ فَاَسْلَمَ یا وَلٰکِنِّیْ اَسْلَمُ۔ لیکن میں اس کے شر سے بچا لیا گیا ہوں۔ یا وہ میری خیر سے مغلوب ہو کر خود اسلام لے آیا تو ایک ہے مواد کا ہونا یہ تخلیق کا کمال ہے اگر مادہ بالکل نہ ہو تو خلقت کامل نہ ہوگی اور خلقت نہ ہو تو مادہ کامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن انبیاء میں مقاومت اور مخالفت نفس کی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ سارے عالم کی مخالفتِ نفس اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو کچھ انبیاء علیہم السلام کا عزم مضبوط ہوتا ہے اور ادھر حفاظتِ خداوندی شاملِ حال ہوتی ہے کہ شر کو پاس نہیں آنے دیتی۔ اسی لیے وہ ان کے حق میں کمال بنا۔

اگر مادہ ہی سرے سے نہ ہو جیسے ملائکہ علیہم السلام کہ ان کے اندر شر کا مادہ ہی نہیں ہوتا ہے اگر وہ دن رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں تو ان کیلئے کوئی کمال نہیں ہے کیونکہ ان کی طبیعت کا تقاضا ہی طاعت ہے۔ البتہ خلافِ طبع چلنا یہ مجاہدہ ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مجاہد کوئی نہیں ہوتا۔

اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہر قسم کے مادّے موجود ہوں اور اتنا مقابلہ ہو کہ شر کو پاس بھی نہ آنے دیں اور نہ اس سے متاثر ہی ہوں۔ یہ ان کے کمال کی دلیل ہے۔

بہر حال اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو مادہ مانا جائے یا یہ کہا جائے کہ مادہ سرے سے رکھا ہی نہیں گیا تو اس میں تامل ہے کہ مادہ بالکل ہی نہیں رکھا گیا کیونکہ اگر مادہ بالکل نہ ہو تو ملائکہ اور انبیاء کی خلقت میں فرق نہ ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود انبیاء اس قدر معصوم ہوتے ہیں کہ ان سے شر کا صدور نہیں... ہو سکتا۔

مادہ اور تخلیق انسان

جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہم السلام کو پیدا فرمانا چاہا تو زمین پر حضرت جبرئیلؑ اور میکائیلؑ اور اسرافیلؑ کو یکے بعد دیگرے بھیجا کہ زمین کے ہر خطے کی مٹی لے آؤ ہم ایک پتلا بنانے والے ہیں اور اس کو نیابت دیں گے۔ ان حضرات سے زمین نے معذرت کی وہ چلے آئے پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عزرائیل مَلَکُ الموت کو بھیجا زمین ان کے سامنے بہت روئی اور ان سے بھی معذرت کیا کہ ہمارا مادہ مت لیجاؤ اس سے انسان بنیں گے اور وہ نافرمانی کریں گے پھر وہ جہنم میں جلیں گے۔ لیکن حضرت عزرائیلؑ نے فرمایا کہ تیری منشا کی طرف حکمِ الٰہی غالب ہے اس لیے میں ضرور لیجاؤں گا۔

تو اس حدیث میں یہ ہے کہ زمین کا مادہ پاک ناپاک طیّب خبیث۔ فاسد، صالح وغیرہ ہر قسم کا لیا گیا۔ اور اس سے آدم علیہ السلام کا پتلا بنایا گیا۔ تو ظاہر بات ہے کہ آدم علیہم السلام پیغمبر ہیں لیکن ان کی خلقت میں ہر قسم کے مادے شامل کئے گئے تو مادے تو ہوتے ہیں لیکن انبیاء کا عزم اور مجاہدہ

اتنا قوی ہوتا ہے کہ ان پر شر کا اثر نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مادے میں خود ہی اعتدال رکھا گیا ہو۔ اور ان کے اندر ہر قسم کا اعتدال ہی اعتدال ہو۔

ارواح اور مادے کا فرق

مادے نفس کے اندر ہوتے ہیں۔ روح بالکل لطیف ہے۔ هُوَ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ روح لطیف ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کا لطیفہ ہوتی ہے تو اسمیں مادہ ماننا ہمارے سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ نفس کے اندر دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ جیسے علماء کرام لکھتے ہیں کہ نفس کے اندر خیر اور شر دونوں قسم کے مادے ہوتے ہیں یہ نفس مرکب ہے خیر اور شر سے اس لیے انسان کے اندر دونوں چیزیں ہیں۔

ایک روح اور ایک نفس اس کے نیچے بدن ہے جو شر محض ہے اور اس کے اوپر روح ہے۔ جو خیر محض ہے تو نفس کے اندر دونوں قسم کی استعداد موجود ہیں اگر وہ روح کی طرف جھک گیا تو متقی بن گیا اور اگر بدن کی طرف جھک گیا تو فاجر اور فاسق بن گیا۔ تو یہ مواد نفوس کے اندر ہیں اور ارواح کے اندر نہیں ہیں۔

روح تو ایک جوہر لطیف ہوتی ہے اس کے اندر خیر ہی خیر ہوتی ہے۔ اسی کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ہ یہاں پر نفس کی خاصیت بیان کی گئی اسکے اندر فسق و فجور کا بھی الہام ہے اور تقوٰی کا بھی ہے۔ اب اگر الہام تقوٰی پر عمل ہوتا ہے تو فجور مغلوب ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے کہ چند دن کے بعد مفقود بھی ہو جائے۔

اور اگر الہام فجور پر عمل ہوتا رہے تو تقوٰی مغلوب ہو جائے گا۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام کی ارواح غایت درجہ کی لطافت میں ہیں اور عام ارواح سے بہت

بالاتر ہیں۔ اسلئے وہ خیر محض ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی خلقت اور ان کے اعضاء ہر اعتبار سے دیگر بنی آدم کی خلقت اور اعضاء سے ممتاز ہوتے ہیں ان کے اعضاء اور قوای کا کمال اتنا ہوتا ہے کہ امت کے قوی و اعضاء ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہماری اور آپ کی زبان کھٹا و میٹھا چکھ لیتی ہے مگر حرام و حلال کو نہیں جان سکتی وہ تو صرف قلب سمجھ سکتا ہے۔

لیکن انبیاء علیہم السلام کی زبان میں اتنی طاقت رکھی گئی ہے کہ زبان پر رکھتے ہی وہ حرام حلال کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ جیسے کہ حدیث شریف میں ہے کہ بعض صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی اور غصب کی ہوئی بکری ذبح کر کے اس کا گوشت آپ کے سامنے رکھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ غصب کا مال معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس کو نہیں کھائیں گے اسی طرح سے ہماری اور آپ کی آنکھ سامنے کی چیز کو دیکھ سکتی ہے۔

دائیں بائیں اور پیچھے نہیں دیکھ سکتی لیکن انبیاء علیہم السلام کی آنکھیں پیچھے کی طرف سے بھی دیکھتی ہیں۔ جیسے کہ حدیث شریف میں ہے کہ بعض صحابہؓ سے نماز کے اندر کچھ غلطی سرزد ہوئی۔ آپ نے فوراً اس پر تنبیہ کیا۔ اور فرمایا۔

اِنِّیْ لَاَرَاہُ مِنْ خَلْفِیْ کَمَا اَرٰی مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ۔

یعنی میں پیچھے کی طرف اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح سامنے دیکھتا ہوں تو انبیاء علیہم السلام میں ایک خاص امتیاز ہوتا ہے جو غیر نبی میں نہیں ہوتا البتہ ظاہری خلقت میں انبیاء کہتے ہیں کہ ہم ایسے ہی پیدا کئے جیسے تم پیدا کئے گئے ہو یعنی لوازم بشریت میں برابر ہیں مثلاً بھوک و پیاس لگنا نکاح و شادی کرنا جیسے اور لوگ کرتے ہیں انبیاء بھی کرتے ہیں۔

اسی طرح سے وظائف زوجیت جس طرح سے دیگر لوگ ادا کرتے ہیں

انبیاء علیہم السلام بھی ادا کرتے ہیں لیکن ان کے قلوب اتنے پاک ہوتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں عبادت میں داخل ہوتی ہیں کیونکہ ان کا ہر عمل رضائے حق کے لیئے ہوتا ہے حظ نفس کے لیے نہیں ہوتا یہ وہی قوت ہے جو اوپر عطا کی جاتی ہے روح کے۔ اور اسی کو کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی روحانیت کامل اور اکمل تر اور غالب تر ہوتی ہے ان کو بھی بھوک لگتی ہے لیکن فاقہ کی اتنی بڑی طاقت ہوتی ہے کہ غیر انبیاء اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔

تو بھوک لگنا لوازم بشریت میں داخل ہے لیکن اس کا مقابلہ کر کے ستر ہ وقت تک فاقہ کرنا روزہ رکھنا یہ روحانیت کی طاقت ہے تو روحانیت کا کمال ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ مقابلہ قوی نہ ہو اور مقابلہ قوی جب ہی ہو سکتا ہے کہ نفس کے اندر مادے موجود ہوں اور یہی وجہ ہے کہ شق صدر چار مرتبہ کیا گیا۔ ایک بچپن میں ایک جوانی میں، ایک شب معراج کے وقت اور ایک نبوّت ملنے کے وقت۔

احادیث میں ہے کہ آپ کے پیٹ مبارک سے کچھ سیاہ مادے نکالے گئے اور اس پر کوئی ایسی چیز چھڑکی گئی ہے جو چمک رہی تھی۔ اس کے متعلق یہی کہا گیا ہے کہ مادۂ بشریت نکال کر مادہ ملکوتی رکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کچھ مادہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کو نکال دیا جاتا ہے۔ ان کے قلوب بالکل پاک صاف ہو جاتے ہیں۔

مجلس نمبر ۲۰

۱۸ ر مارچ ۱۹۷۵ء

قبر میں مُردوں کا دُنیا والوں کی آوازوں کو سُننا اور ان کو دیکھنا

سوال :- ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت دنیا میں اگر آنکھ کے سامنے پردہ ہو تو ہم کچھ نہیں دیکھ سکتے لیکن قبر میں مردے اتنی مٹی کے نیچے ہونے کے باوجود دنیا والوں کو دیکھتے ہیں اور ان کی آوازوں کو سنتے ہیں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج ہوئی تو آپ نے معراج شریف کے واقعہ کو بیان فرمایا اس پر کفار مکہ کو جلن ہوئی اور مذاق آمیز کلمات کہنے شروع کر دیئے اور امتحان لینے کے لیے کہنے لگے اچھا یہ بتائیے کہ بیت المقدس میں کتنے طاق اور کتنے دَر ہیں لیکن چونکہ یہ سوال مہمل تھا اسلیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ایک ضیق سی پیدا ہوئی کیونکہ جب کوئی کسی جگہ جاتا ہے تو وہاں کے مکان کے طاق اور دروازے تھوڑے ہی گنتا ہے لیکن کفار کو آپ سے عناد تھا اس لیے یہ مہمل سوال کیئے تاکہ آپ جواب نہ دے سکیں تو آپ کے اندر ضیق سی پیدا ہوئی کہ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں تو یہ میرا مذاق اڑائیں گے اور میں نے طاق وغیرہ گنا نہیں ان کو کیسے بتاؤں۔

اسی اثنا میں حق تعالیٰ نے میرے قلب میں مسجد اقصٰی کا پورا نقشہ پیش کر دیا۔ میں نے سارے طاق اور دَر کو گن گن کر بتلا دیا پھر وہ چُپ

ہوئے تو انبیاء کی شان تو بہت بڑی ہے اولیاء اللہ کی حالت یہ ہوتی ہے کہ یہاں بیٹھ کر دنیا کا نقشہ دیکھ لیتے ہیں لیکن یہ آنکھ باطنی ہوتی ہے اس ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے بلکہ قوت بینائی جو اصل ہے اس سے وہ دیکھتے ہیں وہ قوت دُنیا کی مجبوری سے پابند ہے آنکھ کے حلقے کی لیکن جب عالمِ غیب سے تعلق ہو تو پھر ان پردوں کی پابندی نہیں رہتی۔

دیکھنے والی دراصل وہی قوت بینائی ہے اگر آپ کسی شہر کو یا کسی عمارت کو دیکھ کر آئیں تو اس کا نقشہ آپ کے دل پر چھپ جاتا ہے اگر آپ یہاں پر بیٹھ کر ذرا سا تصور کریں تو وہ پورا نقشہ سامنے ہوتا ہے تو یہاں پر دیکھنے والی قوت خیال ہے۔ اور قوتِ خیال کے یہ حصے ہیں یعنی بینائی و شنوائی و گویائی یہ قوت جدھر متوجہ ہوتی ہے ادھر اپنا کام کرتی ہے۔ چونکہ دنیا میں اسباب کی پابندی ہے اسلیئے وہ ان اعضاء کے ذریعہ اپنا کام کرتی ہے۔

لیکن جب دنیا ختم ہو جائے گی۔ اور ان پردوں کی قید نہیں رہے گی تو جس طرح سے قوتِ خیال یہاں پر محتاج نہیں اسی طرح سے وہاں پر بھی محتاج نہیں ہوگی۔ اس لیے اگر مُردے ہزاروں من مٹی کے نیچے سے دیکھ لیں یا زمین پر چلنے والوں کی آوازوں کو سُن لیں تو کوئی حیرت ناک بات نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ قبر کے اندر ایک تو ہے بدن کا حصہ یہ بدن مر بھی جاتا ہے اور مٹی میں رل کر مٹی بھی بن جاتا ہے لیکن نفس انسانی قائم رہتا ہے اور وہ اپنے مقام پر ہوتا ہے جب کوئی اس قبر کی نشان پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ اُسے قبر کے اندر لوٹا دیتے ہیں وہ لوگوں کے کلام کو سنتا ہے وہ دَر و دیوار کا محتاج بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو دنیا میں محتاج تھا

لیکن جب وہ دُنیا کا پردہ اُٹھا دیا گیا تو وہ محتاج نہیں رہا۔ یہ اعضاء اور بدن نفس کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے لباس آپ جب چاہیں لباس اتار کر پھینک دیں نفس تو اپنی جگہ پر قائم ہے۔

اسی طرح بدن ایک لباس ہے جب پُرانا ہو جاتا ہے تو پھینک دیا جاتا ہے اب وہ بدن کا محتاج نہیں رہتا۔ لیکن اگر مجاہدہ و ریاضت سے دُنیا کو ہٹا دو تو پھر بھی وہ محتاج نہیں اسی واسطے کفار کے بارے میں قرآن شریف میں فرمایا گیا یہ دیکھتے نہیں سُنتے نہیں۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ ان کے آنکھیں نہیں ہیں بلکہ ان کی وہ قوتیں اندھی ہو گئی ہیں جو آنکھ اور کان کے ذریعہ کام کرتی ہیں اور وُہ قلب کے اندر ہے اور وہی مخزن ہے ساری قوتوں کا ان کا وہی آنکھ اندھی ہو گئی ہے اسلیئے حق نظر نہیں آتا۔

تو یہاں پر قرآن نے یہ ثابت کیا کہ دیکھنے والی چیز آنکھ نہیں ہے بلکہ وُہ چیز ہے جو قلب میں ہے مثلاً کسی کی بینائی کمزور ہو جائے اور چشمہ لگائے اور چشمہ کے ذریعے دیکھنے لگے تو چشمہ سے دیکھتا ہے وہ تو ایک آلہ ہے دیکھنے والی قوت تو آنکھ کے اندر ہے اسی طرح سے آنکھ بھی ایک چشمہ ہے اس کی قوت بینائی قلب کے اندر ہے تو دیکھنے والا قلب ہے آنکھ نہیں ہے۔

اسی وجہ سے اگر آپ بازار میں کسی دھن اور خیال میں چلے جا رہے ہوں اور وہاں تماشے و جلسے و جلوس ہو رہے ہوں لوگ کہنے لگیں کہ آج بازار میں بڑے جلسے جلوس ہو رہے تھے۔ اس پر آپ کہیں کہ کیسے جلسے جلوس اس پر لوگ کہیں کہ آپ بھی تو بازار میں تھے آپ کہیں گے، تھے مگر ہم کو اس کی خبر ہی نہیں کیونکہ میرا دھیان دوسرے طرف تھا۔

اسی طرح گھنٹہ بج رہا ہے اذان ہو رہی ہے۔ مگر آپ کسی خیال میں محو ہیں

تو کان میں آواز ہی نہیں آئے گی اور نہ اذان کی خبر ہوگی۔ اگرچہ آپ کے کان کھلے ہوئے ہیں کیونکہ سننے والی قوت دوسری طرف متوجہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں دیکھنے والی وہ قوت ہے۔ جو بصر کا محتاج نہیں لیکن دنیا میں وہ اسباب کی وجہ سے محتاج بن گئی۔ اگر دُنیا ہی میں اس محتاجی کو ختم کریں تو یہاں پر بھی دیکھ سکتی ہے لیکن مرنے کے بعد ساری محتاجی ختم ہو جائے گی تو وہاں کیوں نہیں دیکھ سکتی۔

مجلس نمبر ۲۱
۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء

شریعت کا حکم ظاہر پر لگتا ہے باطن پر نہیں

اس مجلس میں چند سوالات کئے گئے ہیں ہر ایک کا مضمون الگ الگ ہے ایک سوال کے بعد حکیم الاسلام نے فرمایا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کے دل میں اخلاص ہے اور کس کے دل میں اخلاص نہیں ہے۔ لہٰذا آپ تو فعل کے مطابق حکم لگائیں گے۔ نہ آپ کو اس کی علامت پوچھنے کی ضرورت ہے نہ اس پر حکم لگانے کی ضرورت ہے اس کے بارے میں آدمی اپنے ضمیر کو دیکھ سکتا ہے کہ مثلاً میں اگر درود شریف پڑھ رہا ہوں تو اخلاص سے پڑھ رہا ہوں یا دکھلانے کے لیے پڑھ رہا ہوں لیکن دوسرے کے حق میں اسکو حکم لگانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ البتہ اسلام نے جو حکم لگایا ہے اس پر عمل کرنا چاہیئے۔

قرآن پاک میں ایک جگہ فرمایا گیا لَا تَقُوْلُوا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔ جو شخص اسلامی طریق پر ملتا ہے اور تم سے سلام کرتا ہے اس کو غیر مومن نہ کہو۔ حدیث شریف میں جیسے فرمایا گیا۔ مَنْ صَلّٰی صَلٰوتَنَا وَ اَکَلَ ذَبِیْحَتَنَا ذٰلِکَ الْمُسْلِمُ فِیْ ذِمَّتِہِ اللّٰہِ فَلَا تَکْفُرُوْا (ترجمہ) "جو ہماری طرح نماز پڑھے اور ہماری ذبیحہ کو کھائے وہ مسلمان ہے اسکو کافر مت کہو"

البتہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوجائے کہ یہ شخص اسلام کا منکر ہے۔ اور قطعیات دین کا انکار کررہا ہے تو اس پر حکم لگا سکتے ہیں لیکن پھر بھی فعل پر ہی حکم لگ سکتا ہے قلب پر نہیں اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کا ظاہر پر حکم لگتا

ہے باطن پر نہیں۔

اسی طرح ایک تیسری حدیث ہے کہ جہاد کے اندر علی الاعلان ایک شخص نے کلمہ پڑھا لیکن پھر بھی اس کو بعض صحابہؓ نے قتل کر دیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخذہ فرمایا کہ جب اس نے کلمہ پڑھا تم نے اس کو قتل کیوں کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ ڈر کر نفاق سے کلمہ پڑھا تھا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم اسکے قلب میں گھس کر دیکھتے تھے کہ اس نے نفاق سے کلمہ پڑھا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ حق نہیں ہے کہ باطن پر حکم لگاؤ یہ کام اللہ کا ہے تم کو ظاہر پر حکم لگانا ہے آپ سے باطن کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔

ایک پُرلطف حکایت مولوی سمیع اللہ مرحوم کی دکان پہ ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ ہندو بھی اور مسلم بھی اور لوگوں سے اتنی بے تکلفی تھی کہ کوئی آکر مٹھائی طلب کرتا کوئی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسہ نکال لیتا۔ وہ سب کی خاطر داری کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان کی دکان پہ ایک ہندو آیا اس کی بول چال مسلمانوں جیسی تھی ایک قادیانی ان کی تاک میں لگ گیا ان کو مسلمان سمجھ کر دکان پہ آکر ان کے سامنے مرزا غلام رسول کی نبوت پر آدھ گھنٹہ تقریر کیا اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ نبی ہیں ان کی نبوت کو مانیں۔ اسکی اپنی یادداشت میں خوب دلائل سے تقریر کیا وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ قادیانی نے سمجھا کہ ہماری تقریر کا اثر ان پر ہو گیا ہے اور یہ مرزا صاحب کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔

تقریر ختم کرنے کے بعد قادیانی کہتا ہے کہ آپ نے میری تقریر کا کیا اثر لیا تو وہ ہنسا اور کہا کہ ابھی تک تو ہم نے اصلی نبی ہی کو نہیں مانا فرضی نبی کو کیا مانیں گے۔ اس پر مجلس کے سارے حضرات ہنس پڑے۔ حضرت نے فرمایا

کہ جب قادیانی کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تو غیر مسلم ہے تو بہت شرمندہ ہو کر وہاں سے بھاگا اور پھر وہاں پر نہیں آیا۔

مفتی سعید احمد صاحب نے سوال کیا کہ بیت المقدس جو اسرائیل کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اگر اس کو واپس کرنے کے لیے لڑائی کی جائے تو کیا اس کو جہاد سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ یہ جہاد ہوگا۔ کیونکہ یہ اعلاء کلمۃ اللہ ہی کے لیے ہے کیونکہ مسجد اقصیٰ شعائر اسلام میں سے ہے۔ اگر کوئی شعائر اسلام کو ڈھا دے اور توڑ دے اور آپ کے ہاتھ میں قوت ہے تو آپ ضرور قوت سے کام لیں اور اس کو چھڑانے کے لئے جہاد کریں۔ حقیقت حال اللہ تعالیٰ جانتے ہیں لیکن اہل عرب اس کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں اگر آپ نہیں کر سکتے تو کم سے کم ان کی آواز ہی ملائیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ ظاہر میں تو جنگ کرتے تھے لیکن اصل مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہی ہوتا تھا۔

کیونکہ بغیر جنگ کے اعلاء کلمۃ اللہ کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا توحید اور اتحاد ان دو چیزوں کو اسلام لے کر آیا ہے یعنی توحید کا دامن پکڑ کر باہم متحد رہو۔ اتحاد کا خاصہ لازمہ ہے اخوت و مساوات اس میں اگر حارج تھی تو روم اور ایران کی سلطنت حارج تھی اسلیئے کہ ان کے یہاں نسب کے لحاظ سے اونچ اور نیچ مسئلہ تھا۔ غلاموں کو حقیر جانتے تھے اور قانوناً بھی اونچ نیچ جانتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ بڑی طاقتیں تھیں اسلیئے ان سے جنگ کرنا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی بھی فرمادی تھی کہ جب تک یہ طاقتیں نہیں ٹوٹیں گی۔ اس وقت اسلام کا کلمہ رائج نہیں ہو سکتا تو صحابہؓ نے اسلیئے جنگیں نہیں کی ہیں کہ خواہ مخواہ ملک پر قبضہ کر لیں۔ بلکہ مقصد یہ تھا کہ بغیر

ان طاقتوں کو توڑتے ہوئے وہ کلمہ رائج نہیں ہو سکتا جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے گئے تھے۔ اسواسطے صحابہؓ نے جنگیں کیا ان کا مقصد اگر مُلک گیری ہوتا تو یہ معاہدہ نہ کرتے کہ تم اپنے ملک پر بدستور قابض رہو صرف ہم کو اتنی اجازت دیدو کہ ہم آزادی سے اسلام کی تبلیغ کرتے رہیں ہم لوگوں کو منوانے پر مجبور نہیں کریں گے ان کا جی چاہے مانیں یا نہ مانیں۔ جن لوگوں نے اس معاہدے کو تسلیم کر لیا اُن سے کوئی تعارض نہیں کیا گیا اگر مُلک گیری مقصود ہوتا تو ان کے ملک پر قبضہ کر لیتے اس قسم کے معاہدے کی ضرورت نہ ہوتی۔
اسی طرح اگر جنگ و جدال مقصود ہوتا تو اسلام میں ذمّیت کا مسئلہ نہ ہوتا کہ ذمّی بنا کر اُن کو چھوڑ دو۔ اسی طرح زبردستی اسلام منوانا ہوتا تو غلبہ پانے کے بعد یہ حکم کرتے کہ تم لوگ اگر کلمہ نہ پڑھو گے تو ہم قتل کر دیں گے۔

بہر حال غیر اقوام جب معاہد یا ذمّی بن گئیں تو ان کو چھوڑ دیا گیا۔ اسلئے کہ اصل مقصد اعلاءِ کلمۃ اللہ ہے وہ بھی تبلیغ کی حد تک۔ اسلام نے اکراہ اور اِجبار کو جائز نہیں رکھا۔ لہٰذا صحابہ کرام اسلام کے اصول کے خلاف نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ اگر نادان لوگ اس اصول کے خلاف کریں تو یہ الگ بات ہے۔

ایک سرحدی پٹھان کا واقعہ

ایک سرحدی پٹھان بنئے کی چھاتی پر تلوار لے کر چڑھ گیا۔ اور کہا کہ مسلمان ہو جا۔ بنئے نے کہا کہ مَیں مسلمان ہوتا ہوں سرحدی پٹھان نے کہا کہ کلمہ پڑھ بنئے نے کہا کہ کلمہ کیسا ہوتا ہے پڑھ کر بتلاؤ۔ سرحدی پٹھان کہنے لگا کہ تو نامعقول ہے ہم مسلمان ہے ہم کیسے کلمہ پڑھے گا۔ کلمہ تو کافر پڑھتا ہے مسلمان سے کلمہ نہیں پڑھوایا جاتا۔ بلکہ کافر سے پڑھوایا جاتا ہے۔ پھر بنئے نے کہا کہ کیا پڑھوں اس پر پٹھان نے کہا کہ کلمہ پڑھ کلمہ کافر پڑھا کرتا ہے۔ اسی طرح سے دونوں

میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس پر ساری مجلس والے دیر تک ہنستے رہے۔ حکیم الاسلام نے فرمایا کہ یہ اسلامی روشِ نہیں ہے یہ جہالت کی بات ہے۔

ایک دوسرے پٹھان کا واقعہ

حکیم الاسلام نے فرمایا کہ سرحدی پٹھان معاملات میں بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ ایک سرحدی پٹھان گاڑی میں سوار ہوا۔ ٹی ٹی نے آکر ٹکٹ مانگا انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ ٹی ٹی نے کہا کہ تم بے ٹکٹ سفر کرتے ہو اس نے کہا کہ کیا کریں جی روپیہ نہیں ہے۔ ٹی ٹی نے پولیس کے حوالہ کردیا کہ اس کو گرفتار کرو جب اگلا اسٹیشن آیا تو وہاں پر اس کو بند کردیا کہ صبح کو اس کا فیصلہ ہوگا۔ رات بھر وہ آرام سے سویا صبح کو ریلوے مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔

مجسٹریٹ نے کہا کہ تم بے ٹکٹ سفر کرتے ہو سرحدی پٹھان نے کہا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے ہمارے پاس ٹکٹ موجود ہے اور ٹکٹ نکال کر دکھا دیا۔ اِس پر مجسٹریٹ ٹی ٹی پر بہت خفا ہوا اور کہا کہ تم بڑے جھوٹے ہو ٹکٹ والوں کو گرفتار کرکے ان کو بے ٹکٹ بتاتے ہو اب تم پر مقدمہ چلے گا۔ پھر دوسری ریل آئی تو مجسٹریٹ نے کہا کہ آپ اپنا سفر جاری رکھیں یہ جھوٹا ہے ہم اِس سے نمٹ لیں گے۔

خان ریل پر سوار ہوگیا تو لوگوں نے معلوم کیا کہ جب تمہارے پاس ٹکٹ موجود تھا تو ٹکٹ کیوں نہیں دکھلائے سرحدی پٹھان نے کہا کہ بابا ہمارے پاس بتیس ۳۲ ہزار روپیہ ہیں۔ رات کو ریل میں کوئی چھین لیتا یا چوری کرلیتا۔ ہم نے سوچا کہ بہتر ہے کہ ہم رات بھر گورنمنٹ کے حفاظت میں رہیں وہاں پر کوئی چور نہیں آسکتا۔ ہم رات بھر خوب آرام سے سوئے جب صبح ہوئی تو پھر سفر شروع کردیا۔ اِس قسم کے عجیب عجیب سرحدی پٹھانوں کے واقعات ہیں۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت بریلی فرقہ والے تبلیغی جماعت والوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والے مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں اسی لیے کلمہ پڑھاتے ہیں۔ حالانکہ کلمہ کافروں کو پڑھایا جاتا ہے مسلمان تو خود ہی کلمہ گو ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہ نے فرمایا کہ یہ تبلیغی جماعت والوں کی کیا خصوصیت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی فرمایا ہے۔ جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ بِقَوْلِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ یعنی اپنے ایمان کو کلمہ پڑھ کر تازہ کرتے رہو اور قرآن شریف میں خود ہی فرمایا گیا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا۔ اے ایمان والو! ایمان لاؤ۔ یعنی ایمان تو لا چکے ہو لیکن اس کو مضبوط کرو۔ اس میں تازگی پیدا کرو۔ بریلی جماعت والوں کا الٹا ہی دماغ ہے یہ تو ایسا ہی ہے کہ جو ان کی بدعات میں داخل ہو جائے تو اس کی تبلیغ کرتے ہیں کہ احمد رضا خاں صاحب نے فرمایا ہے کہ دیگر مذاہب اگر چھوٹ جائے تو کوئی بات نہیں ہے لیکن ہمارا مذہب نہ چھوٹنے پائے تو یہاں پر یہی کہا جائے گا کہ ان کا مقصد کسی کو مسلمان بنانا نہیں ہے۔ بلکہ احمد رضا خاں صاحب کے مذہب پر چلانا ہے یہ کیا واہیات بات ہے کہ سب سے اہم اور اقدم میرا مذہب ہے اور یہی مدارِ نجات ہے ایک صاحب نے معلوم کیا کہ حضرت انکا مذہب کیا ہے تو حضرت نے فرمایا کہ پلاؤ کھانا حلوے و مرغن وغیرہ بہترین کھانا پکانا اور نیاز و فاتحہ کرنا اور علماء حقانی کو کافر کہنا اس کے علاوہ اور کیا مذہب ہوگا۔

ہم نے ساری بدعتوں کا خلاصہ نکالا ہے کہ اگر ساری بدعات کو مذہب کی صورت میں ایک کتاب کے اندر جمع کیا جائے تو پورے مذہب کا خلاصہ دو چیزیں نکلیں گی۔ یعنی کھانا پینا اور گانا بجانا تیجے کا پلاؤ عُرسوں کے الائچی دانے شبِ براءت کا حلوہ۔ برسی کا زردہ، محرم کے کھچڑے وغیرہ ان کو خوب کھانا اور

کھاکر گانا بجانا۔

حضرت تھانویؒ کا واقعہ

حضرت تھانویؒ ایک مرتبہ ایک جگہ تشریف لے گئے وہاں پر پیرزادوں اور مخدوم زادوں کا غلبہ تھا۔ اور عُرس و قوالی و دیگر بدعات میں وہ مبتلا تھے لیکن حضرت تھانوی کی شخصیت سُنکر وہ سب آئے حضرتؒ نے وعظ بیان فرمایا وعظ میں مسائل بیان فرمائے وعظ کے بعد فرمایا کہ دیکھو یہ پیرزادے اور مخدوم زادے بیٹھے ہوئے ہیں۔ نذر و نیاز سب انہیں کو دیجئے مولوی کو مت دینا اس کا دماغ خراب ہوجائے گا۔ نذر و نیاز کے حقدار یہی سب ہیں۔ بس مسئلے ہم سے معلوم کرلیا کرو اور روپیہ ان کو دیدیا کرو۔

سارے پیرزادے بہت خوش ہوئے کہ حضرت نے کیسی انصاف کی بات کہی تو ان کے ہاں مقصد ہی کھانا پینا اور نذر و نیاز ہے۔ ان کا مقصد مسائل نہیں کیونکہ وہ نہ مسائل جانیں اور نہ جاننے کی کوشش کریں۔ ان کو علماءِ دیوبند سے اسلئے عداوت ہے کہ ان کی بہت سی آمدنی جو بدعات کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہیں۔ اس میں خلل پڑتا ہے۔ اگر علماء ان کی مخالفت نہ کریں تو وہ کبھی ان کو بُرا بھلا نہ کہیں۔

مجلس نمبر ۲۲
۹ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۹۷۵ء

اس مجلس میں چند سوالات کئے گئے ہیں ہر ایک کا عنوان الگ ہے

سوال :- درود ابراہیمی میں کما صلیت کے اندر تشبیہ کی حقیقت اور نوعیت کیا ہے بظاہر اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت سمجھ میں آتی ہے

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ یہ کوئی مستقل قاعدہ نہیں ہے کہ جسے تشبیہ دی جائے اس کا مشبہ بہ افضل ہی ہوا کرے۔ یہاں پر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تشبیہ نہیں دی جارہی ہے کہ اس میں مشبہ بہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا جائے اور مشبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور پھر سوال ہو کہ آپ سے مشبہ بہ کا افضل ہونا معلوم ہوتا ہے بلکہ یہاں پر تو حق تعالیٰ کے فعل کو کہا جارہا ہے کہ جس طرح سے آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی بھیجئے۔ اور حق تعالیٰ کے فعل میں افضلیت اور مفضولیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی افضلیت معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اگر یوں کہا جاتا کہ جیسے محل درود حضرت ابراہیم ہیں ایسے ہی آپ ہیں تو شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اس سے حضرت ابراہیمؑ کی فضیلت معلوم ہوتی ہے لیکن یہاں پر فعل حق کا مقابلہ فعل حق سے ہے اور اس میں افضلیت و مفضولیت نہیں ہے اس میں ذات کی تو بحث ہی نہیں ہے جیسے ہم یوں کہیں کہ اے اللہ

جس طرح سے آپ نے ہمارے سلف پر رحم فرمایا ہے ہمارے اوپر بھی رحم فرمائیں
تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے اسلاف سے افضل ہوگئے ان کی افضلیت کا
معیار دوسرا ہے یہ تو دعا اور درخواست ہے کہ آپ نے وہاں پر یہ فعل فرمایا
ہے یہاں پر بھی فرما دیجئے۔

یا جیسے آپ ایک بچے کو بطور انعام مٹھائی دیں پھر دوسرے بچے کو بھی
وہی مٹھائی دیں۔ تو نہ یہ مٹھائی کا ذائقہ کم ہونے کی دلیل ہے اور نہ بچے کے افضل
اور مفضول ہونے کی دلیل ہے۔ بلکہ یہاں پر فعل میں مساوات ظاہر کیا ہے
کہ جیسے فلاں بچے کے ساتھ انعام واکرام کا معاملہ کیا گیا ہے اس کے ساتھ بھی
کیا گیا تو یہاں پر مساوات یا افضلیت فی الاشخاص کا کوئی تذکرہ نہیں ہے
بلکہ مساوات فی الفعل ہے اس لیے کوئی اشکال نہیں ہے۔

حضرت مولانا عبدالماجد صاحبؒ دریاآبادی کی ناگواری

حکیم الاسلام مدظلہٗ نے فرمایا کہ ۱۳۴۸ھ

میں جب دارالعلوم کا اہتمام میرے سپرد کیا گیا تو اس وقت مولانا عبدالماجد صاحبؒ
دریاآبادی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے میرے اہتمام
کی خبر سن کر ناگواری کا اظہار فرمایا۔ اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ آپ
نے ہرن کے اوپر گھاس کیوں ڈال دی ان سے تو علمی کام لینا چاہیئے تھا
اس پر حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ان سے علمی ہی کام
لیا جائے لیکن میرے بزرگوں نے ان کو اسی کام پر مامور کر دیا۔ اسلئے میں مجبور
ہوگیا۔ پھر بھی یہ دارالعلوم ہی کی خدمت ہے۔

حکیم الاسلام نے فرمایا کہ میں بھی دارالعلوم ہی کے خدام میں سے ہوں
بقول حضرت مولانا مدنیؒ میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ یہاں کیوں پڑے

ہیں۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ یہ ہمارے بزرگوں کی امانت ہے اس کو ہمیں سنبھالنا چاہیئے۔ میں نے پھر کہا کہ آپ دارالعلوم میں تنخواہ کے لیے تو نہیں پڑے ہیں۔ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ بالکل نہیں ہمارا مقصد تنخواہ نہیں ہے پھر میں نے کہا کہ اگر آپ کو تنخواہ نہ ملے تو پھر آپ کیا کریں گے اس پر حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ ہم بھیک مانگیں گے اور اس ادارہ کو چلائیں گے۔ بہرحال حقیقت یہی ہے کہ دارالعلوم بزرگوں کی امانت ہے ہم لوگوں کا فرض ہے کہ اِس کو سنبھالیں۔

چھپّر ایک ہی آدمی نہیں اُٹھاتا بلکہ بہت سے لوگ مل کر اٹھاتے ہیں اور کچھ شور بھی مچاتے ہیں۔ والد صاحب مرحوم بوڑھے ہو گئے تھے ان لوگوں نے کہا کہ آپ بوڑھے ہو گئے مدرسہ کے سلسلے میں سفر بھی نہیں کر سکتے پھر آپ مدرسہ سے الگ کیوں نہیں ہو جاتے تو انھوں نے فرمایا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا نام دارالعلوم کے خادموں میں رہے۔ اور مرنے پر لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ دارالعلوم کا ایک خادم مرا ہے یہی میرے لیئے ذریعہ نجات ہے بہرحال یہاں کا کام تو آخرت کا کام ہے اِس میں مختلف استعدادیں ہیں کوئی درس و تدریس کا کام انجام دے رہا ہے کوئی چندہ جمع کر رہا ہے کوئی اس کا انتظام کر رہا ہے۔ سبھی حضرات دارالعلوم کے خادم ہیں۔ اور واقعہ یہی ہے کہ تنخواہیں مقصود نہیں ہیں۔ یہ دارالعلوم ——— کا فیض ہے کہ خادموں کو بھوکا نہیں رکھتا۔ اور شریعت کا حکم بھی یہی ہے کہ جب کسی کا وقت لو تو بیت المال سے اس کا وظیفہ دو تاکہ وہ اطمینان سے کام کرے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ ابتداء میں بغیر معاوضہ کے کام کرتے تھے

پہلے یہ تاجر تھے لیکن خلافت کی خدمات میں مشغول ہونے کی وجہ سے تجارت ٹھپ ہوگئی۔ اس پر آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ آپ لوگ خلافت کو سنبھالیں یہ کام کرتے ہوئے میں اپنے بال بچوں کی پرورش کیسے کروں اس پر صحابہؓ نے فرمایا کہ نہیں آپ اپنا کام کریں۔ ہم بیت المال سے آپ کا وظیفہ مقرر کردیں گے اور وظیفہ مقرر ہوگیا۔ لیکن وہ ماہوار صرف دوسو درہم تھے ایک درہم... ساڑھے تین آنے کا ہوتا ہے۔ یہ امیر المومنین کی تنخواہ تھی جیسے ایک عام آدمی کی تنخواہ تھی اتنی ہی امیر المومنین کی تنخواہ تھیں۔ مگر ان کی حالت یہ تھی کہ حسابِ آخرت کے خوف سے اس پر بھی گھبراتے تھے ہم نے لندن میں دیکھا کہ وہاں گریڈ مقرر نہیں ہے کہ اس دائرے کی یہ تنخواہ ہے اور اس دائرے کی یہ تنخواہ بلکہ وہ پوچھتے ہیں کہ آپ کے کتنے بال بچے ہیں۔ تو جتنے بچے ہوتے ہیں اسی حساب سے تنخواہ مقرر کرتے ہیں تاکہ فارغ البال ہوکر کام کریں پریشان نہ ہوں اگر افراد بڑھ جائیں تو لکھنا پڑتا ہے۔ اسی کے مطابق تنخواہ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ وہاں پر تنخواہوں کا معیار افراد ہیں عہدہ نہیں ہے پہلے ہمارے دارالعلوم میں بھی یہی تھا۔ مگر اب وہ ضابطہ نہیں رہا۔

رضاخانی فرقہ کی اک نئی چال

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت ہم کو یہ معلوم ہوا کہ بنارس کے بعض اہلِ بدعت حکومت سے ایک مطالبہ کرنے والے ہیں وہ یہ ہے کہ دیوبندی علماء کو اسلام سے خارج قرار دیا جائے کیونکہ یہ دیوبندی ایک نیا فرقہ ہے جس کا سابق میں کوئی وجود نہیں تھا۔ حضرت اس کے دفعیہ کی کیا صورت ہوگی۔

حکیم الاسلام مدظلہ نے فرمایا کہ یہ کوئی دھمکی معلوم ہوتی ہے وہ مطالبہ کر نہیں سکتے اگر انھوں نے مطالبہ کیا تو وہ علماء دیوبندی کے حق میں

مفید ہوگا۔ اسلیے کہ جب قادیانیوں کے خلاف مسئلہ اُٹھا اور حکومت سے درخواست کی گئی تو حکومت نے پارلیمنٹ کی سطح پر کہا کہ اس کو واضح کرو کہ ان کو کیوں اسلام سے خارج کہتے ہو اس پر قادیانیوں کے عقائد کو واضح کیا گیا قادیانیوں نے جواب دہی کی پھر اس پر علماء حقانی نے جب رد کیا تو پارلیمنٹ والوں کی سمجھ میں آگیا کہ یہ تو مرتد ہی ہیں۔ بلکہ اسلام کے مخرب بھی ہیں پھر فیصلہ دیا کہ یہ اسلام سے خارج ہیں۔ اس لیے اہلِ بدعت یہ مسئلہ اُٹھالیں تو بڑا اچھا ہوگا۔

اس وقت علماء دیوبند کو حکومتی سطح پر مسلک واضح کرنے کا موقع ملے گا اس وقت رضاخانیوں کا پول کھل جائے گا۔ وہ اپنے حق میں بُرا کر رہے ہیں۔ علماء دیوبند کے حق میں کچھ بھی بُرا نہیں اس سے پہلے بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں ان میں حکومت کے ذمہ دار حضرات حکم بنائے گئے تھے اور اُنھوں نے یہی فیصلے دیئے کہ یہ بالکل لغو اور باطل بات ہے جو بریلوی علماء کہہ رہے ہیں۔ اگر وہ لوگ ایسا مسئلہ اُٹھائیں تو وہ فیصلے بھی سامنے آئیں گے۔ جن کے متعلق حکومت پہلے ہی سے فیصلہ کر چکی ہے ہم تو کہتے ہیں کہ اگر وہ اس مسئلے کو اٹھانا چاہتے ہیں تو ضرور اٹھائیں بہت مناسب ہے اس وقت ان کا سارا پول کھل جائے گا۔

بریلویوں کا اس کے سوا کام ہی کیا ہے ان کو کوئی مبہم عبارت مل جائے تو ان کا فرض ہے کہ اس کو غلط محمل پر اُٹھائیں ان کے یہاں یہ ہے ہی نہیں کہ اس کو صحیح انداز میں پیش کیا جائے گا جو ایک مسلمان کا کام ہے اگر دوسرا یہ کہے کہ اس عبارت سے میرا مطلب یہ ہے مگر وہ ماننے کیلئے تیار نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ اس کا مطلب وہی ہے جو ہم کہہ رہے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے

کہ دوسرا کسی طرح اسلام سے خارج رہے یہ ان کی بدنیتی ہے۔

رضاخانیوں کے گرو

ان کو علماءِ دیوبند سے اسلیئے عناد ہے کہ درحقیقت رضاخانیوں کو کھڑا کرنے والے انگریز ہیں اور انگریزوں کا مقصد مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کو بھی اس کا اقرار ہے یہ قصہ انگریزوں ہی سے چلا ہے۔ ڈبلو ہنٹر جو بنگال کا ایس ایس تھا اس نے لفظ وہابی کے متعلق خود ہی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ وہابی کا لفظ سرکاری دفاتر سے ہندوستان والوں پر چلایا گیا ہے۔ تاکہ مسلمانوں میں تفریق پیدا ہو اور ایک دوسرے سے نفرت کریں وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو وہابی سے پہلے ہی سے نفرت تھی کیونکہ ان کے مسائل میں شدت ہے جب علماء دیوبند نے ردّ بدعت کی۔ تبلیغ شروع کیا تو انگریزوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے چیلے تیار کیئے اور ان کے ذریعہ علماءِ حقانی کو وہابی اور کافر کہلوائے اور وہابی کا لفظ ان پر چسپاں کر دیا۔ خود انگریز اس کی تصریح کر رہا ہے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انگریزوں سے اور سکھوں سے جہاد کیا اس پر ڈبلو ہنٹر خود لکھتا ہے کہ سید صاحب نے اٹھارہ ۱۸ جنگیں ہم سے لڑے ہیں۔ لیکن کمال یہ تھا کہ کلکتہ سے لے کر پشاور تک اسلامی عدالتیں قائم تھیں اور ان کے ذریعہ مجاہدین کو روپیہ پہنچ رہا تھا۔ مگر ہم کو اس کی بالکل خبر نہیں تھی۔

بہر حال جب انگریز جیت گئے تو سب سے پہلے اس جماعت کا استیصال کرنا چاہا بہت سے حضرات قتل کیے گئے کتنوں کو پھانسی دی گئی اور بہت سے حضرات کو جلا وطن کیا گیا۔ لیکن جو حضرات باقی رہ گئے تھے ان کے وہ جذبات باقی رہے جو پہلے تھے اسلیئے انگریزوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ عام مسلمانوں کو ان سے نفرت دلائی جائے تاکہ وہ ان کے فیور میں نہ رہیں۔ اس لیے انگریز

نے یہ ترکیب چلائی۔

بہت سے حضرات ان کے خلاف کھڑے ہوئے ان میں مولانا احمد رضا خاں صاحب اور ان کے حوارین سب سے آگے تھے۔ اس میں بہت سی سازشیں ہیں اگر دنیا میں لوگوں کو دھوکا دیں تو دے سکتے ہیں لیکن اللہ کے یہاں یہ دھوکا بازی چلنے والی نہیں ہے اس کا فیصلہ آخرت میں ہوگا۔ وہاں پر حقیقت کھُل کر سامنے آجائے گی۔ اس وقت سب کو معلوم ہو جائے گا کہ حق پر کون تھا۔ اور ناحق پر کون یہ لوگ علماءِ اہلسنت والجماعت کے پردے میں چھُپ کر علماءِ حقانی کو وہابی اور کافر کہتے ہیں۔ اس وقت ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ بدعتی علماء کون تھے اور علماءِ اہل سنت والجماعت کون تھے۔ ہم اپنے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتے ہیں۔ جہالت کا جواب جہالت ہی سے دینا یہ ہمارا کام نہیں ہے۔

مجلس نمبر ۲۳
۱۱ر اپریل ۱۹۷۶ء

حکیم الاسلام مدظلہ العالی کے چند مخصوص خواب اور بزرگان دین کی تصنیفات کے اثرات اور صراطِ مستقیم کی صورت مثالی پر محققانہ بیان

ایک سوال کے جواب میں حکیم الاسلام مدظلہ نے اپنے چند خواب کی طرف اشارہ فرمایا۔ حاضرینِ مجلس نے سننے کی تمنا ظاہر کی چونکہ وقت ختم ہو چکا تھا اسلیئے دوسرے دن آپ نے بیان فرمایا۔ وہ خواب کا تعلق اہتمام سے ناگواری کے متعلق تھا۔ اسلیئے ان کو مجالس حکیم الاسلام کا جُز بنادیا گیا بقیہ خواب یہاں پر نقل کیے جا رہے ہیں۔

پہلا خواب حضرت حکیم الاسلام مدظلہ نے فرمایا ایک مرتبہ قادیانی کا بہت بڑا فتنہ اُٹھا۔ اشتہارات ادھر سے بھی نکلتے تھے اور اُدھر سے بھی۔ حضرت مولانا شاہ انور کشمیریؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اس فتنے کے رفع کرنے کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ ان حضرات کے دلوں میں اس فتنے کی وجہ سے ایک کُڑھن تھی کہ بنیادی طور پر دین کی تحریف ہے قادیانیوں میں دُو فرقے ہیں ایک تو لاہوری فرقہ ہے جو مرزا غلام احمد کو نبی تو نہیں مانتا لیکن مجدد اور ولی ضرور مانتا ہے۔ اور ایک فرقہ کُھلے طور پر نبی مانتا ہے میرے دل میں یہ خلجان تھا کہ اس فرقے کی تکفیر کیوں کی جائے جو مرزا غلام احمد کو

نبی نہیں مانتا صرف مجدد اور ولی مانتا ہے۔ میں نے اپنے اس خلجان کو کئی بزرگوں سے ذکر کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس کی تصریحات سے جب یہ معلوم ہو گیا کہ وہ خود نبوت کا مدعی ہے تو ایسا آدمی مسلمان ہی نہیں چہ جائے کہ اس کو ولی یا مجتہد مانا جائے تو استدلالی طور پر تو بات سمجھ آگئی مگر پھر بھی خلجان باقی رہا۔ اس کے بعد میں نے ایک خواب دیکھا۔ اور وہ یہ ہے۔

کہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے ایک دروازہ اس طرف ہے اور ایک دروازہ اُس طرف ہے۔ لمبان کی وجہ سے آگے اندھیرا بڑھتا گیا ہے اس کے کونے میں ایک تخت پڑا ہوا ہے اس پر حکیم نورالدین قادیانی بیٹھا ہوا ہے وہ مرزا غلام احمد کا خلیفہ بھی تھا۔ میں ادھر دروازہ کے پاس کھڑا ہوا ہوں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آگے بڑھوں یا ادھر جاؤں۔ اتنے میں ایک نوجوان لڑکا سامنے آیا اس کو میں جان رہا ہوں کہ یہ قادیانی ہے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھبراہٹ کے ساتھ اور لپک کر تشریف لائے اور مجھ سے خطاب کر کے یہ فرمایا کہ اس غلام احمد سے مجھے توقعات تھیں۔ مگر اس نے میری ساری توقعات پر پانی پھیر دیا اور غصے سے آپؐ نے فرمایا کہ دیکھ لو اس کی قبر میں کیا ہو رہا ہے۔ جب آپ نے یہ جملہ فرمایا تو وہ فوراً وہ لڑکا اور حکیم نورالدین قادیانی اور کمرہ سب غائب ہو گئے۔ اِسی میں میری آنکھ کھل گئی۔ اس کے بعد وہ خلجان ختم ہو گیا اور قلب میں انشراح ہو گیا یہ غیبی دستگیری تھی۔ اگر دینی حیثیت سے کوئی خلجان یا تشویش پیدا ہو جائے تو منجانب اللہ مدد ہوتی ہے۔

دوسرا خواب اِسی طرح دار العلوم میں ایک شخص آیا اور شعبدہ وغیرہ دِکھلانا شروع کیا۔ اس کی شکل بالکل درویشانہ تھی بہت سے

طلباء اس کی طرف مائل ہونے لگے ایک فتنے کی صورت پیدا ہوگئی۔ مگر ظاہری صورت دیکھ کر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس زمانہ میں مَیں نے خواب دیکھا کہ ایک مسجد ہے جو گول ہے اور ایک گنبد بھی ہے۔ نیچے مسجد ہے مَیں اس مسجد میں کھڑا ہوا ہوں اتنے میں وہ صاحب جس کی طرف لوگ جُھک رہے تھے ایک طرف سے جُبّہ قُبّہ پہن کر نکلے اور سر پر عمامہ اس انداز کا تھا کہ معلوم ہوتا کہ کوئی بڑے شیخ ہیں انکو دیکھ کر میں اُس طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اتنے میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور جوش سے فرمایا ہٹ جا اور یہ شعر پڑھا ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ؛ تا بہر دستے نہ باید داد دست

یعنی بہت سے ابلیس انسانوں کی صورت میں ہوتے ہیں اسلیئے ہر شخص کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دینا چاہیئے۔

اس کے بعد وہ ساری چیزیں غائب ہوگئیں پھر اللہ تعالیٰ نے وہ فتنہ رفع کر دیا۔ حکیم الاسلام مدظلہٗ کے خواب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی ظاہری شکل وصورت دیکھ کر حق و باطل میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ جب بڑے بڑے علماء دین بھی تائیدِ غیبی کے بغیر ایسے فتنہ پرور شخص کو نہیں پہچان سکے تو عوام کا کیا اعتبار۔ حقیقت یہی ہے کہ جب تک تائیدِ غیبی ساتھ نہ ہو اس وقت تک باطل کو پرکھنا مشکل ہوتا ہے۔

آج بھی ہزاروں بدعتی بزرگوں جیسی صورت بنا کر مسلمانوں کے ایمان کو لوٹ رہے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی صحبت سے دور رکھے اور علماءِ ربانیین کی صحبت نصیب فرمائے۔ آمین۔ (مرتب)

تیسرا خواب حضرت نانوتویؒ کا رسالہ ہے اس کا نام ہم نے حدیث الاماء رکھا ہے وہ فارسی میں مکتوب ہے اس میں ابورزین رضی اللہ عنہ

کی حدیث ہے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اَیْنَ کَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ خَلْقَہٗ قَالَ کَانَ فِیْ عَمَاءٍ مَا فَوْقَہٗ ھَوَاءٌ مَا تَحْتَہٗ ھَوَاءٌ

ترجمہ: "یعنی اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اماء میں اس کے اوپر بھی ہوا اور نیچے بھی ہوا۔"

اماء کے لغوی معنی پتلے بادل کے آتے ہیں جو رقیق ہوتا ہے اور اس میں روشنی چھنتی ہے۔ اس حدیث پر شراح حدیث اور محدثین کو بڑا اشکال واقع ہوا کہ حق تعالیٰ کا بادل میں ہونے کا کیا مطلب ہے اس سے مظروفیت نکلتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ظرف و مظروف سے پاک ہے اور اوپر بھی ہوا اور نیچے بھی ہوا۔ اس سے محدودیت نکلتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے یہ اشکالات ہوتے ہیں۔ اس پر محدثین حضرات نے جوابات دیئے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ نے کسی کے سوال پر ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ یہی حدیث اس کا عنوان ہے اس کے اندر عجیب عجیب حقائق تحریر فرمائے ہیں۔ پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذات و صفات کے اندر گھسے ہوئے ہیں اور اوپر کی چیزیں نیچے لا رہے ہیں۔ گرمی کا زمانہ تھا میں لیٹ کر وہ رسالہ دیکھ رہا تھا۔ بعض باتیں بڑی دقیق تھیں سمجھ میں بھی نہیں آتی تھیں۔ مگر پھر بھی بہت لطف آ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجموعی طور پر کوئی تربیت کر رہا ہو اور دل کو چلا رہا ہو اس میں ایک جگہ باری تعالیٰ کی ذات و صفات کا ذکر آیا۔ حضرتؒ نے ایک تمثیل سے سمجھایا کہ یوں سمجھو کہ ایک لامحدود کُرّہ ہے نور کا۔ اور آپ نے کُرّہ سے اسلیئے تمثیل دی کہ حق تعالیٰ شانہٗ مبدءِ فیاض ہیں ان کا فیضان سب کے لیے یکساں ہے البتہ قابلیت کے اعتبار سے کوئی فیضان کم حاصل کرتا ہے کوئی زیادہ یہ استعداد کا تفاوت ہے۔ اور کُرّہ کی یہی شان ہوتی ہے کہ جو چیز مرکز سے چلتی ہے۔

وہ محیط کی چاروں طرف یکسانی کے ساتھ پہنچتی ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ کُرہ کے اندر مرکز سے جو خطوط محیط کی طرف چلتے ہیں وہ پھیلتے ہوئے چلتے ہیں اور محیط کی طرف سے جو خطوط مرکز کی طرف آتے ہیں وہ سکڑتے ہوتے آتے ہیں اور دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے۔

تو فرمایا کہ جب کرہ نُورانی ہے تو اس میں نور کی موجیں ہیں وہ مرکز سے اُٹھ کر جا رہی ہیں محیط کی طرف اور محیط سے آ رہی ہیں مرکز کی طرف اور ان میں باہم ٹکریں ہیں۔ ان وجودی امواج کی ٹکروں سے جو شکلیں بنتی ہیں وہ ممکنات کے حقائق ہیں اس میں عجیب عجیب نوع بنوع شکلیں تیار ہوتی رہتی ہیں۔ جتنی مخلوقات ہیں ان کی مختلف شکلیں اور صورتیں ان ٹکروں سے بنتی ہیں۔

میں یہ مضمون پڑھ رہا تھا دل پر عجیب کیف محسوس ہو رہا تھا اسی حالت میں کہ کتاب تو سینے پر تھی اور میری آنکھ لگ گئی تو خواب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کمہار کے چاک کی طرح ایک بہت عظیم نورانی چاک ہے اور وہ اس سرعت سے گھوم رہا ہے کہ اس کی حرکت بالکل مخفی ہو گئی ہے اس پر نگاہ نہیں ٹھہر سکتی اس میں چمک اور لمعان اتنی تیز ہے کہ نگاہ مِلانی مشکل ہو رہی ہے خواب ہی کی حالت میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ یہ ذات باری تعالیٰ ہے اسی حالت میں ہم عرض کر رہے ہیں کہ ہماری مغفرت فرما دیجئے۔ مگر اس میں لفظ نہیں ہے اُدھر سے جواب آ رہا ہے کہ ہم نے مغفرت کر دی مگر اُس میں بھی لفظ نہیں ہے اس کے بعد میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس چاک کے اِردگرد پوری فضا میں پانی ہی پانی ہے اور اس کی موجیں ایسی ہیں جیسے زمین و آسمان ان موجوں اور پانی میں ٹکریں ہیں اور ان کی ٹکروں سے عجیب عجیب شکلیں بن رہی ہیں وہی نقشہ جو کتاب میں پڑھ رہا تھا وہی خواب میں دیکھ رہا ہوں اور وہ پانی چاک کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے اور میں ہیبت زدہ ہوں کہ

اگر یہ پانی رل گیا تو میرا کوئی وجود ہی نہیں رہے گا اور وہ پانی بڑھ رہا ہے یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے بالکل رل گیا اس وقت نہ مجھے اپنے وجود کی خبر رہی اور نہ کسی چیز کی خبر رہی اور ساری چیزیں غائب ہوگئیں اور خواب کا یہ حصہ ختم ہوگیا پھر خواب کا دوسرا حصہ یہ ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک عظیم الشان شہر ہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بارش ہونے کے بعد تھم جائے اور سڑکوں پر کہیں تھوڑا سا پانی اور کہیں نمی باقی رہ جائے اس شہر میں ایسی ایسی عجیب عمارتیں ہیں کہ کبھی ان کا نمونہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ پھر ان میں عجیب قسم کی چمک اور دمک تھی اور ہزاروں آدمی سڑکوں پر چل رہے ہیں ان کی شکلیں بھی نورانی ہیں ان میں کچھ شناسا اور کچھ ناشناسا ان کا لباس زرق برق تھا۔

اسی حالت میں میری آنکھ کھل گئی اور رسالہ میرے سینے پر تھا اس کے بعد جب مطالعہ کرنا شروع کیا تو ساری باتیں سمجھ میں آنے لگیں اور جو رکاوٹیں تھیں وہ ختم ہوگئیں۔ اس پر ہم نے ایک نتیجہ نکالا کہ صوفیاء کرام میں ایک لفظ مشہور ہے کہ ع

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست

اس کا مطلب یہ ہے کہ فیضان جاری رہتا ہے۔ اہل اللہ کی کتابوں میں ان نقوش کے ذریعہ فیضان پہنچتا ہے ہر کتاب میں مصنف کے الفاظ میں اس کے جذبات اور ملکات سموئے ہوئے ہوتے ہیں جس قسم کا مصنف کا جذبہ ہوگا اسی قسم کے کلمات نکلیں گے۔ اور دیکھنے والوں پر اسی قسم کے اثرات بھی پڑیں گے اسی لیے کوشش یہی کی جاتی ہے کہ ایسے مصنفین کی کتابیں دیکھی جائیں کہ جن پر تقویٰ و طہارت اور زہد کا غلبہ ہو کیونکہ ان کے کلمات میں نورانیت اور برکت ہوتی ہے اور جن مصنفین کے قلوب ان صفات سے خالی ہوتے ہیں ان کے کلمات میں تاثیر

بھی نہیں ہوتی۔

ہم نے حضرت نانوتویؒ کی کتابوں میں خاص طور پر یہ بات دیکھی ہے کہ ان کے پڑھنے سے فہم تیز ہوتا ہے اور ایک خاص قسم کی برکت اور نورانیت محسوس ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ استاذ رحمہ اللہ یعنی حضرت نانوتویؒ کا مقولہ تھا کہ امت میں بڑے بڑے آفتاب و ماہتاب جلیل القدر علماء اور مشائخ پیدا ہوئے ہیں لیکن چار مصنف ایسے ہیں کہ اگر ان کی کتابوں سے مجادلت رہے یعنی آدمی ان کا مطالعہ کرتا رہے تو غبی بھی ہو تو ذہین بن جاتا ہے۔

ایک حضرت شاہ ولی اللہؒ دوم حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ سوم امام غزالیؒ چہارم حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ اور اس کی بنا یہ ہے کہ یہ حضرات جزئیات سے بحث نہیں کرتے بلکہ اصول اور کلیات سے بحث کرتے ہیں۔ اگر جزئی کی بحث ہو تب بھی بحث اصول ہی سے کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جب اصول اور کلی ذہن نشین ہو جائیں تو ان کے ماتحت ہزاروں جزئیات کا فیصلہ ہو جاتا ہے اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ ایک کا اضافہ میں کرتا ہوں یعنی استاذ رحمہ اللہ یعنی حضرت نانوتویؒ۔

حکیم الاسلام نے فرمایا کہ ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے۔ واقعی حضرت نانوتویؒ کی کتابوں میں عجیب عجیب علوم اور حقائق ہیں وہ جزئی سے چلتے ہیں اور اصول کی طرف جب آتے ہیں تو اس میں ہزاروں جزئیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ دقیق سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ جب ایک جگہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو دوسری جگہ اس کی تفصیل مل جاتی ہے جو ابتداء میں ڈر کر چھوڑ دے وہ تو گیا اس کو کچھ نہیں آئے گا لیکن جو شخص اول سے آخر تک لگا رہا تو آخر میں ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔

اس پر حضرت مولانا حامد الانصاری غازی صاحب نے سوال کیا کہ حضرت جو مسائل کتابوں کے دیکھنے سے حل نہیں ہوتے وہ حضرت کو خواب کے ذریعہ حل کرا دیئے جاتے ہیں وہ خواب دیکھنے کا طریقہ کیا ہے جس سے ہم لوگوں کے اُلجھے ہوئے مسائل بھی خواب کے ذریعہ حل ہو جایا کریں۔

اس پر حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی نے ہنس کر فرمایا کہ خواب آدمی دو طریقوں سے نہیں دیکھتا وہ تو ایک راستہ ہے وہ صرف خواب تھوڑے ہی ہے فیضان کے بہت سے راستے ہیں وہ کسی راستے سے حل ہو جائیں مگر لگنا شرط ہے۔

صراطِ مستقیم کی صورت مثالی

حکیم الاسلام نے فرمایا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَرُوْحُوْا وَاغْدُوْا وَشَیْءٌ مِّنَ الدُّلْجَۃِ یعنی دین کے راستہ پر لگے رہو اور چلتے رہو اگر گر پڑو تو پھر بھی کھڑے ہو جاؤ اور چلتے رہو مگر بیٹھا مت چھوڑو۔ اگر ایسا کرو گے تو کسی نہ کسی دن منزل مقصود سامنے ضرور آجائے گی اگر پہلے ہی سے بیٹھا کی اونچ نیچ دیکھ کر ہٹ گیا تو منزل تک نہیں پہنچے گا۔ اسلیئے فرمایا گیا کہ صبح و شام چلتے رہو۔

اس کی مثال حدیث شریف میں دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ ایک لمبی سڑک ہے اور اس کے دونوں طرف بڑے بڑے دروازے ہیں اور ان دروازوں پر بڑے بڑے پردے ٹنگے ہوئے ہیں اگر ان پردوں کو اٹھا کر دیکھو تو چاروں طرف پھول و پھل کے خوب صورت خوب صورت باغیچے ہیں جو بالکل سبزہ زار اور خوشنما ہیں آپ نے دیکھا کہ راستہ دُور تک چلا گیا ہے پھر آپ نے فرمایا کہ راستے کے اس کنارے

سے آواز آرہی ہے یَا عِبَادَ اللّٰہِ اسْتَقِیْمُوْا وَلَا تَعْوَجُّوْا یعنی اے اللہ کے بندے سیدھے سیدھے چلے آؤ ٹیڑھے ہو کر مت چلو۔ اور ایک آواز اس کنارے سے آرہی ہے کہ چلتے رہو چلتے رہو پردہ اُٹھا کر مت دیکھو سیدھے چلو منزلِ مقصود آجائے گی۔ پھر آپ نے اس خواب کی تعبیر خود ہی فرمایا کہ وہ جو سڑک ہے وہ تو صراطِ مستقیم ہے اور اس کی منزلِ مقصود حق تعالیٰ شانہٗ ہیں اور اُدھر سے جو آواز آرہی ہے یَا عِبَادَ اللّٰہِ اسْتَقِیْمُوْا وَلَا تَعْوَجُّوْا وہ ندائے حق ہے کہ سیدھے چلے آؤ اور جو پیچھے سے آواز آرہی ہے وہ ضمیر کی آواز ہے کہ سیدھا راستہ یہی ہے وسوسوں میں مت پڑو۔ اور وہ جو بڑے بڑے دروازے ہیں وہ فتنوں کے دروازے ہیں ان کے پیچھے سبزہ زار باغات جو ہیں وہ فتنے ہیں اور جو پردے ٹنگے ہوئے ہیں وہ حُدود اللہ ہیں کہ ان پردوں کو مت ہٹاؤ۔ اگر ہٹایا اور حد شکنی کی تو دروازوں میں داخل ہو جاؤ گے۔ پھر آگے چل کر فتنوں میں مبتلا ہو جاؤ گے اور اصل منزل رہ جائے گی تو اس میں یہی طریقہ بتلایا گیا ہے کہ جو راستہ اختیار کر لیا ہے اس کو مت چھوڑو جو قسمت میں ہو گا وہ خود ہی مل جائے اور منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ کوئی دیر سے پہنچے گا اور کوئی جلدی سے پہنچے گا یہ اپنی اپنی استعداد ہے۔

پُلصراط کی صورتِ مثالی

اسی کی صورتِ مثالی قائم کی جائے گی پُلصراط کی شکل میں جہنّم کے اوپر پُل صراط کو قائم کیا جائے گا وہ شریعت کی صورتِ مثالی ہوگی اس کی شان بتلائی گئی کہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز۔ بال سے زیادہ باریک شریعت کی استقامت کی طرف اشارہ ہے یعنی اتنا سیدھا ہے کہ عرضاً تقسیم نہیں ہو سکتا ہے اور تلوار سے زیادہ تیز یعنی نازک راستہ ہے اگر ذرا سی غفلت کی تو اندیشہ ہے

کہ کٹ کر نیچے گر جاؤ۔

اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ صراط کے نیچے بڑے بڑے آنکڑے ہوں گے وہ ادھر اُدھر کے پیروں میں گھر وپ ڈالنا چاہیں گے وہ صورتِ مثالی ہے فتن کی۔ یعنی اگر تیزی سے سیدھے راستے پر چلتے رہو گے تو فتنے اثر انداز نہ کر سکیں گے لہٰذا جو لوگ دنیا میں سیدھے چلتے ہیں وہ پُل صراط پر بھی سیدھے ہی چلیں گے اور جو لوگ یہاں پر تیزی سے چل رہے ہیں وہاں پر بھی تیزی سے چلیں گے اور جو لوگ یہاں پر سُست چل رہے ہیں وہ وہاں پر بھی سُست چلیں گے۔ اور جو لوگ صراطِ مستقیم سے بھٹک کر فتنوں میں مبتلا ہو گئے وہاں پر آنکڑے اُن کے پیروں میں گھر وپ ڈالیں گے اور وہ اتنے زخمی ہو جائیں گے کہ چلنے کے قابل نہیں رہیں گے۔

پُلصراط کی مسافت پندرہ ہزار برس کی ہوگی

اس کے طے کرنیوالے مختلف درجات کے لوگ ہوں گے انبیاء علیہم السلام تو مثل بجلی کے پل بھر میں گذر جائیں گے اور اولیاء محفوظین اس طرح طے کریں گے کہ جس طرح سے ہوا کا جھونکا چلا اور اُدھر پہنچا۔ بعض حضرات مثل تیز رفتار سواری کے طے کریں گے۔ اور بعض سُست سواری کی طرح طے کریں گے اور بعض لوگ گرتے پڑتے طے کریں گے وہ لوگ وہ ہوں گے جو عمل یا عقیدے کے فتنے میں گرفتار تھے اور بعض لوگ کٹ کر جہنم میں گر جائیں گے جو اُم الفتن ہے پھر سزا بھگتنے کے بعد وہ دوزخ سے نکالے جائیں گے تو ہر چیز کو وہاں متشکل بنا دیا جائے گا جو معاملہ بندے نے یہاں پر عقیدے کے ساتھ کیا ہے وہاں پر وہی معاملہ شکل و صورت کے ساتھ کیا جائے گا۔

درحقیقت یہاں شریعت پر چلنا مشاقی اور تمرین ہے وہاں پر چلنے کیلئے!
اسی لیے فرمایا گیا۔ سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَرُوْحُوْا وَاغْدُوْا وَشَیْءٌ مِّنَ الدُّلْجَۃِ۔ یعنی اعتدال کے ساتھ چلے چلو قریب قریب چلو اِدھر اُدھر مت بھٹکو اور صبح وشام کو ذکر کرتے رہو اور رات کا بھی کچھ حصہ طاعت اور عبادت میں صرف کر لو۔ تو کام میں لگے رہنے کی یہ تفصیلات ہیں۔

پُلصراط کی وُسعت

ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا پُل صراط ایک ہی ہوگا یا سب کے لیے الگ الگ ہوگا اگر ایک ہوگا تو سُست چلنے والے ہزاروں ہوں گے۔ پھر تیز چلنے والے کس طرح گذریں گے جب کہ وہ راستے میں حائل ہوں گے۔

حکیم الاسلام مدظلہٗ نے فرمایا کہ رستہ تو ایک ہی ہوگا لیکن اتنا وسیع ہوگا کہ لاکھوں چلیں گے مگر ایک دوسرے کے لیے آڑ نہیں بنے گا جس طرح دُنیا میں ہزاروں انسان شریعت پر چل رہے ہیں شریعت کا راستہ تو ایک ہے مگر ایک دوسرے کے لیئے آڑ نہیں بنتا۔ بال اور تلوار سے تو ایک مثال کے طور پر سمجھایا گیا ہے۔ ورنہ حقیقی بال اور تلوار مُراد ہو تو چلنا ہی مشکل ہو جائے گا۔

جیسے دیدارِ خداوندی کے بارے میں مثال دی گئی کہ مِثل قمر لیلۃ البدر جیسے اندھیری رات کا چاند چمک رہا ہو لاکھوں انسان ایک ہی وقت میں دیکھیں گے مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرا حارج نہ ہوگا۔ لہٰذا بال اور تلوار کو شاہد پر قیاس کرنا ہی غلط ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ واقعی میں بال سے زیادہ باریک ہوگا بلکہ اس سے شریعت کی استقامت مراد ہے تلوار سے مُراد نزاکت ہے۔

شریعت کا تو ایک راستہ ہے مگر طُرق مختلف ہیں کسی پر نماز کا غلبہ ہوتا ہے اور کسی پر روزہ وزکوٰۃ کا غلبہ ہوتا ہے کسی پر انفاقِ مال اور حج کا غلبہ ہوتا ہے۔

کسی پر تلاوتِ قرآنِ کریم کا غلبہ ہوتا ہے یہ طبائع کی مناسبت ہوتی ہے جس عمل کا غلبہ ہوتا ہے اسی عمل سے ترقی ہوتی ہے۔

اسی طرح جنت کے دروازوں کے نام بھی ہیں ایک کا نام ہے بابُ الصّلوٰۃ اس سے وہ داخل ہوں گے جن پر نماز کا غلبہ تھا اور ایک بابُ الرّیّان ہے اس سے وہ لوگ داخل ہوں گے جن پر روزہ کا غلبہ تھا۔ ایک بابُ الزّکوٰۃ ہے اس سے وہ لوگ داخل ہوں گے جن پر انفاقِ مال کا غلبہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفصیلات ارشاد فرمائیں۔ انھیں دروازوں سے ان کی پکار بھی ہوگی۔ بعض حضرات ایسے ہوں گے کہ ان کی پکار ہر دروازے سے ہوگی جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے۔ تو طبائع کی مناسبات ہیں مگر یہ طُرق طبعی ہیں وہ شرعی نہیں ہیں کہ اس معنیٰ کر شریعت کے اتنے راستے ہیں۔ بلکہ شریعت کا راستہ ایک ہی ہے مگر چلنے کے طریقے الگ الگ ہیں وہ سب شریعت ہی کے راستے ہیں۔

تمت بالخیر جلد اول،